”چہارسُو“

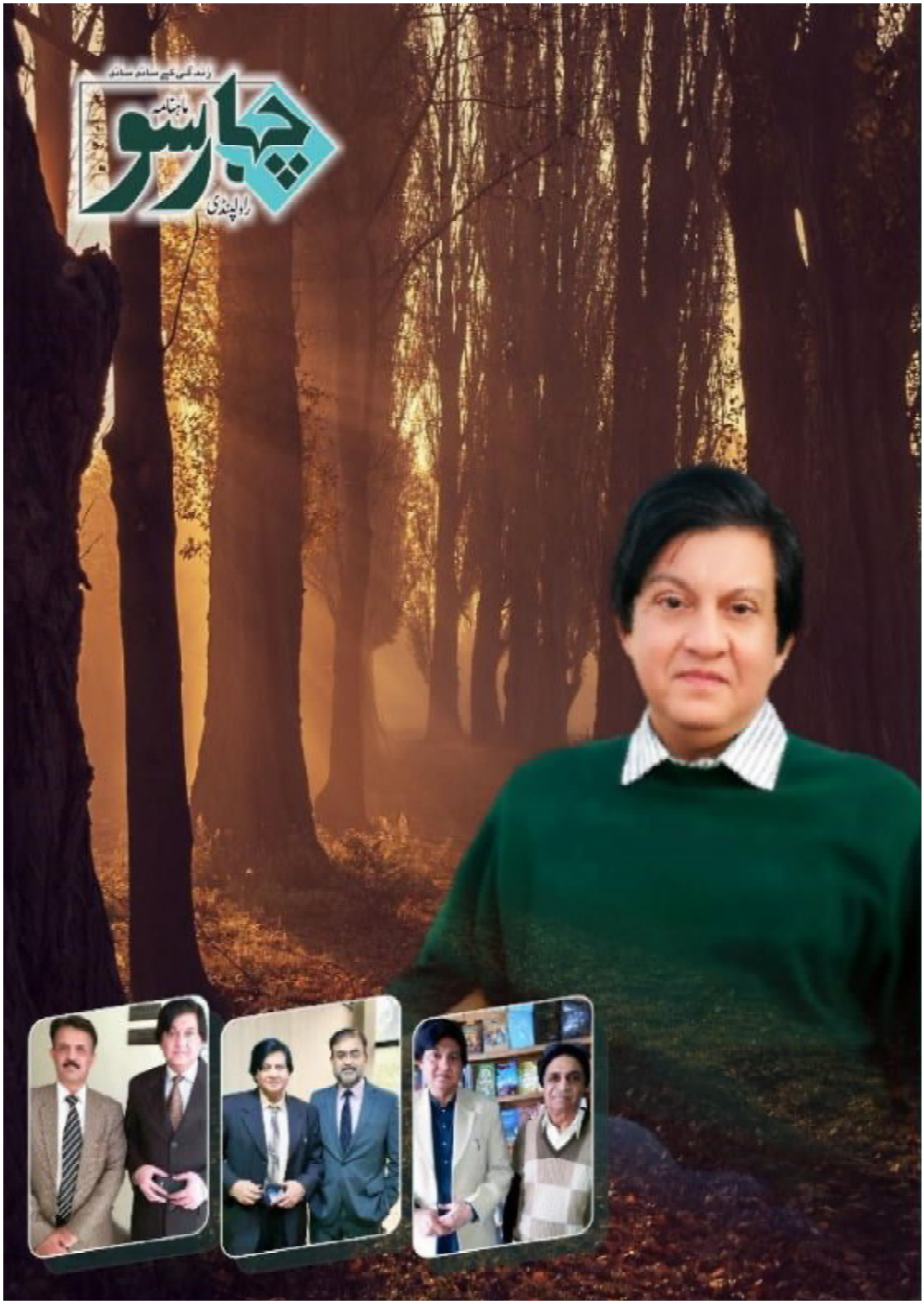

..... عالمی کہانیاں .....

صحافی ظفر قریشی کو آج کے لوگ ایک مترجم ناول نگار کے نام سے جانتے ہیں جو سات سمندر پار نیویارک نامی شہر میں قیام پذیر ہیں۔ چار دہائیوں سے زیادہ کا یہ بن باس ظفر کا اپنا فیصلہ ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ستر کی دہائی میں جب ضیائی اسلام، اسلام آباد سے نکل کے ملک کے طول وعرض میں شتر بے مہار کی طرح داخل ہونے لگا اور جیتی جاگتی زندگیوں کے سوچتے ذہنوں، دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں پر طرح طرح کے قدغن لگنے کے ساتھ ساتھ زبانوں کی کتر بیونت بھی ہونے لگی تو ان دنوں بہت سے سوچتے ذہنوں نے خود ساختہ جلاوطنی کی راہ اپنائی۔ سرزمین وطن کو چھوڑنے والوں میں ایک بڑی تعداد صحافیوں کی بھی تھی۔ کراچی چھوڑنے والوں میں پہلا قدم اشرف شاد کا قدم تھا ان کے بعد داؤد سبحانی، الطاف احمد، ظفر قریشی، مسعود حیدر وغیرہ وغیرہ قدم بڑھاتے گئے۔ جو نہ جاسکے وہ جانے کی تگ ودو کرتے، کرتے تھک ہار کے بیٹھ گئے۔ ان جانے والوں ہی میں سے ایک ظفر قریشی بھی ہیں۔ بنیادی طور پر ظفر قریشی صحافی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ایک ایسے اخبار کے صحافی رہے جس کے مالی حالات کبھی بھی اچھے نہ رہے۔ اس میں کچھ عمل دخل مالکان کے رویے کا بھی تھا کہ ملک کا سب سے بڑا انگریزی روزنامہ ان کا پہلا بچہ ہونے کے باعث ہمیشہ حاصل تمنا اور توجہ رہا۔ اس سبب اردو کا روزنامہ کبھی بھی پنپ نہ سکا اور بالآخر ایک دن آخری ہچکی لی اور گمنامی کی دنیا میں چلا گیا۔

ان دنوں صحافیوں کے حالات mouthtohand کی عملی تصویر ہوا کرتے تھے۔ زندگی کی گاڑی کو رواں رکھنے کے لئے انھیں بہت کچھ کرنا پڑتا تھا۔ ظفر قریشی ان دنوں بھی مختلف ڈائجسٹوں میں ترجمہ نگاری کا کام کرتے تھے اور ہمیشہ سے کمال کے مترجم تھے۔ جن کو آج کے لوگ ایک مترجم کہانی کار اور ناول نگار کے نام سے جانتے ہیں۔ ظفر جو گئے تو برسوں نہ پلٹے، پھر کبھی اماں کے گزر جانے کا سن کر تو کبھی کسی اور سبب برسوں، برسوں کے وقفے سے پرانی راہوں پر دھیمے، دھیمے قدم رکھتے آنے جانے لگے۔ گزشتہ چند سالوں سے ان کے آنے جانے کا وقفہ کم ہوتے، ہوتے تقریباً سالانہ ہوگیا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک کے چیدہ، چیدہ لکھاریوں کی مشہور کہانیوں کے ترجموں کا بنڈل بغل میں دبائے آتے ہیں، کتاب چھپواتے ہیں، تقریب رونمائی کرتے ہیں اور جس خاموشی سے آتے ہیں اسی خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔ گزشتہ سال ان کی آمد ایک عدد ناول ''بوم بسیرا'' کے ساتھ ہوئی تھی۔ دو ہفتے قبل ان کی ترجمہ شدہ کہانیوں کی چھٹی کتاب کی تقریب رونمائی ہوئی۔ تین سو پچاس صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مختلف زبانوں کی منتخب کہانیوں کے ترجمے شامل ہیں۔ کتاب کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔ یہاں پر کتاب کی ہر کہانی کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں بس ایک دو کے بارے ہی میں بات چلے گی۔ جیسے ''انسانی یخنی'' امریکی پس منظر میں لکھی گئی یہ کہانی دراصل حماموں کی کہانی ہے۔

حمام، اشنان گاہ، غسل خانے، جائے غسل اور آج کی زبان میں مقبول عام لفظ باتھ روم یا شاور روم ہمارے سماجی رہن سہن کا ایک بہت بڑا مقام ہے۔ جہاں اپنے، اپنے اجسام کی ہر قسم کی گندگی سے صفائی کے نام پر چھٹکارا حاصل کرتے ہیں۔ اس میں ذہنی غلاظت بھی شامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تنہائی کے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم اکثر ذہنی غلاظت جمع بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ چھتیس صفحات پر مشتمل اس کہانی میں ''انسانی یخنی'' کے بیان کے ساتھ ساتھ یورپ، امریکہ، لاطینی امریکہ اور جاپان کے حماموں کی ایک پوری تاریخ بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ آج کے صاف ستھرے، دھلے دھلائے اور دوسروں کو صفائی ستھرائی کی تعلیم دینے والے یورپ، امریکہ میں صرف سو سال قبل تک نہانے کا تصور تک نہ تھا، حمام تو دور کی بات ہیں۔ اسی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ چوتھی صدی کی ایک مردم شماری کے مطابق روم میں لگ بھگ دس لاکھ باشندوں کے لئے سات سو چھپن عوامی حمام تھے اور قدیم رومیوں نے نہانے کو عبادت کے برابر لا کھڑا کیا تھا۔

ستائیس ایکڑ اراضی پر پھیلے ان حماموں میں کھیل کے میدان اور ایک اولمپک سائز کا تیراکی کا تالاب، باغات، فوارے اور ایک چار منزلہ عمارت شامل تھی۔ جس میں سولہ سو افراد نہا سکتے تھے۔ اس عمارت میں مالش کے کمرے، بھاپ میں بیٹھنے کے خواہش مندوں کے خصوصی کمرے، جسم پر خوشبوئیں ملنے کے علیحدہ کمرے اور زلفیں سنوارنے والے ادارے شامل تھے۔ کمروں کی اندرونی دیواروں کو سونے اور چاندی کے نقش ونگار سے سجایا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک سو کمرے عورتوں کے لئے مخصوص تھے۔ کمروں کے فرش پر ٹائل لگے ہوتے تھے اور فرش کو گرم رکھنے کے لئے فرش کے نیچے آگ جلائی جاتی تھی۔ نہانے کے ٹب کو گرم رکھنے کے لئے روزانہ پچاس بھٹیوں میں آگ جلائی جاتی تھی اور کوئی دس ٹن لکڑی اس میں جھونکی جاتی تھی۔ عالمی کہانیوں کے ترجمے کی شکل میں آنے والی ظفر قریشی کی یہ تحریریں جہاں پڑھنے والوں کے ذوق طبع کے لئے اچھا مواد ہیں۔ وہیں اس بات کا ثبوت بھی ہیں کہ ظفر ایک بہت اچھے، منجھے ہوئے، بامعنی اور باادب ترجمہ کرنے والے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کہانی کے ترجمے کو اپنے سانچے میں ڈھال کر بیان کرنے کا ہنر آتا ہے۔

..... شہناز احمد

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۲،شمارہ:مارچ،اپریل۲۰۲۳ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِ سالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

قاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

رابطہ: D-1/537 ، گلی نمبر 18 ، ویسٹریج-III ، راولپنڈی، 46000 ، پاکستان۔

فون: 8730433-8730633-51-(92+)

موبائل: 0558618-336-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد عبداللہ

قرطاسِ اعزاز ۵

ریاضت کا ثمر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سمیط احمد ۶
قلبی کرامات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۹
دھوپ عہد کے افسانے۔۔۔۔۔۔۔جمیل احمد عدیل ۱۳
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۹
نفی اثبات کا چشمہ زار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ممتاز مفتی ۳۰
مجسم ذہانت تخلیق کار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مرزا ادیب ۳۱
نقشِ تنقید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نسیمِ سحر ۳۲
تخلیق بمقابلہ اظہار۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر افتخار الحق ۳۳
سیاہ پہاڑ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید تحسین حیدر گیلانی ۳۷
یُحِبُّ الجمیل ۔۔۔۔۔۔۔۔اشفاق احمد ورک ۴۵
سچا اور سجیلا قلم کار ۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ ۴۷
اہانت کا ہدف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۴۹
قبر والا گھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جمیل احمد عدیل ۵۲

محبوب کی اُمت

ذکی طارق، نسیمِ سحر۔ ۶۰

افسانے

زمین گول ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آغا گل ۶۱
جبینِ نیاز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رینو بہل ۶۶
نادر تحفہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ارم نعیم ۷۱
مراجعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حمید قیصر ۷۴
خیالِ یار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مدیحہ رحمٰن ۷۶
وعدہ معاف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۷۸
احساس کے خوفناک سائے۔۔۔۔۔مشتاق احمد وانی ۷۹

نکہت بہاراں

ساغر صدیقی، ولی عالم شاہین، خالد اقبال یاسر، اشرف جاوید، ارشد سعید، جمیل عثمان، ڈاکٹر ریاض احمد، فقیہ حیدر، نبیل احمد نبیل، احمد رضا راجا۔ ۸۱

ناول

خاکِ شفا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پیرزادہ آلِ انوار ۸۶

انشائیہ

گپ شپ۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی ۹۶

دولت دل

طارق نعیم، مظفر رضوی، حنا رضوی حیدر، سمیرا سلیم کاجل، بشارت وقار، شوکت جمال، طارق تاسی، سبھاش گپتا، امیر حمزہ سلفی، ڈاکٹر پونم گوندل، عاکف غنی، محبوب اصغر، جبین نازاں، وشال کھلر، مادھو کوشک۔ ۹۷

آئینہ فن

فقط ایک آنسو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطاء الحق قاسمی ۱۰۲
خوشبوئے داستاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جمیل عثمان ۱۰۳
ایک لہر کی چھاگل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جنید آزر ۱۰۶

نشانِ راہ

میری پاپا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہما عالم ۱۰۸

کرگس کا جہاں

امیر السلام ہاشمی، پرویز شہریار، نسیم عزیزی، رضیہ اسماعیل، فیصل عظیم، نوید سروش، حافظ محمد احمد، ڈاکٹر نواز دیوبندی، عبدالرحمٰن عبد۔ ۱۰۹

ایک صدی کا قصہ

شیام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہہ الوقار ۱۱۸

قرطاسِ اعزاز

جمیل احمد عدیل

کے نام

کلام نہیں
زوالِ عمر میں
خزاں کا سکوت
دھیرے دھیرے
مئے شبستاں کو مرکز ہ بنا رہا ہے
کہ ابدی تنہائی
اسی خواب زار کو مرغوب کرتی آئی ہے
مگر
ایک آسرا
بہار رت کی نکہت
اور
روشنی کی شکتی
آپ کے وجود کا صلہ بنتی ہیں
کہ حرفِ معنی سے
زیست فروغ پاتی ہے
فکر و خیال کا متن گدلا نہیں ہوتا
ازل سے

زندگی نے رجا سے نمو پائی
نور کا نعم البدل ہونا
شبدوں نے آپ کی تعلیم سے سیکھا
پھولوں نے مہکنا آپ کی اقلیم سے چرایا

بے انت خلا
گمشدگی کا بخت ٹھہرا
لیکن ایک بار تو
کوئی تکلم اندوختہ بنے گا
کیا عجب اسی رختِ سفر سے امید کشید ہو

ہر آن کا جادو
تسلسل کی قیامت
آشا اور نراشا
پتلی کے آنگن میں ناچتی رہیں گی
وقت کے دریا میں تعبیر بہتی رہے گی

ڈاکٹر شفیق آصف

ریاضت کاشمر

سمیط احمد
(لاہور)

نام : محمد جمیل احمد
قلمی نام : جمیل احمد عدیلؔ
ولادت : ۱۲؍فروری ۱۹۶۴ء، ساہیوال
والد محترم : محمد احمد
والدہ محترمہ : منور سلطانہ
برادران : سعید احمد، نوید احمد، وسیم احمد
خواہران : زاہدہ فاطمہ، عابدہ فاطمہ، ساجدہ فاطمہ
ہم سفر : عنبرین جمیل
عترت : مہلب جمیل، سمیط احمد (بیٹے)، میرام عدیل (بیٹی)

تعلیم:

میٹرک، گورنمنٹ میونسپل ہائی اسکول، بورے والا، ۱۹۷۹
ایف۔اے، گورنمنٹ کالج، بورے والا، ۱۹۸۳ء
بی۔اے، گورنمنٹ ایف سی کالج، لاہور، ۱۹۸۵ء
ایم۔اے (اردو)، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۸ء
ایم۔فل، لاہور لیڈز یونیورسٹی، ۲۰۱۸ء

ملازمت:

لیکچرر، نیو ایرا (پرائیویٹ) کالج، سمن آباد، لاہور
(ستمبر ۱۹۸۸ء تا دسمبر ۱۹۸۹ء)
لیکچرر، گورنمنٹ کالج، وہاڑی (دسمبر ۱۹۸۹ء تا مئی ۱۹۹۴ء)
لیکچرر، گورنمنٹ کالج، بورے والا (مئی ۱۹۹۴ء تا نومبر ۱۹۹۸ء)
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج، ساہیوال
(نومبر ۱۹۹۸ء تا اگست ۲۰۰۱ء)
ڈی ای او کالجز، ضلع ساہیوال (اگست ۲۰۰۱ء تا نومبر ۲۰۰۳ء)
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج، بورے والا
(نومبر ۲۰۰۳ء تا جنوری ۲۰۱۳ء)
ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج، راوی روڈ، شاہدرہ، لاہور
(جنوری ۲۰۱۳ء تا اگست ۲۰۱۶ء)
ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور
(اگست ۲۰۱۶ء مئی ۲۰۲۲ء)
پروفیسر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور
(مئی ۲۰۲۲ء تا حال)

اختصاص:

لیکچررز سلیکشن بورڈ ۱۹۸۹ء کے امتحان میں پنجاب میں پہلی پوزیشن حاصل کی!
ایم۔فل کا امتحان یونیورسٹی میں گولڈ میڈل کے ساتھ پاس کیا!
''سیاق وسباق'' پر ملتان بورڈ کی طرف سے منعقدہ، مقابلہ میں دوسرا انعام ملا (۱۹۹۶ء)!
''نایاب لمحے'' پر ملتان بورڈ کی طرف سے منعقدہ مقابلہ میں پہلے انعام کے حق دار ٹھہرائے گئے (۱۹۹۸ء)!

تحقیق:

۱۔ تقسیم کے بعد: اردو ادب میں خودنوشت سوانح عمری تحقیقی مقالہ
ایم۔اے (اُردو) زیرنگرانی: ڈاکٹر تحسین فراقی (۱۹۸۸ء)
۲۔ ڈاکٹر غافر شہزاد کا افسانوی ادب تحقیقی مقالہ
ایم۔فل (اردو) زیرنگرانی: ڈاکٹر طارق عزیز (۲۰۱۸ء)

مطبوعات:

افسانے

۱۔ موم کی مریم (۱۹۹۱ء)
۲۔ زرد کفن میں نخلِ ایمن (۱۹۹۲ء)
۳۔ بے خواب جزیروں کا سفر (۱۹۹۴ء)
۴۔ تو جو ہمسفر ہو جائے! (۱۹۹۷ء)
۵۔ ہاویہ (۲۰۰۷ء)
۶۔ کانپتی شاخیں (۲۰۰۹ء)
۷۔ بیتا ہوا مستقبل (۲۰۱۷ء)
۸۔ گمشدگی سے خالی راستے (۲۰۲۱ء)

تنقید و تحقیق

۹۔ سیاق وسباق (۱۹۹۵ء)
۱۰۔ ذوقِ تحقیق (۲۰۱۷ء)
۱۱۔ غالب کی تہذیبی شخصیت، مفصل مطالعہ (۲۰۱۹ء)
۱۲۔ فکشن کا شہزاد (۲۰۱۹۔۲۰ء)
۱۳۔ اردو افسانہ: نقش تنقید (۲۰۲۰ء)
۱۴۔ خودنوشت سوانح عمری (۲۰۲۱ء)

ادبی کالم + مضامین

۱۵۔ نفی اثبات (۱۹۹۹ء)
۱۶۔ برجستہ (۲۰۰۳ء)
۱۷۔ قیل وقال (۲۰۰۵ء)
۱۸۔ فتاویٰ کاملگیری (۲۰۰۸ء)
۱۹۔ سخن وری اچھی لگی (۲۰۱۴ء)

''چہارسُو''

۲۰- تنقید سے فرصت نہیں (۲۰۱۴ء)
۲۱- نئے ستارے نیا آسمان (۲۰۱۷ء)
۲۲- تفرید (۲۰۲۰ء)
۲۳- منطقات (۲۰۲۱ء)

انشائیے+خاکے

۲۴- نایاب لمحے (۱۹۹۷ء)

سفرنامہ

۲۵- سرزمینِ آسمان میں چندروز (۲۰۰۳ء)

ترتیب وتدوین

۲۶- ٹائٹل سٹوری (جلداول) (۱۹۹۵ء)
۲۷- ٹائٹل سٹوری (جلددوم) (۱۹۹۶ء)
۲۸- شہرۂ آفاق افسانے (۱۹۹۹ء)
۲۹- نروان (۱۹۹۹ء)
۳۰- آج کی بات (۲۰۰۰ء)
۳۱- مزاح نگار حاضر ہوں! (۲۰۰۲ء)
۳۲- سورج کی تین قاشیں (۲۰۱۸ء)

نثری نظمیں

۳۳- سنگریزوں پر بہتی دھوپ (۲۰۲۱ء)

رکنیت:

رائٹرز گلڈ، پنجاب
حلقہ ارباب ذوق، لاہور

اساتذہ کرام:

چودھری عبدالرحیم بھٹہ، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر ریاض قدیر، پروفیسر احمد عقیل روبی، ڈاکٹر عبیداللہ خان، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر آرزو چودھری، ڈاکٹر محمد عالم خان، ڈاکٹر نیر صمدانی، اطہر ندیم، ماسٹر محمد صدیق، ماسٹر عبدالوحید، ماسٹر محمد طفیل چشتی، ماسٹر خوشی محمد

سفر:

سعودی عریبیہ، ۱۹۹۹ء

صحافتی رفاقت:

بطور کالم نگار: روزنامہ: دِن، پاکستان، الجریدہ، الشرق، نئی بات
مدیر: ادبی مجلّہ: زہاب (۶ شمارے)
اسسٹنٹ ایڈیٹر: کالج میگزین: الفرید
نائب مدیر: ماہنامہ: عکسِ کہکشاں
چیف ایڈیٹر: فاران: میگزین، اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور

تراجم:

جمیل احمد عدیل کے منتخب افسانوں کو انگریزی میں چودھری عبدالرحیم بھٹہ صاحب نے منتقل کیا ہے جبکہ پنجابی ترجمہ کرنے کا فریضہ جناب کلیم شہزاد نے ادا کیا۔ جمیل احمد عدیل کی نظموں کو انگلش کا متنی پیکر دینے والوں میں: ڈاکٹر محمد اکرم، محترمہ بشریٰ دلدار اور ذونیرا بخاری کے اسما ملتے ہیں۔

آئینہ فن

۱۔ جمیل احمد عدیل کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ
تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے (اُردو)
مقالہ نگار: صنوبر یٰسین بٹر (۲۰۱۰۔۲۰۱۲)
یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
نگران مقالہ: ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان

۲۔ جمیل احمد عدیل کی تنقید کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ
تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے (اردو)
مقالہ نگار: قانتہ عبداللہ (۲۰۱۰۔۲۰۱۲)
یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
نگران مقالہ: ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان

۳۔ جمیل احمد عدیل کی ادبی خدمات
تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (اردو)
مقالہ نگار: شرافت علی (۲۰۱۳۔۲۰۱۵)
یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
نگران مقالہ: ڈاکٹر خالد ندیم

۴۔ جمیل احمد عدیل کی ادبی کالم نگاری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ
تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (اُردو)
مقالہ نگار: فاخرہ بشیر (۲۰۱۵۔۲۰۱۷)
نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، فیصل آباد
نگران مقالہ: ڈاکٹر سعید احمد

۵۔ جمیل احمد عدیل: ادبی خدمات
تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (اُردو)
مقالہ نگار: سید طاہر طیب (۲۰۱۶۔۲۰۱۸)
بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
نگران مقالہ: ڈاکٹر روبینہ ترین

۶۔ جمیل احمد عدیل کے افسانوں میں فکری عناصر
تحقیقی وتنقیدی جائزہ
مقالہ برائے ایم فل (اُردو)
مقالہ نگار: عنبرین صابر (۲۰۱۷۔۲۰۱۸)
لیڈز یونیورسٹی، لاہور

نگران مقالہ: ڈاکٹر طارق عزیز

۷۔ جمیل احمد عدیل کے افسانوی مجموعے ''ہاویہ'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ
مقالہ برائے بی ایس آنرز (اُردو)
مقالہ نگار: نازیہ مقبول (۲۰۱۳۔۲۰۱۷)
گورنمنٹ کالج برائے خواتین، سمن آباد، لاہور
نگران مقالہ: پروفیسر عظمیٰ اسحاق

۸۔ جمیل احمد عدیل کے افسانوں میں مابعد الطبیعیاتی عناصر
تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (اُردو)
مقالہ نگار: عظمیٰ کوثر (۲۰۱۶۔۲۰۱۸)
نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد
نگران مقالہ: ڈاکٹر نعیم مظہر

۹۔ جمیل احمد عدیل کے افسانوں کا کرداری مطالعہ
تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (اردو)
مقالہ نگار: ثمرینہ صفدر (۲۰۱۶ء۔۲۰۱۸ء)
نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس بہاولپور
نگران مقالہ: ڈاکٹر افتخار احمد

۱۰۔ افسانوی مجموعہ: ''گمشدگی سے خالی راستے''
از جمیل احمد عدیل: تجزیاتی مطالعہ
تحقیقی مقالہ برائے بی۔ایس (اردو)
مقالہ نگار: غلام فاطمہ (۲۰۱۷ء۔۲۰۲۱ء)
گورنمنٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین، وہاڑی
نگران مقالہ: آمنہ رزاق

۱۱۔ جمیل احمد عدیل کے افسانوں کا
تحقیقی وتنقیدی جائزہ
تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (اردو)
مقالہ نگار: فرناز منور خان شروانی (۲۰۲۰ء۔۲۰۲۲ء)
لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
نگران مقالہ: ڈاکٹر تنویر حسین

رابطہ:
میرام کاٹیج،
۱۲۱۔ڈی بلاک، گرین سٹی، برکی روڈ،
لاہور کینٹ
موبائل:
0300-6991126
0323-6996340

''سہ آتشہ''

جمیل احمد عدیل دو آتشہ نہیں سہ آتشہ ہے کہ وہ محض ایک شخص نہیں ہے، شخصیت ہے۔ تعلی بگھارنے والی شخصیت نہیں۔ اپنے تخلیقی وجود کی خوشبو کے کلاوے میں بھر لینے والی شخصیت۔ افسانہ نگار، ناقد، انشائیہ نگار، کالم نگار، معلم، شار، خطیب اور نہ جانے کیا کچھ۔۔۔ شخصیت چھوٹی ہو تو آپ کی گرفت میں آجاتی ہے، بڑی ہو تو آپ کو گرفتار کر لیتی ہے۔ جمیل احمد عدیل ہمارے ان دوستوں میں سے ہیں جنہوں نے ہمیں گرفتار کر رکھا ہے۔

یہ غالباً ۲۰۰۶ء کے وسط کی بات ہے، مجلس میاں محمدؒ بورے والا کی جانب سے بلاوا آیا۔ اسلام آباد اور راولپنڈی سے احمد فراز، جلیل عالی، احسان اکبر اور ابدال بیلا کے ساتھ ہم بھی وہاں پہنچے تھے۔ وہاں جس خوبی اور برجستہ جملوں سے انہوں نے نظامت کا فریضہ نبھایا تھا، مجھے آج تک یاد ہے۔ شاید وہاں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی، نہیں! شاید اس سے بھی پہلے ہم ملے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن کے آپ بہت قریب آجاتے ہیں، اتنے کہ وہ آپ کے لہو میں گونجنے لگیں تو باقی سب کچھ دھندلا جاتا ہے۔ موم کی مریم، زرد کفن میں نخل ایمن، بے خوب جزیروں کا سفر، تو جو ہم سفر ہو جائے، ہاویہ، کانپتی شاخیں۔۔۔ جمیل احمد عدیل کی افسانہ نگاری کی محض منزلیں نہیں، ان کے تخلیقی وجود کے دستخط بھی ہیں۔ اپنی نثر کے اعتبار سے، اپنے سوچنے کے حوالے سے، اپنی عمدہ تخلیقی زبان کے سبب سے، اپنے قضیوں کے باب میں اور اپنے ہرے بھرے، تر و تازہ تخیل کے واسطے سے بالکل الگ نظر آنے والی شخصیت!

جمیل احمد عدیل کے افسانے کے علاوہ میں ان کی نثر کا قتیل ہوں، بات کہہ لینے کا ایسا قرینہ کہ توجہ کھینچے رکھے، جملہ سنوار کر لکھنا انہیں آتا ہے، جمیل جملہ، دانش بھرا جملہ اور ایک تخلیقی وجود کی عطا جملہ!! اور لطف کی بات یہ ہے کہ مجموعی متن میں ہر جملہ الگ سے لطف دیتا ہے اور پوری عبارت کو بھی گہرا اور اُجلا بنا دیتا ہے۔ لاریب! جمیل احمد عدیل صاحبِ اسلوب ہے۔ اس کی نثر کی دھاک میرے دِل پر بیٹھی ہوئی ہے____ ایک تخلیق کار کی دراکی، عمدہ نثر اور تنقیدی بصیرت سے لبالب ان (کے) مضامین میں ہماری ملاقات ایک ایسے محقق اور ناقد سے ہوتی ہے جو پورے استدلال اور حوالہ جات کے ساتھ انتہائی سلیقے سے بات کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ مسلسل مطالعے، شاداب متخیلہ، طبیعت کے ٹھہراؤ اور لفظ کے تہذیبی مزاج سے جڑت نے جمیل احمد عدیل کی شخصیت کو بنایا ہے اور نکھارا بھی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں جمیل احمد عدیل کے دوستوں میں سے ہوں___! بہت محبت پیارے!___! بہت محبت____!___!

محمد حمید شاہد

قلبی کرامات

محمد انعام الحق
(اسلام آباد)

۵ر ستمبر ۱۹۹۲، اسلام آباد۔

عدیل! تمہارا خط ملا!

(۱) پہلی بات شہاب کے بارے میں ہے۔ ''سیارہ'' میں تم نے جو لکھا ہے درست ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کچھ لکھتا۔ پارا سائیکالوجی کے مشاہیر کا خیال ہے کہ آپ مذہبی یا روحانی experience کو نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ انہیں بیتیں نہیں۔ ۱۹۵۵ تک میں نہ خدا کو مانتا تھا نہ اسلام کو نہ پاکستان کو۔ پھر مری کے ایک بزرگ خواجہ جان محمد بٹ نے مجھ پر ایک معمولی سا روحانی مشاہدہ طاری کیا۔ میرا زاویہ نظر بدل گیا۔ منظر بدل گیا۔ دنیا بدل گئی، میں بدل گیا۔

اللہ نہ کرے تم پر کوئی روحانی واقعہ بیتے، یہ بدنصیبی ہوگی! اس سے ذہن بدل جاتا ہے عقل پر اعتماد نہیں رہتا۔ دنیا کی اہمیت کا احساس (جو اشد ضروری ہے چونکہ مسلمان حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے تسبیح چلانے کے لیے نہیں) جاتا رہتا ہے۔ اکثر لوگ ہونٹوں سے مان لیتے ہیں۔ عدیل تم مت مانو، جب تک دل سے آواز نہ اٹھے، مت مانو!

(۲) شہاب سے میں بے پناہ عقیدت رکھتا ہوں۔ شہاب بزرگ سے نہیں۔ شہاب انسان سے۔ وہ عظیم کردار کا مالک تھا۔ اس کے کردار میں دو باتیں نیوکلس کی حیثیت رکھتی تھیں۔ (۱) عجز۔ وہ خود کو کسی شخص سے بہتر یا برتر نہیں سمجھتا تھا۔ (۲) وسعت نگاہ۔

(۳) وہ کسی کا مرشد نہیں ہے۔ اس نے کسی کو بیعت نہیں کیا۔ اشفاق بانو اور میں۔ ہم میں سے کوئی اس کا مرید نہیں ہے۔ ہم میں نہ عجز ہے نہ وسعت نگاہ۔

ہماری خامیاں شہاب کے سر پر نہ تھوپو! اشفاق اپنے جنتر منتر کا خود ذمہ دار ہے۔ میرے عیب میرے ہیں۔ میری تحریروں کی خامیاں میری ہیں۔ شہاب پر الزام نہ دو!

(۴) میری تحریروں کے تضادات:

عدیل! شخصیت کھچڑی ہوتی ہے۔ شخصیت کے ہر وصف میں تضادات ہوتے ہیں مثلاً ایک سیٹھ ہسپتال کو دس ہزار کا دان دے کر گھر آئے گا تو بیوی سے اس بات پر لڑے گا کہ اس کی پرانی قمیض بھنگی کو کیوں دے دی؟ مثلاً تمہاری طبیعت میں خیر کا عنصر ہے تو اس خیر کے عنصر میں کئی شر کی گٹھلیاں ہوں گی۔

خیر کا صحرا!! شر کے نخلستان!! اسی طرح شر کے پس منظر پر خیر کے نخلستان۔ خوف کے وصف میں بہادری دلیری کے جزیرے۔ many اِن one۔ one اِن many۔ اس نے عجب تماشا لگا رکھا ہے۔ شر کی کشش ثقل نہ ہو تو خیر کے بوٹے نہ اُگ سکیں۔ یوں سمجھ لو کہ سارا بھید Polarisation کا ہے۔ شخصیت کا سارا حسن تضادات کی وجہ سے ہے۔ تم فلسفی ہو۔ تم یہ نقطہ (نکتہ) مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ کیا شان تخلیق ہے! نیگیٹو اور پازیٹو کو جوڑ کر بجلی پیدا کرتا ہے۔

(۵) میں سارتر سے متفق نہیں ہوں۔ تمہارا اپنا دل گواہی دے گا کہ تمہاری تحریر اثر رکھتی ہے یا نہیں؟

(۶) ہر کام خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ جہاں تک کائنات کا تعلق ہے انسان کو اللہ نے حکم عدولی کی طاقت اور آزادی دے رکھی ہے۔ اگر تمہیں حکم عدولی کی قدرت حاصل نہ ہو تو جزا سزا مسئلہ بے معنی ہو جاتا۔

(۷) اخلاق کو خود پر حاوی نہ کرو۔ جو تم ہو، وہ ہو۔ Be thyself۔ خود پر ایسی بندش نہ ڈالو جو تمہاری شخصیت کو مسخ کریں۔

(۸) گناہ اس قدر نقصان نہیں پہنچاتا جس قدر Sense of Sin۔ Sense of Sin سے حتی الوسع بچو ورنہ یہ تمہاری تخلیقی قوتوں کو چاٹ جائے گا۔ گناہ جو ہو گیا ہے اسے بھول جاؤ، اہمیت نہ دو۔

(۹) فلیپ لکھنے میں، میں عدل انصاف نہیں کرتا favouritism کرتا ہوں۔ حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔

(۱۰) تم میں تخلیقی قوت موجود ہے، وہ کافی شدت والی ہے۔ لوگوں کی باتوں پر نہ جاؤ۔ خود پر بھروسہ رکھو!

(۱۱) جزا سزا سے بے نیاز ہو جاؤ، اس چکر میں پھنس گئے تو کسی کام کے نہ رہو گے۔ کوئی منفی خیال دل میں آنے مت دو۔ منفی خیال تمہاری تخلیقی قوتوں کو ختم کر دیں گے۔

(۱۲) غصہ آتا ہے تو آنے دو روکو نہیں۔ دل میں بیٹھنے نہ دو نکل جائے، تمہارے کردار کو پراگندہ نہ کرے۔

یہ میرے مشورے ہیں۔ دل کو لگیں تو مانو ورنہ نہ مانو!

ایک بات لازم ہے:

Be thyself!

دوسری بات تمہاری diction کے متعلق ہے۔ تمہاری ڈکشن (1) Poetry (2) Serious (3) Dignified (4) Difficult (5) Heavy یہ ڈکشن ان باتوں کے لیے موزوں ہے:

(1) علمی مقالے (2) تنقید (3) تحقیق

یہ ڈکشن Fiction کے لیے ناموزوں ہے۔ فکشن میں جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے تحریر میں (۱) سادگی، (۲) رنگینی، (۳) روانی، (۴) شوخی کا ہونا لازم ہے۔

تم پھول کو کلہاڑی سے نہیں کاٹ سکتے۔ تمہارے خیالات میں فلسفہ ہے۔ تمہاری Conception اونچی ہیں۔ تمہاری تحریر میں چھیڑ نہیں۔ پھل جھڑی نہیں۔ اس لیے میں درخواست کروں گا کہ اگر فکشن لکھنا ہے تو ڈکشن بدلو!!

ممتاز مفتی

۲۵؍جنوری ۱۹۹۳ء، اسلام آباد

عدیل! خط ملا!

میرے متعلق تم نے دو خوش فہمیاں پال رکھی ہیں:

(۱) کہ میں جانتا ہوں

(۲) کہ میرے خیالات Consistent ہیں اور میرے جذبات میں ہم آہنگی ہے۔

میں بھی ایسے ہی بکھرا ہوا ہوں جیسے تم ہو۔

میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ میرا سچ ہے۔ حتمی سچ نہیں۔ اپنے سچ میں میں ڈنڈی نہیں مارتا۔ میں نے زندگی میں کچھ مفروضے قائم کیے ہیں۔ اگر آپ کو اپیل کرتے ہیں تو مان لو، نہیں تو چھوڑو، دفع کرو۔

(1) پہلی بات یہ ہے کہ روحانیت میں نہ جاؤ گے تو سکھی رہو گے۔ اگر سکھی رہنا نہیں چاہتے تو بسم اللہ ضرور جاؤ۔ پہلے طلب پیدا کرنی ہو گی پھر تلاش میں سرگرداں ہونا پڑے گا۔ ضروری نہیں کہ پا بھی لو۔ اگر پا لو گے تو پابندیاں عاید ہو جائیں گی۔ حکم مانو (سوچنے کی اجازت نہیں دلیل، حجت ہو گی، اس پر سزا مل سکتی ہے۔ نام بھی خارج ہو سکتا ہے) راز کو راز رکھنا ہو گا۔ اظہار پر پابندی ہو گی۔ پھر بھی حتمی سچائی کا بھید نہیں کھلے گا۔ کوئی پہلی سیڑھی پر تھک کر بیٹھ جاتا ہے کوئی آٹھویں پر۔ پردے کھلیں گے؟ ایک دو تین چار۔۔۔ سارے پردے کسی فرد پر نہیں کھلے؛ شاید حضور اعلیٰ ﷺ پر کھلے ہوں۔۔۔ اگر تم بزرگ بن جاؤ یعنی تمہیں وردی پہنا دی جائے تو کیا ہو گا:

(۱) پاور حاصل ہو گی، (۲) لذت حاصل ہو گی۔ (۳) سخت آزمائش ہو گی۔ اگر تمہارا کردار بلند نہیں تو امکانات ہیں کہ تم ان پاورز کو ''مس یوز'' کرو۔ لذت مسلسل نہیں ہو گی۔ جھٹکوں میں آئے گی۔ Flow، Ebb۔ جب Ebb کا دور آئے گا تو سخت کوفت ہو گی۔ حکم ہے کہ Flow پر خوش نہیں ہونا۔ Ebb پر دلگیر نہیں ہونا۔ Power کو ذات کے لیے استعمال نہیں کرنا! ذات کی نفی کرنا ہے۔ مجھ میں ان مطالبات کو پورا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میرا کردار کمزوریوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس لیے میں نے وہ راستہ اختیار نہ کیا۔

اگر تم میں اتنی طاقت برداشت ہے تو بسم اللہ! روحانیت کے لیے دل میں طلب پیدا کرو لیکن میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ عام انسان بن کر جینا افضل تر ہے۔ سکھی رہو گے۔

محتسب سے دوستی ساقی سے یارانہ رہے۔ میں نے ۲۵ اکتوبر کے نوائے وقت، راولپنڈی کے میگزین میں ایک مضمون شایع کیا ہے۔ ''۲۱ ویں صدی کا بزرگ''! ہو سکے تو یہ مضمون پڑھ لو۔

تمہارا خط ۲۴ کو ملا تھا۔ ۲۵ کو میں نے جواب لکھنا شروع کیا ۲۶ کو الرجی کا دورہ پڑ گیا۔ چار دن ضایع ہو گئے۔

دراصل تم نے بہت سے موضوع چھیڑے ہیں۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں لکھنے سے الرجک ہوں۔ لکھ لکھ کر میرا دایاں بازو شل ہو چکا ہے۔ انگوٹھا چھ مرتبہ اکڑ گیا۔ جسے ڈاکٹر Writers Cramp کہتے ہیں۔ اگر ہومیوپیتھی نہ ہوتی تو مدت سے میں لکھنا چھوڑ چکا ہوتا۔

جب میں کہتا ہوں کہ اخلاق خود پر طاری نہ کرو تو میرا مطلب یہ ہے کہ اسے سرسری اہمیت دو زیادہ نہیں۔ نیک بندے میں سب سے بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ اسے گردوپیش بدی نظر آتی ہے اس لیے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے بہتر ہے۔ یہ بہت بڑا عیب ہے۔ نیکی ایک پرسنل چیز ہونی چاہیے تاکہ دوسروں کا نیک ہونے کا مطالبہ دل میں شوکت نفس پیدا نہ کرے۔ اتنے اجلے نہ بنو کہ دوسرے میلے نظر آئیں۔

مجھے نہیں پتہ کہ عقبیٰ کیا ہے؟ جو بھی ہے پڑا ہو۔ بہشت کے لیے نیکی کرنا مجھے اپیل نہیں کرتا۔ یار! تم فلسفے کی دلدل سے بچو۔ اول تو ہمارا reasoning دراصل rationalising ہے یعنی ہم جو ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کے مطابق premises گڑھ (گھڑ) لیتے ہیں۔ ہمارا reasoning دراصل Wanting to Believe کے تحت ہوتا ہے۔

یہ لمبے مسئلے ہیں۔ کبھی ملاقات ہو گی تو دو روز اکٹھے بیٹھ کر ایک دوسرے سے جھگڑ لیں گے۔ خطوں میں بات نہیں بنتی۔ recognition کی خواہش مناسب ہے۔ جب recognition مل جاتی ہے تو پھر شہرت کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

بوند بوند ملے تو وہ انسان کو بنا دیتی ہے۔ ایک دم ملے تو تباہ کر دیتی ہے۔ پھر توجہ شہرت کی طرف ہو جاتی ہے کام پس پشت پڑ جاتا ہے۔ تفاخر جاگتا ہے۔ انسان خدا بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس بیماری کو Delusion of grandure کہتے ہیں۔

خط بھیجنے میں تاخیر کی معافی چاہتا ہوں!

مجھے اس بات پر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ تمہاری تحریریں اب سادہ اور رواں ہوتی جا رہی ہیں۔ پہلے بہت Bookish ہوتی تھیں۔ مشکل الفاظ ہوتے تھے۔ اب تم readable ہوتے جا رہے ہو۔

ممتاز مفتی

یکم مارچ ۱۹۹۳ء، کراچی

پیارے عدیل صاحب!

والسلام!

آپ کا خط ابھی ابھی ملا۔ آپ نے مجھے سراہا، پسند کیا، سر بلند کیا! سو، سوائے اظہار تشکر کے کیا کہوں کہ آدمی اپنے ذہنی رفیقوں کے لیے ہی تو لکھتا ہے اور اس کی تحریریں ایک طرح انہی رفیقوں کے نام 'خطوط' ہوتے ہیں۔ دوسروں کو ان سے واسطہ نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میری کچھ چیزوں نے آپ کو مسرت دی اور میرے لیے یہی بڑا انعام ہے۔

بھائی! ادب اور فن میں 'کامیابی' درحقیقت آنے والی 'ناکامی' ہے۔ میں تو ہر دم احساس زیاں کا شکار رہتا ہوں اور اس دُکھ میں مبتلا کہ ساری عمر گزر گئی اور کچھ حاصل نہ ہوا۔

اپنے بارے میں کوئی زعم نہیں رکھتا؛ کہ میں کوئی 'بڑا' لکھنے والا ہوں۔

ادب، اچھا ادب اہم ہے بے حد اہم۔ لکھنے والے کی یا فنکار کی کوئی اہمیت نہیں۔ خواہ وہ عدیل ہو، اشفاق احمد ورک ہو یا محمد خالد اختر ہو۔

میں تو اب لکھتا لکھاتا نہیں کہ تخلیق یا creativity کے سوتے (تھے بھی یا نہیں!) خشک ہو چکے ہیں لیکن جب آپ جیسے ہونہار پرامنگ 'بالیاقت' (Talented) لوگوں کی تحریریں پڑھتا ہوں تو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ شمع کو جلتے رہنا چاہیے۔ جلانے والا کوئی بھی ہو۔ میں نے جو کچھ لکھا ایک 'امیچرش' Amateurish انداز میں لکھا۔

اپنا جی بہلانے کی خاطر۔ بڑا ادب پیدا کرنے کے لیے (جو ہمہ وقتی کام ہے) جس Professionalism کی ضرورت ہوتی ہے اسے میں اپنا نہ سکا۔ میں انتہائی کاہل شخص ہوں اور میری 'ٹیلنٹ' معمولی تھی۔ جو تھی جلد ہی ساتھ چھوڑ گئی۔

میری دعا ہے آپ اچھے سے اچھا لکھیں۔ اپنی صلاحیتوں کو محنت اور لگن سے پروان چڑھائیں اور انہیں ضائع نہ ہونے دیں۔ عمومی شہرت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس کے پیچھے بھاگنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اصل inspiration یا اندرونی Compression کے بغیر لفظ سے لفظ جوڑتے جانا بے کار شغل ہے۔ اس سے ادب پیدا نہیں ہوتا۔

آپ کے خط نے مجھے خوشی دی!

محمد خالد اختر

۲/اپریل ۲۰۰۱ء، کراچی

عزیز مکرم، سلام مسنون!

یہ خط مجھے بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے صرف نیت بخیر رہی، تاب و تواں مفقود۔ بہر حال اس دوران 'زہاب' سے دل بلاتا رہا۔ پہلا کام تو یہ کیا کہ لغت میں 'زہاب' کے معنی دیکھے۔ شکر گزار ہوں کہ آپ کی وجہ سے میرے محدود ذخیرہ الفاظ میں ایک کا اضافہ ہوا۔

آپ نے کیسی کیسی عمدہ تحریریں جمع کر دی ہیں۔ تحریریں ہی نہیں، تصویریں بھی قابل دید ہیں۔ مونچھوں کے ایسے ایسے اسٹائل نظر آئے کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جائے۔ اس سے خیال آتا ہے کہ ہمارے تخلیق کار اردو میں لکھ کر نہ سہی، مونچھوں کے عالمی مقابلے میں شریک ہو کر تو عالمی شہرت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات اس لیے بھی ذہن میں آئی کہ آپ نے ادار یہ شہرت ہی کے نازک موضوع پر لکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک مقام ایسا آتا ہے جب شہرت کے ڈانڈے رسوائی سے جا ملتے ہیں۔ مگر جو لوگ شہرت کے خواہاں ہیں، آپ اُن کی خوشی کیوں چھیننا چاہتے ہیں؟ جو جس طرح خوش رہنا چاہے، اُسے اُسی طرح خوش رہنے دیجیے۔

آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسے زمانے میں ادبی رسالہ جاری کیا ہے جب ادب کی خدمت کرنا سراسر خسارے کا سودا ہے۔ سوائے ادبی تخلیقات کے رسالے کی تیاری میں کام آنے والی ہر چیز مہنگی ہے، اُس پر مستزاد یہ کہ خریدار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ آپ کے نقصان کو کم کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ رسالہ کسی کو مفت نہ دیا جائے۔ ایسی صورت میں غیر فروخت شدہ رسالے رکھنے کے لیے جگہ کا مسئلہ پیدا ہوگا لیکن آپ اس مسئلے کو بآسانی حل کر لیں گے آپ کا دفتر آئس فیکٹری میں ہے جہاں کولڈ اسٹوریج بھی ہے۔ ادبی کتابیں اور رسالے رکھنے کے لیے کولڈ اسٹوریج سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔

خریدار بنانے کے نیک کام کا آغاز مجھ سے کیجیے۔ اگلا شمارہ وی پی پی سے بھیج دیجیے اور پہلے شمارے سے مجھے خریدار بنا لیجیے۔

آپ نے میری تحریروں کو پسند کیا ہے یہ میری عزت افزائی ہے اور خوش قسمتی بھی کہ آپ نے ایسے زمانے میں پسند کیا ہے جب میں لکھنا چھوڑ چکا ہوں۔ ان شاء اللہ آپ کی رائے تبدیل نہیں ہوگی۔ مئی 1997 سے میں نے عہد کیا کہ اب صرف اپنے نامکمل تحقیقی کاموں کو مکمل کروں گا۔ اب تک اس عہد پر قائم ہوں۔ آپ بھی دعا کیجیے کہ میں اس صراط مستقیم پر چلتا رہوں۔

مشفق خواجہ

۲۹/مئی ۲۰۰۱ء، سرگودھا

عزیز گرامی جناب جمیل احمد عدیل! سلامت رہو!!

مجھے بزرگ ادیبوں میں شامل کر کے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ عرصہ ہوا ن م راشد سرگودھا آئے تھے۔ ان سے ملاقات بھی رہی اور بحث بھی۔ انہوں نے میرے متعلق جو کچھ فرمایا اُسے کم از کم مختصر تاریخ اردو ادب میں شامل کر لینا چاہیے تھا۔ اس سے کتاب کی وقعت میں اضافہ ہو جاتا۔ راشد اب بہت دور جا چکے ہیں۔ ان سے یہ تو توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی رائے کو بدل دیں گے۔ انہوں نے فرمایا میرے متعلق: یہ نوجوان بہت intelligent ہے۔ میں شاید اس وقت ساٹھ سے ایک دو سال کم تھا۔ اب آپ نے میری عمر کی فتنہ سامانی کو بزرگی میں بدل دیا ہے۔

'زہاب' کا دوسرا شمارہ پہلے شمارے سے بہتر ہے۔ میں نے جب یہی بات ایک خاتون سے کہی کہ اس کا دوسرا بیٹا پہلے سے بہتر ہے تو اس کے ماتھے کی سلوٹ ذرا گہری ہو گئی۔ مجھے اپنی نادانی کا احساس ہوا لیکن قول فیصل کو بدلنا مشکل تھا۔' زہاب' کے متعلق میں نے جو عرض کی ہے وہ میرے ایقان کا حصہ ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ 'ایقان' اور 'ایمان' ایک ہی شجرہ نسب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب کے نثری حصہ بڑا وسیع ہے۔ میں نے فی الحال صرف اشتہارات کی تعداد کو گنا ہے اور خواتین کی تصاویر دیکھی ہیں۔ دونوں دیدنی ہیں۔ کچھ خواتین اس سلسلہ اویسہ سے باہر رہ گئی ہیں۔ بسمل صابری کو نظر انداز کرنا ایک اجتہادی غلطی ہے۔ اس نے عمر کا قیمتی حصہ اردو ادب کی آبیاری میں صرف کر دیا۔ یہ کوتاہی ہوگی اگر اُسے اور منور سلطانہ کو تصویری اعزازات سے محروم رکھا جائے۔

ایک معذرت بھی ضروری ہے۔ مجھے 'زہاب' کا شمارہ گھر کے نسوانی حصہ سے باہر ملا۔ میرے پاس صرف بال پوائنٹ پڑا تھا۔ آپ کی طرف سے آیا ہوا خط اتنا خوبصورت اور یادگار تھا کہ میں نے اس کی پشت پر غیر تعریفی جملے لکھ دیے۔ میں تعریف کرنے اور کسی نادرہ روزگار تحریر پر اپنے خیالات عالیہ پیش کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ جب مجھے خوشی ہوتی ہے تو میں ہر آنے والے کو رسالہ دکھاتا

ہوں۔ اگر وہ بہت اچھا کہے تو موسم کی رعایت سے اسے پانی بھی پیش کر دیتا ہوں۔ ورنہ ایسا رویہ اختیار کر لیتا ہوں جو ایک حد تک معاندانہ ہوتا ہے، اچھی اور پرخلوص کاوش کی داد دینا چاہیے۔

فہرست مضامین کا سرسری مطالعہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمارہ خاصا Readable ہے۔ اشتہارات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اہل بورے والا نے 'زہاب' کی پذیرائی میں بخل سے کام نہیں لیا۔ حال ہی میں فیصل آباد والوں نے ایک کتاب نما خوبصورت رسالہ بھیجا ہے۔ نام ''آفرینش'' ہے۔ نام 'زہاب' کی طرح غیر رسمی اور پسندیدہ۔ اردو ادب اپنے مراکز سے اپنے تعلقات توڑ رہا ہے اور مضافات میں چاہنے والوں کی ایک پرخلوص جماعت تیار کر رہا ہے۔ جن میں آپ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے تخلیقی جذبہ میں اضافہ فرمائے۔ میں ان شاء اللہ اپنی تصویر اور تحریر جلدی بھیج دوں گا۔ دعا کریں کہ موسم اگر خوشگوار نہیں تو کم از کم اتنا آزاد پسند نہ ہو۔

انتساب پسند آیا۔ خورشید رضوی ایک ایسا شاعر اور ادیب ہے جس کے کام کو رسالہ کی پیشانی پر لکھنے میں خوشی ہوتی ہے۔ سلامت رہو!! اگر صحت برقرار رہی تو نگارشات کے متعلق دوسرے خط میں اپنے تاثرات رقم کروں گا۔

یادداشت: (رسالہ ملا: ۱۱ بجے دن ۵/ ۲۹

رسید کی اطلاع: ۳۰: ۱۱ بجے دن ۵/ ۲۹

ذہب = سونا

ذہاب = ذہب کی جمع

ایک محقق نے پوچھا: 'زہاب' کا کیا مطلب ہے؟ میں نے اُسے مطمئن کر دیا اور خود غیر مطمئن ہو گیا کیونکہ 'فیروز اللغات' میں یہ لفظ نہیں ہے۔ اگر محض صوتی تاثر کے لیے رکھا ہے تو مزید جستجو کی ضرورت نہیں!!

غلام جیلانی اصغر

۱۳/ اگست ۱۹۹۰ء، ملتان

محترمی جمیل احمد عدیل صاحب!

السلام علیکم! ابھی کوئی دو گھنٹے قبل آپ کا دوسرا خط ۹/ اگست کا لکھا ہوا ملا۔ اگرچہ اب یہ خط جو میں لکھ رہا ہوں پرسوں یعنی ۱۵ اگست ہی کو نکلے گا پھر بھی میں نے سوچا کہ خط تو ابھی لکھ دوں تاکہ مزید تاخیر نہ ہو۔

آپ نے اپنے ۱۷/ جولائی کے خط کے ساتھ جو اپنی تین گرانقدر کتابیں مجھے عطا کی ہیں۔ میری طرف سے اس تحفے کے لیے دلی شکریہ قبول کیجیے! کتابیں تو اپنی جگہ ایک بہت بڑا تحفہ ہیں۔ خط جو آپ نے لکھا وہ اپنی جگہ میرے لیے بہت حوصلے کا باعث ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے جواب میں تاخیر کی۔ پہلے معذرت قبول کیجیے بعد میں تاخیر کے اسباب کا ذکر بھی کروں گا۔

گذشتہ کئی ہفتوں سے میری طبیعت میں مایوسی رہی ہے۔ بیماریاں ایسی ہیں کہ طبیعت کو پژمردہ کر دیتی ہیں اور ساتھ ہی بیزاری کا شدید احساس بھی۔ چنانچہ کسی بھی کام پر طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ سب سے بڑا عذاب تو Diabetes شوگر کا ہے۔ اکثر یہ شدید اضمحلال پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بلڈ پریشر اور اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ دل کا مسئلہ لازمی پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے میں آنکھیں بند کر کے پڑے رہنے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے ایک مرض السر کا بھی لاحق ہے جو بظاہر ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن وقفوں سے پھر ظاہر ہو جاتا ہے۔ ان دنوں اس کی بھی میزبانی کر رہا ہوں۔ یہ مرض بیزاری پیدا کرنے کے لیے دوسری سب بیماریوں سے زیادہ کارآمد ہے۔ بس یہی سبب تھا تاخیر میں، چاہتا تھا کہ طبیعت خاطر میں آ جائے تو خط لکھوں۔ طبیعت خراب ہو تو خوشی کا اظہار مشکل ہو جاتا ہے اور وہ خوشی جو آپ کی تصنیفات اور خط پا کر ہوئی تھی معمولی نہ تھی۔ بہت خوشی ہوئی تھی! میں نے ان کتابوں کو جستہ جستہ اضمحلال کے باوجود پڑھا بھی اور پڑھ کر مزید خوش بھی ہوا۔ آپ کی افسانہ نگاری سے تو میں متعارف تھا لیکن آپ کی نقادانہ صلاحیتوں سے بے خبر تھا۔ 'سیاق و سباق' میں آپ کی کشادہ ذہنی کا عکس دیکھ کر جی خوش ہوا۔ کتابیں ظاہری حسن سے بھی مزین ہیں۔ اللہ آپ کے زورِ قلم میں مزید اضافہ کرے! آمین! تفصیل سے ان شاء اللہ پھر کبھی باتیں کریں گے۔

آپ نے اپنے خط میں میری بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں تو معمولی فقیر آدمی ہوں۔ کسی شمار میں نہیں۔ آپ نے جس محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ آپ کی اپنی کشادہ دلی اور عالی ظرفی کا عکس ہے۔ بورے والا کی تقریب میں شرکت کا یہ میرے لیے بہت بڑا انعام ہے کہ میں آپ کی توجہ، محبت اور عقیدت کا حق دار ٹھہرا اور حنیف صوفی صاحب کی دوستی بھی ملی۔ میں تو مشکل ہی سے گھر سے نکلتا ہوں۔ آپ کا آنا ادھر ہو تو مرے پاس ضرور آیئے۔ مجھے بہت خوشی ہو گی!

آپ کو بے شک خدا نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان صلاحیتوں سے پورا کام لیجیے اور خاص طور سے جوانی کے دنوں میں تاکہ بعد میں ہماری عمر میں پہنچ کر افسوس نہ ہو کہ جو کام کر سکتے تھے وہ بھی نہیں کیے۔ مجھے نہیں معلوم آپ کی عمر کتنی ہے؟ آپ کی کسی کتاب پر بھی آپ کی تاریخ پیدائش درج نہیں ہے تاہم میرا اندازہ ہے کہ ابھی آپ 35 برس کے نہیں ہوئے۔ اگر یہ اندازہ درست ہے تو سی ایس ایس اور پی سی ایس کے امتحانات میں ضرور شرکت کریں۔ اللہ مدد کرے گا! اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھیے کہ دس پندرہ برس بعد آپ کو افسوس ضرور ہو گا۔ پی ایچ ڈی بھی جاری رہے۔ 'ٹائٹل سٹوری' میں آپ نے میرا افسانہ شامل کیا۔ اجازت کیسی! دوستی اور محبت ہو گئی تو پھر ہمارے افسانے ہمارے کہاں رہ گئے! آپ کے ہو گئے!!

آپ نے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے اچھا موضوع منتخب کیا ہے۔ میرا خیال ہے قدرے مشکل ضرور ہے لیکن آپ ان شاء اللہ کامیاب ہوں گے! میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں!!

حنیف صوفی صاحب کو میرا سلام کہیے اور ان سے بھی کہہ دیجیے کہ اب ملتان آئیں تو میرے گھر ضرور آئیں کہ اب حیثیت ایک اجنبی کی نہیں رہی، ایک دوست کی ہو گئی ہے!!!

عرش صدیقی

دھوپ عہد کے افسانے

جمیل احمد عدیل

موجود نے جہاں زیست کو کرشماتی سہولتیں عطا کر کے تیز رفتار، آسان اور پُر آسائش کر دیا ہے وہاں فرد کو اس ماضی سے تہی بھی کر دیا ہے جس نے ایک خوابناک طمانیت کی وساطت سے اُسے اشیا و مظاہر کی بابت پختہ عقائد کی 'زنبیل' سے سرشار کر رکھا تھا۔۔۔واضح رہے 'موجود' کا زمانی تعین کرتے ہوئے بھی چند صدیاں ضرور درکار ہوتی ہیں۔۔۔اس مقام پر 'رجعت پسند' ذہن سے ہمدردی کا اظہار لازم ہو جاتا ہے کہ قرنوں کے مسلمات جب بکھرتے دکھائی دیں تو آنکھیں نمناک کیوں نہیں ہوں گی! اداسی کا سائبان روح کا مقدر کیوں نہیں بنے گا: کوپرنیکس، گلیلیو، ڈارون، ویلیس، سپنسر، فرائڈ۔۔۔کس کس 'زخم گر' کو، کوسا جائے؟!؟ ہر نیا نظریہ، روایت کے صنم پر کاری ضرب لگاتا ہے۔۔۔!!! ہر نئی ایجاد تازہ چرکہ (Trauma) انسان کا نصیب بنانے کے لیے مستعد ہے!!! اس تناظر میں 'حال' کو 'دھوپ عہد' سے تعبیر کرنا بے جواز نہ ہوگا کہ ان گنت جبت جادو، Dictums ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے، بے حجابی کے اس دور میں محجوب خامشیاں پیہم آشکار ہو رہی ہیں۔[1]

افسانہ جو اپنے مرکزی جوہر تحیر کے فسوں کی اساس پر استوار تھا، کیسے بقا کو برقرار رکھ پائے گا؟ یہ سوال سرخ نشان کی صورت سامنے آ کھڑا ہوا۔۔۔ن حیران کن بات ہے کہ بظاہر یہ نرم و نازک سی صنف نہایت سخت جاں ثابت ہوئی ہے کہ بدلتے تقاضوں کے باوصف قائم ہے، غالباً اس کی فطری داخلی توانائی نے بھرپور ساتھ دے کر اسے حیاتِ نو سے ہمکنار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جدید تکنیک کو اس نے قبول کیا، اسلوب کی تازگی کو جذب کیا، موضوع کی طرفگی کو جزوِ متن بنایا۔ علی حیدر ملک کے الفاظ میں: ''اردو افسانہ، آغاز سے اب تک ہمیشہ اپنے زمانے سے آنکھیں ملا کر اور پاؤں مضبوطی سے دھرتی پر جما کر آگے بڑھتا رہا ہے اور اس نے بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔'' اگر کہیں 'وقفہ' آیا بھی تو تفقد کی مٹھ اپنی علامتی معنویت کا گویا اثبات کراتی رہی ہے۔

طرزِ کہن سے گریز اختیار کرتے ہوئے آئینِ نو سے ہم آہنگی کی روش اپنانے والوں نے آج جس نئے افسانے کو تخلیقی ادب کا ترجمان بنایا ہوا ہے ان میں محترمہ سیمیں کرن کا نام نمایاں ہے۔ یہاں یہ صراحت بے محل نہ ہوگی کہ کبھی ایسا ہو جاتا ہے؛ بطور مصنف کوئی شخص آپ کے لیے اجنبی نہیں ہوتا؛ مگر اس کی تحریر آپ کی آنکھوں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی۔۔۔سیمیں کرن صاحبہ کے متعلق بس اتنی خبر تھی کہ معاصر افسانہ نگار ہیں لیکن انھیں پڑھنے کا اتفاق نہ ہو سکا تھا۔۔۔اب جو ان کے افسانی مجموعے: ''شجرِ ممنوعہ کے تین پتے''، ''بات کہی نہیں گئی''، ''لوح'' میں چھپا ایک غیر معمولی افسانہ اور چند دیگر جرائد کے توسط سے کچھ افسانے میسر آئے تو معلوم ہوا، یہاں افسانے/کہانی کا واقعہ معمول سے کافی جدا جادہ تراش چکا ہے۔ ان کے افسانوں کی پہلی قرات سے یہ تاثر ابھرا ہے کہ تفکیر کے عمیق تر منطقات کا رقص افسانہ نگار کی مرکزی ترجیح ہے۔۔۔عام طور پر فکری نوعیت کے مسائل کی جانب خواتین فکشن رائیٹرز زیادہ رغبت محسوس نہیں کرتیں؛ البتہ سیمیں کرن کے لیے واضح استثنا ہے کہ وہ وجودِ انسانی کے ان امکانات کی جستجو میں محو رہتی ہیں جو بلاواسطہ یا بالواسطہ مابعد الطبیعیات کے علاقوں سے اپنا تعلق جوڑتے ہیں۔

شہزاد منظر نے کہیں لکھا ہے: ''جس عنصر پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ مصنف کا نقطہ نظر یعنی پوائنٹ آف ویو ہے، جسے مصنف کا نظریہ حیات بھی کہا جا سکتا ہے۔'' یہ ورژن یا بصیرت 'خاصاں دی گل' ہے جو خداداد ذہانت اور متواتر تفکر کا انعام ہے۔۔۔لیکن۔۔۔یہ تعذیب کی صلیب بھی ہے۔ محترمہ افسانہ نگار مکرب ساعتوں کو گلے کا ہار بنائے مسرور ہیں کہ بہر رنگ یہ صراط ان کا اپنا انتخاب ٹھہرا۔۔۔آزمائش یہ ہے کہ وہ ان بل کھائے ہوئے مباحث کو کہانی کی بنت کا حصہ بنا پائی ہیں یا نہیں؟ اور اس نوعیت کے مزید سوالات: یعنی فرد کی زندگی کے ناتے کائناتی اسرار کے ساتھ کن گرہوں میں بندھے ہوئے ہیں؟ پھر مخلوق کا خالق سے رشتہ شخصی اساس پر کچھ حقیقت رکھتا ہے؟ جی ہاں! ان تناظرات میں افسانہ فنی تقاضوں اور تکنیکی ندرتوں کے ہمراہ افسانوی مزاج سے مطابقت رکھنے والا متن کیا تشکیل دے سکا ہے؟؟ یہ جانچ اس لیے اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ اس نوع کی بحثیں فلسفے کے مضمون سے مربوط ہونے کے سبب اور طرح کے اسالیب کی صورت گری کرتی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں: ''یوں بھی فلسفہ، شعور کے حربے سے حقیقت تک پہنچنے کی ایک سعی ہے اور فن، خواب کے وسیلے سے: اس لیے جو فن پارہ اپنے طریقِ کار کو تج کر، فلسفے کے آلات بروئے کار لانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اسی نسبت سے اپنے مشن میں ناکام بھی ہو جاتا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کا موقف اصولی ہے لیکن فلسفہ مآل کار زندگی ہی کے مدار میں اسیر رہتا ہے؛ نیز فرد کو منہا کر کے کوئی احساس بشری سطح پر 'ہنوز' ایجاد نہیں ہو سکا؛ اس لیے فنِ افسانہ میں فلسفہ شجرِ ممنوعہ نہیں؛ بس شرط وہی ہے کہ کردار، واقعہ، منظر، ماحول سے اُس کی جڑت کا معاملہ پھول اور شاخ کی Organic پیوستگی ایسا ہے یا نہیں؟ اسی Context میں احتشام حسین کے الفاظ کی معنویت فہم میں جذب ہوتی ہے کہ: ''افسانہ دراصل زندگی کا ادبی نقش ہے!!'' تو مطالعۂ متون کے بعد ممکنہ معروضیت نے یہی توضیح کی کہ سیمیں کرن نے علوم و فنون کی منتقلی کے لیے اساطیر کے خزانۂ عامرہ یا جدید علم کلام کی مجلدات کو مرکز مان کر اقتباسات سے عبارت کی تزئین پر یقین نہیں رکھا بلکہ انسانی احساس کے ساتھ ایسا ارتباط قائم کیا ہے کہ ہمویت کی، کوئی شکل ابھرنے نہیں دی۔ اب یہ عمل اس درجہ آہن گداز مشقت مانگتا ہے کہ ایک دم دانتوں تلے پسینہ آ جاتا ہے!! جی صاحبو! سائنسی شعور کا آفتاب وجود کے نصف النہار پر چمک رہا ہو، حقائق کلیوں کے متعین نقوش میں ڈھلے سامنے پڑے ہوں اور افسانہ نگار واقعے کی سمتوں کو اپنے تخلیقی بہاؤ میں آزاد چھوڑ دے، کردار کی مسافت پر کوئی پہرہ نہ بٹھائے۔۔۔یہی وہ ہُنر ہے کہ عنان ہاتھ میں ہونے کے علی الرغم دکھائی نہیں دیتی!

اپنی موجودگی کو مخفی کرنے/رکھنے کا ایسا طلسم طویل مجاہدے کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس تناظر میں جب سیمیں کرن کے افسانے: ''بات کہی نہیں گئی'' (ٹائٹل سٹوری) کا جائزہ لیا جائے تو قصہ ممتاز مفتی کی: 'ان کہی' اور 'کہی نہ جائے' کے متوازی ایسے ٹریک کو متعارف کراتا ہے جو اپنے خیال اور پیش کش کے اعتبار سے کافی مختلف ہے: 'وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں' کی نسبت سے افسانہ نگار 'محرمِ گوش' اور 'طرب آشنائے خروش' کے بیچ خاموش اور فراموش رشتے کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں!!۔۔۔!! ''لذت کی پلیٹ کا آخری ذائقہ'' ایک عجیب افسانہ ہے! انسانی حسیات کی مہین ترین سطحوں کو Capture کر لینا گواہی دیتا ہے کہ افسانہ نگار کے ہاں احساس کی شدت اور مشاہدے کی درا کی خطرناک حد تک ہمہ وقت ترازو رہتی ہے! اس کا انجام اگرچہ موت کی Absurdity پر ہوتا ہے لیکن ذائقے کی حس کا سہارا لے کر بشر کو ایک بار تو اصل روپ میں دکھا دیا گیا ہے۔ ''بھیڑیا جاتی'' بظاہر بے ضرر سا تحول (Metamorphosis) ہے لیکن وجود کے اس جزو کو سامنے لاتا ہے، جس کے خلا کو چھپانے کے لیے اخلاقیات کے لامتناہی سلاسل خلق کرنے پڑے لیکن یہ ڈریپری یا چلمن کچھ بھی چھپا نہ سکی۔ افسانہ نگار نے منظر نامے اور احساسات کو مرد کی آنکھ سے دیکھا/دکھا کر قاری کو پریشان کر دیا ہے! ''عادت سیڑھی'' پڑھ کر بیدی کی بابت سید وقار عظیم کی بات یاد آ گئی: ''۔۔۔ایک دوسری چیز جس کا بیدی کے کرداروں پر گہرا اثر ہے، وہ عادات کی پختگی ہے۔ عادت راسخ ہو جاتی ہے تو نفسیاتی اصلاحوں کو بھی ان کے سامنے سپر ڈالنی پڑتی ہے۔'' سیمیں کرن کا مذکورہ افسانہ اعادے کی ایسی خو کو بیانیے میں ڈھالتا ہے جس سے کوئی 'مردِ حر' بھی مستثنا نہیں ہوگا! سائیکالوجی والے Compulsive Disorder کہہ کر ایک طرف ہو جائیں گے لیکن بعنوانِ مداومت ہم جو خوگرِ کارِ خیر ہیں، وہ کدھر جائیں؟ ''استغفراللہ'' جس 'نظریۂ ضرورت' کے تحت کایا کلپ کو شعار بنائے ہوئے ہے، اس کے نیوکلیس 'ارمغانِ حسین' کے توسط سے رائج الوقت 'مابعد الطبیعیات' کو بڑی جرأت سے بیان کر کے افسانہ نگار نے متعدد علامتی کرداروں کو دھوپ میں لا کھڑا کیا ہے۔

سیمیں کرن کا افسانہ: ''طاہرہ۔۔۔سنو۔۔۔!!'' روٹین کے افسانوں سے زیادہ توجہ طلب ہے، جس کی کہانی یہ ہے کہ بدقسمتی سے طاہرہ جنسی جبر کا نشانہ بن جاتی ہے۔۔۔مجرم کے ساتھ کیا ہوا؟ افسانے میں اس کا کوئی ذکر اس لیے نہیں کہ اصولی سطح پر اس کی اہمیت نہیں تھی۔۔۔جس ایشو پر فوکس کیا گیا ہے، اس کا نقطہ مرکز یہ متاثرہ لڑکی کا خود کو داغ دار سمجھنا ہے؛ ظاہر ہے وہ نردوش ہے، معصوم ہے لیکن جو غلاظت ایک خبیث اس کے بدن سے چپکا گیا ہے، وہ روح کو آلودہ کر چکی ہے؛ جسے سات سمندروں کا پانی بھی دھو نہیں سکتا! افسانے کا دوسرا کردار ردا علی سے موسوم ہے جو ایک پختہ سن زیرک خاتون ہے، وہ تطہیرِ نفس کے ذریعے طاہرہ کو گندگی کے مدار سے نجات دلانا چاہتی ہے اور اسے سمجھاتی ہے:

''سنو، میری بات سنو! لمس تو بس ایک احساس کا نام ہے احساس کرو تو ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔۔۔کرخت سے کرخت لمس بھی احساس نہ ہو تو کچھ بھی تو نہیں۔۔۔عورت کو یہ زبان اس طرح جاننا چاہیے کہ اس کا کنٹرول سوئچ اپنے ہاتھوں میں رکھے، بالکل ویسے جیسے کوئی آواز نہ سننے کو جی چاہے تو کانوں میں روئی ٹھونس لی جاتی ہے۔''

جب طاہرہ اس استدلال سے مطمئن نہیں ہو پاتی تو ردا علی اس سے اپنا تجربہ شیئر کرتی ہے کہ نوعمری میں وہ اپنی والدہ کے ہمراہ ایک بزاز کی دکان پر گئی تو دکاندار نے تھان کھول کر زانوؤں پر کپڑا پھیلاتے ہوئے ذہنی بے حیائی کا ثبوت دیتے ہوئے عمداً اپنا ہاتھ اس کے زانو پر رکھ دیا؛ ایسے میں کسی خودکار دفاعی نظام کے تحت وہ مذکورہ سوئچ کے استعمال سے ایکدم واقف ہوگئی! اس نے اپنے سر یرکو اس پہلو سے یوں مکمل بے حس کر لیا کہ اس گھٹیا آدمی کی لذت کا بحر یکا یک خشک ہو گیا، سو، خجل ہو کر اسے فوری لاتعلق ہونا پڑا!!۔۔۔!! لیکن اس جیسی عملی مثالوں سے بھی طاہرہ کی تشفی نہیں ہوتی تو ردا علی اسے اعتماد میں لیتے ہوئے بتاتی ہے کہ جس جور کا تم ایک بار شکار ہوئی ہو، میں اس عذاب سے ان گنت مرتبہ گزری ہوں۔ جس پر طاہرہ ششدر رہ جاتی ہے:

''تو کیا آپ بھی! کیا آپ کے ساتھ بھی؟ کیا کچھ ایسا۔۔۔!!''

ردا علی وضاحت کرتی ہے: نہیں، وہ تو نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔۔۔اور یہ وہ مقام ہے جہاں یہ کہانی بہت تیکھے اور عمیق افسانے میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ مصنفہ ایک ایسی صورت حال سامنے لے آتی ہیں جس میں مضمر ایذا کی شدت کہیں زیادہ گمبھیر ہے۔ ردا علی طاہرہ سے کہتی ہے لمس کے جبر کی ایک وہی شکل نہیں جو تمھارے حصے میں آئی، کیا تم میرے کرب کا اندازہ کر سکتی ہو کہ مجھے ایک ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزارنا پڑی ہے جس سے میری روح کا کوئی رشتہ نہیں۔ اس کے تکیے پہ سر رکھ کر سونے کے باوجود میری روح کنواری اور پیاسی ہے۔ اس کے بدن کی مدد سے اپنے بچوں کو جنم دینے کے باوصف میرے دل میں آمادگی کے عنوان سے قطعاً کبھی کچھ موجود نہیں رہا۔ ناپسندیدہ مساس کے دوزخ سے مجھے اسی سوئچ نے بچایا:

''اب صرف میرا جسم ہوتا ہے، روح الگ کھڑی نظارہ دیکھتی ہے اور بدن ساری شکنیں جھاڑ کر پھر کھڑا ہو جاتا ہے۔۔۔بعض اوقات تو۔۔۔سوئچ اتنی سختی سے بند ہو جاتا ہے کہ میری کنواری روح بدن کو بھی ساتھ لے جاتی ہے اور اس کے نیچے صرف خاک کا ڈھیر پڑا ہوتا ہے!!''

اب یہ ہے وہ عدم مطابقت جس نے ازدواجی زندگی کو جہنم نظیر بنا رکھا ہے، ہم آہنگی بلاشبہ نعمتِ عظمیٰ ہے لیکن یہ 'شے' ایسی سادہ اور میکانکی نہیں؛ جذباتی سطح پر طرفین کا ایک پیچ پر ہونا سب سے پہلے ذہنی قربت کا متقاضی ہے۔۔۔یہاں دفعتہً محمد عمر میمن کا ایک نادر مضمون: ''بے قاعدہ افعال کی گردان اور بکریوں کا شمار'' یاد آ گیا ہے۔[2]

جس میں: منٹو، عزیز احمد، میلان کنڈیرا، پابلو نیرودا کی تحریروں کو زیر بحث لاتے ہوئے اس موضوع پر ارتکاز کیا گیا ہے کہ جنسی اختلاط کے دوران عورت بے واسطگی کو پناہ گاہ کیوں بنا لیتی ہے؟ مثال کے طور پر منٹو کے مضمون: ''عصمت فروشی'' کی چرواہن 'ویشیا' معاوضہ لے کر بے حس و حرکت لیٹ جاتی ہے اور دور درختوں پر خود کو مرکوز کر کے ان: پیڑوں، بکریوں، کووں اور ٹہنیوں کو شمار کرنے میں

مشغول ہو جاتی ہے۔۔۔اسی طرح کنڈیرا کے ناول: ''خندہ اور فراموشی'' کی 'تمینا' نے دورانِ مباشرت Irregular Verbs کی گردان کا مجرب نسخہ آزمایا اور انحراف کے لیے اپنی توجہ کو شوہر کی ڈائریوں پر مرکوز کیا جن کے حصول کے لیے وہ یہ 'کشٹ' کاٹ رہی تھی۔۔۔جسمی عدم تعاون کی جہت مشترک ہونے کے علی الرغم کہا جا سکتا ہے کہ محولہ واقعات میں عورت قانونی زوج نہیں۔۔۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؛ بھلے ہی شرعی/سماجی مقتضیات کا تام جھام سے اہتمام کیا گیا ہو؛ اگر فریقین میں بُعد ہے تو وہی تصویر بنے گی جسے 'شہوانی فالج زدگی' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[۳] اور سیمیں کرن صاحبہ نے اسی طرف کا ایک زاویہ ''ہم زبان'' میں تخلیقی لطافت کے ساتھ دکھایا ہے؛ جس میں بشیر احمد کی منکوحہ شفق اعلا ادبی/علمی ذوق کی مالکہ ہے لیکن اس کا ہم سفر یکسر دوسرے قطب پر واقع ہوا ہے؛ ایسے میں ذہنی/روحانی ہم نشینی کی صورت نہیں بن پاتی؛ یوں فاصلے برابر فروغ پاتے رہتے ہیں!!

''طاہرہ۔۔۔سنو۔۔۔!!'' کا بیانیہ محض عورت کو لمسیاتی بے حسی کی تربیت دینے تک محدود نہیں ہے کہ حقیقتاً یہاں عورت صرف ایک فرد ہے کہ مرد بھی ذہنی سوئچ آن آف کرنے کا بنیادی استحقاق رکھتا ہے۔۔۔ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی خودنوشت سوانح عمری: ''نشانِ جگرِ سوختہ'' میں لکھا ہے:

''میرے لیے عورت کا آدھا حُسن صرف اس کی آواز میں ہے!!''

اب کرخت اور بھدی آواز والی تند خو زن (Shrew) کے لیے مرد کو بھی سوئچ پر تصرف کا حق حاصل ہے۔۔۔بر سبیل تذکرہ: ہمارے ایک سینئر دوست نے اپنی ذاتی زندگی کا یہ رخ بتا کر قدرے حیران کیا تھا کہ جب ان کی شادی ہوئی تو شبِ زفاف ناگاہ دولھن کے پاؤں پر نظر پڑی، اتنے Ugly Feet تھے کہ ان کے تمام جذبات یکلخت سرد ہو کر رہ گئے۔۔۔تین ماہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد وہ اس صورت حال کو کلیۂ خیال سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہوئے تو ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہو سکا!! ''طاہرہ۔۔۔سنو۔۔۔!!'' سے یہ روشنی ملتی ہے کہ اگر عورت 'بوجوہ' ایسے مرد کے ساتھ باندھ ہی دی گئی ہے تو مرد پہ لازم ہے کہ وہ مناکحت کی بے لذتی کو رفاقت کی لذت میں منقلب کرے۔۔۔اسے اتنا غیور اور حساس ضرور ہونا چاہیے کہ جب اس کی مدرکہ محسوس کرے عورت اپنا سوئچ آف کر رہی ہے تو پہلے مرحلے میں اس سے دور رہے، پھر معروضی انداز میں اس کا سبب معلوم کر کے Sexual Anaesthesia کے تدارک کی روش اپنائے اور ایسا کرنا شریک حیات پہ کسی طرح احسان کے زمرے میں شامل نہیں ہوتا کہ یہ اس کا Basic Right ہے۔۔۔اگر مرد اس کے بنیادی حق کا احترام نہیں کرے گا تو وہ خود اس حق کا استعمال نہیں کر سکتا۔۔۔رہی دھونس تو اس کا نتیجہ ظاہر و باہر ہے: بکری شماری، بے قاعدہ افعال کی گردان، جمالیات اور مودت سے تہی خالص حیوانی جنسی جبلت کا مظاہرہ، یوں آبادی میں ہوشربا اضافہ!! اور اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ عمل ہماری پوری سماجیات کو محیط ہے؛ جو غالب ہے، وہی واحد متکلم ہے، وہی داروغہ ہے، وہی مخدوم ہے، وہی Exploiter ہے؛ جو مغلوب ہے، وہ نما نا خود کو Mute کر کے آہستگی سے اپنی روح کو گہری غار میں دھکیل دیتا ہے؛ ہاں! گوشت پوست سے مرتب ایک مجموعہ اعضا برائے خدمت ضرور حاضر رہتا ہے؛ یہی پیکر حکم صادر ہونے پر سامع بن جاتا ہے؛ اشارا پاتے ہی قاری ہو جاتا ہے؛ سارا دن گلیوں بازاروں میں روزگار کی مشقت سہتا ہے؛ کچن میں روٹی ہانڈی کے لیے جتا رہتا ہے۔۔۔زیست سے وابستہ ہما ہمی کا مشینی عمل مسرت و بہجت کے فطری روغن و ذہن (Lubricant) کے بغیر پورے شور سے جاری ہے۔۔۔ایسے میں گراریاں کب تلک رپٹواں رہیں گی؟!؟ نہیں معلوم؟!؟

انسانی وجود کا سب سے معماتی علاقہ اس کی نفسیات ہے، یہ افسانہ بین برہان ہے کہ افسانہ نگار اس پر پیچ وادی سے گہری واقفیت رکھتی ہیں۔

''شجرِ ممنوعہ کے تین پتے'' (ٹائٹل سٹوری) مصنفہ کا شاہکار ہے جو انسانی جبلت سے جڑے ایک بڑے سوال کو تخلیقی Narrative میں منقلب کر دیتا ہے اور بغور دیکھا جائے تو خیر و شر کے گمبھیر قضیے سے پھوٹتے ہوئے کئی شاخسانے اس کے ہمرکاب ہیں۔۔۔جن کے جواب ایسا بھید ہیں؛ 'اینہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است'! لیکن عوام کو یہ اذن حاصل نہیں کہ ان کے Direct Solution کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لیں۔۔۔معلمین و متکلمین جن گرہوں کی مدد سے گتھی الجھا گئے ہیں، اسے اسی طرح نہ صرف وصول کریں بلکہ قبول بھی کریں! اس افسانے کا راوی آخر میں کہتا ہے:

''یہ اثرِ خمار روح کو چڑھا تھا یا پھر بدن کو؟ کیا روح بھی غلیظ ہوتی ہے؟ کیا روحیں شیطان و رحمان کی نمائندہ نہیں ہوتی ہیں؟ یہ حقیقت کبھی نہیں سمجھ پاؤں گی اور میں نے اپنی اس تحریر کو یونہی نامکمل/ادھورا چھوڑ دیا!''

تکنیکی لحاظ سے افسانے کا حُسن بلاشبہ اس استفہامیہ انجام سے کہیں جاذب ہو گیا ہے کہ بہرحال یہ فکشن ہے، 'جواب مضمون' نہیں۔۔۔لیکن Content کو جس Subject سے ہم رشتگی میں پرویا گیا ہے، اس پس منظر میں گفتگو کے درضرور وا ہو سکتے ہیں کہ Evil کیا خلقی طور پر Evil ہوتا ہے؟ 'تاری ہلاکو' کا کردار 'حجاج بن یوسف' کا پرتو ہے (اگرچہ موخرالذکر کو اپنی 'صلاحیتوں' کے اظہار کے وسیع پیمانے پر 'عظیم الشان' مواقع 'نصیب' ہوئے) لیکن وہ قاہر جیسا ہے ویسا اپنے ظاہر سے نظر بھی آتا ہے وگرنہ اس سے بڑھ کر بھی سفاک موجود ہیں جو اپنے وجود کے فولاد پر مخمل لپیٹے ہوئے ہیں! مصنفہ نے فی الاصل بین السطور یہ سوال چھوڑا ہے، کبھی ہمیں سوالوں کو Exclusive صورت میں دیکھنا چاہیے کہ ہماری نظر، صدیوں سے ان سوالوں کو دیے گئے جوابوں کے پیراڈائم میں دیکھنے کی عادی بنا دی گئی ہے۔۔۔لیکن یہ افسانہ اپنی بنت، تکنیک، موضوع۔۔۔غرض ہر اعتبار سے بہترین فن پارہ ہے اور قاضی عبدالستار کے اس مطالبے پر پورا اترتا ہے: ''ملکۂ حُسن کی طرح اس (افسانے) کا جسم نئی بُنی ہوئی چارپائی کی طرح تنا ہوا اور گٹھا ہوا ہونا چاہیے!!''

اسی طرح ان مجموعوں سے ہٹ کر سیمیں کرن کا افسانہ: ''دوچشمی ہجر'' دم بخود ہو کر پڑھتا چلا گیا؛ خیال تھا: 'سویرا' لاکر خواندگی سے گزروں گا لیکن یونہی

ایف بی پر قرات شروع کی تو آخری سطر پہ جا کر رکا۔۔۔ پہلے تو افسانہ نگار کو اس نادر و منفرد عنوان کی داد وصول کرنی چاہیے۔۔۔ ایک غیر معمولی ٹائٹل جو متن کا غایت درجہ ترجمان ثابت ہوا ہے۔۔۔ اب آتے ہیں اس کے موضوع کی جانب؛ مرکزی کردار کی ذات سے کہانی پیوست ہو کر آگے بڑھی ہے۔۔۔ ظاہر ہے واحد متکلمہ معمول کی فرد نہیں۔۔۔ اور کسی ایک واقعے نے اس کی ذہنی/ جذباتی صورت حال میں تغیر پیدا نہیں کیا؛ ایک Chain ہے سانحات کی؛ یہ المیے اسے محرومی در محرومی سے دوچار کرتے چلے گئے ہیں۔ حزن کی فضا افسانے کی مرغوب غذا ہے مگر ایسے کردار کا کرب اوڑھ کر لکھنا عذاب میں سے گزرنے کے مترادف ہے؛ اس تعذیب سے تو محض واقف ہونا بھی کچھ کم اذیت خیز تجربہ نہیں؛ جس ثنویت کی مدد سے اس کردار نے اپنے خلا کو پر کرنے کی مساعی کی ہیں؛ اسے توازن کے ساتھ نبھانا تنی ہوئی رسی پر قدم زنی کے برابر تھا؛ اور افسانہ نگار کے پاؤں میں کہیں ڈگمگاہٹ کے آثار ظاہر نہیں ہوئے۔

اب رہا الیشو Fetishism کا جو ایک غیر جنس سے لامسہ کے ذریعے ظہور پذیر ہوتا ہے تو بدیہی امر ہے کہ اس میں انحرافی رویہ ابھرتا ہے لیکن اس کردار کے مسئلے سے جڑ کر کمال خوبی سے Justify ہو رہا ہے؛ اب اس کے سنگ سنگ ان دیکھے، اجنبی مرد سے جن خطوط پر وہ کردار مربوط ہوا ہے وہاں بدن، جسم، لمس، ملمس، کچھ بھی موجود نہیں ہے؛ گویا اس خاتون کی فکری اور بدنی سطحوں نے علاحدہ علاحدہ وجود سے ارتباط قائم کر کے وحدت کا اثبات کرایا ہے۔ اس طرف نے افسانے کی تکنیک اور موضوع کو جداگانہ پہچان سے ہمکنار کر دیا ہے۔

جس مرد کردار کو صرف لاسلکی رابطے میں سامنے لایا گیا ہے اس کا المیہ بھی بیانیے میں عمدگی سے جذب ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ بظاہر ایسا لگتا ہے وہ راج ہنس 'خشک چشمے کے کنارے' مسلسل قیام سے اکتا گیا ہے؛ یوں وہ اپنی جذباتی تسکین کے لیے مرکزی کردار خاتون کے احساساتی جوار میں آن بسا ہے؛ لیکن یہ مکمل حقیقت نہیں کہ دراصل اس خاتون کی دانش و بینش وجہ کشش بنی ہے، وگرنہ 'تسکین محض' شرائط کے تکلف میں نہیں پڑتی۔

اس افسانے کی اہم کہانی یہ ہے کہ عورت کا کردار مرد کردار سے اپنے جذبات محبت چھپاتا ہے؛ یوں اس پر واضح نہیں ہونے دیا جاتا کہ وہ اس کی محبت کو دل سے قبول کر چکی ہے؛ اس طرز عمل کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں؛ وہ چاہتی ہے کہ اسے کلیت میں سمجھا جائے؛ مرد کی عمومی پرابلم یہ ہے کہ وہ عورت کی اکائی کو اجزا میں تقسیم کر دیتا ہے اور پھر صرف اس جزو سے ربط رکھتا ہے جس سے اس کی غرض وابستہ ہوتی ہے۔

افسانے کی عورت کو احساس ہے کہ یہ مرد اس کو Totality میں لے سکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔۔۔ اسی لیے وہ اس کے چناؤ میں آیا ہے۔۔۔ اس طرح وہ دو ہفتوں کے وقفے میں بھی اس کی سوچ کو رفت گزشت نہیں ہونے دیتی؛ وہ اسے اپنانا چاہتی ہے مرد بھی اسے گنوانا نہیں چاہتا؛ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ دونوں کے راستے ایک دوسرے کی جانب سفر نہیں کرتے!!

اس افسانے کو پڑھتے ہوئے یہ اشعار بہت یاد آئے:

یار ڈھڈی عشق آتش لائی اے!!!
یار سانوں لگ گئی ہے بے اختیاری
سینے دے وچ نہ سمائی اے!!!
یار ڈھڈی عشق آتش لائی اے!!!

عورت کا کردار زیادہ عمیق ہے کہ اس نے بہت چوٹیں کھائی ہیں؛ وہ مضطرب روح کے لیے آسودگی ڈھونڈ رہی ہے؛ ایک امکان ہے کہ اسے یہ غائب مطلوب سے میسر آ جائے گی لیکن وہ بے قرار ہے کہ پہلے جو مرد ملا وہ دن اور رات کے فرق کے ساتھ روپ بدل لیتا تھا؛ پھر گھر کے بڑوں نے جو سلوک اس سے روا رکھا وہ ایک بڑے ویکیوم پر منتج ہوا؛ اب اس کی تشنگی سمندر چاہتی ہے؛ ذہنی قبولیت کے باوجود اسے یہ دھڑکا بھی لاحق ہے کہ معلوم نہیں یہ شخص اس کے معیار پر پورا اتر پائے گا یا۔۔۔؟؟؟ اسی لیے وہ اس سے اپنے دلی احساس کو پنہاں رکھے ہوئے ہے۔ افسانہ نگار نے اس قدر متمول زبان سے افسانے کے متن کو سنوارا ہے کہ ظاہری آرائش کا نام و نشان تک نہیں لیکن ہر جملہ مزین ہے، جیسے مشاطگی کا احسان قبول کیے بنا کسی حسینہ کا قدرتی جمال!!! افسانہ قاری کے دل کو چھو جانے والا ہے!!!

افسانے میں جب مواد غالب آ جائے اور اسلوب بھی توانا ہو تو ایک ہی خطرہ رہ جاتا ہے کہیں ''افسانہ'' ان میں گم ہو کر نہ رہ جائے! لیکن مجھے سیمیں کرن کا افسانہ: 'جلتی بے خبری سے کرن کا جنم' اس لیے اچھا لگا کہ افسانے کو کسی سطر میں گم نہیں ہونے دیا گیا اور اس رتن کی عدم کمشدگی کی بھاری قیمت افسانہ نگار کو ادا کرنا پڑی ہے کہ گیلی لکڑی نے سلگنے کی اذیت سہی ہے۔۔۔ برابر سہی ہے۔

قرات اسی نتیجے تک پہنچاتی ہے کہ یہ ریسرچ بیسڈ افسانہ ہے اور اب روایتی طرز کی کہانی سے گریز کی شکلیں تجربے میں آ رہی ہیں اور اسی صورت کے بین السطور افسانے کے عنصر کو غیر محسوس طور پر متحرک کیا جاتا ہے۔ اس لیے مذکورہ افسانے کو بالکل تازہ رجحان کے پس منظر میں وقیع سمجھتا ہوں۔۔۔ روایتی قاری ممکن ہے اس سے وہ حظ کشید نہ کر پائے۔۔۔ لیکن اس میں پسند آنے کا امکان موجود ہے اور مرکزی کردار جس حل کی طرف گیا ہے وہ عورت کے لیے اس اینڈرو کریسی میں آخری حل ہے۔

سیمیں کی نثر پہلے سے بھی زیادہ پختہ ہو گئی ہے اور یہ عاجز تو جملے کے جمال پر لہلوٹ ہونے والا قاری ہے! یہ افسانہ عمداً دو بار پڑھا ہے۔ قاری اسے نثر کے منطقے میں محدود کر سکتا ہے۔۔۔ بھلے ہی کرے۔۔۔ لیکن یہ نظم ہے۔۔۔ خیر۔۔۔ نثر جس نظم کی متقاضی رہتی ہے، وہ مطالبہ ان سطور نے بہ کمال پورا کر دیا ہے! اجمال ایک چیلنج ہوتا ہے کہ تفصیل کا اس میں سما جانا۔۔۔ کرن کا آفتاب بننے کے مماثل عمل ہے:

جو اپنے رقص میں گم ہیں انھیں پتا بھی نہیں

اس مصرعے کی تخلیقی تفہیم مذکورہ افسانے کے توسط سے ممکن ہوئی ہے۔۔۔ آگہی سے ناآگہی اور اس کا معکوس سفر۔۔۔ قاری سوچ سکتا ہے افسانہ نگار سے

استفسار کیا جائے کہ وہ شعور کے اس دشوار گزار جادے پر کیسے چلا ہے؟۔۔۔کہیں اس کا قدم نہیں رپٹا۔۔۔اس نے جذب میں بھی یہ بیداری جانے کہاں سے سیکھی ہے؟ بلاشبہ اس نے بہت حد تک صوفیانہ مزاج پایا ہے۔ادراک وعرفان کے ناقابل بیان سفر کو کامیاب بیانیے میں ڈھالنا کوئی ایسے متون سے سیکھے۔۔۔اپنے ہونے بلکہ اپنی معنویت کا فہم 'غیر' کا محتاج رہا اور یہ سریت اور بھی اعجوبہ ہے کہ وہ اسی کی ذات کی توسیع ہوتا ہے لیکن خدا ہونے کے لیے جدا ہونا سدا ناگزیر رہا ہے، پہلے اپنے وجود سے الگ کرو، پھر اسے اپنی اور لاکر خود میں ضم کرو۔۔۔اور یہ عمل بار بار کرو۔۔۔اس کائنات کو ناتمام رکھنے میں یہی راز کارفرما ہے۔

شاید بطور قاری اس تحریر سے لطف کشید کرنے کو شعار کرنا ہے۔۔۔اک زمانہ۔۔۔!!

بات بھلے ہی تاثراتی ہو جائے لیکن کہنا یہی ہے کہ افسانہ نگار راقم کی مد مقابل نہیں ہے اسی لیے اس سے حسد نہیں پالا جا سکتا وگرنہ کوائف اس میں سب پورے ہیں!!

سیمیں کرن کے ایک اور نمائندہ افسانے: ''مربعوں کی دائرہ کہانی'' کا الگ سے تذکرہ ضروری ہے۔۔۔ممتاز شیریں نے کرشن چندر پر بات کرتے ہوئے کہا تھا:۔۔۔''وہ کسی چیز کا اثر فوری لیکن وقتی طور پر قبول کرتے ہیں۔فوری اظہار بھی ان کے لیے آسان ہے چناں چہ کرشن چندر سے یہ شاذ ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی چیز کو تخلیق کرتے ہوئے اس کرب سے گزرے ہوں جسے Creative Agony کہتے ہیں۔۔۔!''۔۔۔!!'تخلیقی تجربے کی بازآفرینی' بڑے الفاظ ہیں؛سو،اس باب میں ادعا کی گنجائش نہیں؛لیکن گمان کہتا ہے کہ سیمیں کرن مذکورہ افسانے کا حصول خاصے گہرے تخلیقی کرب کے بعد اپنے لیے ممکن بنا پائی ہوں گی! ہوسکتا ہے اس کی تسوید کا عمل ایک نشست کے دورانیے کا رشحہ و ماحصل نہ ہو!لیکن اسے پڑھتے ہوئے ہڈسن کا کہا یاد آتا رہا:''شاعر کی طرح افسانہ نگار میں بھی ایک قوتِ اکتشافی (Revealing Power) ہوتی ہے۔''سو، یہ تخلیق کسی Trance کی Mystery کا سراغ دیتی ہے۔۔۔واقعہ یہ ہے: ''مربعوں کی دائرہ کہانی'' کی خواندگی کے بعد یہ احساس اپنے حصار میں لے رہا ہے کہ افسانہ نگار کے قلم سے جس خاص افسانے نے قرطاس پر منتقل ہونا ہوتا ہے۔۔۔وہ ان سے ہوگیا ہے۔۔۔اس افسانے کے حوالے سے کہنا یہ بھی ہے کہ قرات سے پہلے ہی 'بوجوہ' ذہن بن گیا تھا کہ اس کا عمومی ابلاغ نہیں ہوا۔۔۔سو،دھیان سے۔۔۔مرتکز ہو کر مطالعہ کرنا ہے۔۔۔لیکن شاید چوکنا ہونے کی ایسی احتیاج نہ تھی۔۔۔عین ممکن ہے کہ اس ہائی تھیم تک اب بھی رسائی نہ ہو پائی ہو۔۔۔لیکن گمان ہے کہ اپنی سطح تک یہ کہانی وصول ہوگئی ہے۔

سیمیں کرن کا یہ افسانہ پڑھ کر ایک تو اس کی یکسر مختلف تکنیک کی تحسین پر دل ترنت آمادہ ہے کہ روایتی پلاٹ کو منہدم کر کے ارتباط کو جادوئی لیول پر قائم کرنے کا چینکار دکھایا گیا ہے اور مزے کی بات! یہ سراغ نہیں ملتا کہ یہ فریم کرافٹسمین شپ کے ذریعے وجود میں لایا گیا ہے۔۔۔ایسا لگتا ہے افسانہ اپنے ساتھ اس کی ہیئت لے کر آیا ہے۔۔۔باقی رہا مواد کی مناسبت سے اسے تانیثیت کے ساتھ ہی بریکٹ کرنے کا ایشو، تو فی الوقت اس پر راقم کا خیال تائید پر تیار نہیں۔۔۔اس کا موضوع مرتفع ہے۔۔۔باوجود یہ کہ راوی کا بیان آغاز میں 'بھٹکاتا' بھی ہے اور وہ قوس انجام کی قوس سے متصل ہو کر جو دائرہ بناتی ہے وہ اسی طرف ذہن کو لے جاتی ہے لیکن اس کے باوصف اسے محدود نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ان چند افسانوں میں سے ایک ہے جو متعدد جہتوں کو محیط ہے۔یہاں پیراڈوکسی کا ہنر فنکاری سے آزمایا گیا ہے۔۔۔جیومیٹری کی متضاد شکلوں کو ایک وحدت کی پیشکار کر کے اس کی مضبوط اساس اٹھائی گئی ہے۔۔۔اور وہی آگے چل کر مابعدالطبیعیات کے مرغوب مضمون 'کثرت ووحدت' سے انسلاک قائم کرتی ہے۔ اگر یہ ڈسکورس فعال نہ ہوتا تو اس کی مرکزی سطر کا مفہوم بے مغز ہو کر رہ جاتا:''خدا کی دانش ومشیت سب سے زیادہ مخفی ہے۔۔۔!!''اب اگر افسانہ نگار تعین کے ریاضیاتی جادے کا مسافر ہوتا تو اس کا کارنامہ قابل ذکر نہ رہتا کہ حقیقت کو ایک خانے سے دوسرے خانے میں منتقل کر دینا واقعی کوئی کارنامہ نہیں۔حقیقت کا یہ رخ بھی اگرچہ حتمی نہیں لیکن سرفراز ضرور ہے کہ مظروف ظرف کے مطابق عارضی صورت اختیار کر لیتا ہے اور غالباً یہی وہ مقام ہے جب مبینہ اصول کے مطابق حقیقت واقعیت کے قالب کی جانب گامزن دکھائی دیتی ہے۔۔۔اب رہا ہیئڈر کا قضیہ تو اس کی حیثیت ہی کچھ نہیں رہ گئی۔۔۔حیاتیاتی سائنس کے کاشف اس تحدید کے مدار کو مسمار کر کے بہت آگے نکل گئے ہیں اور سماجی تناظر تو مقامیت کا بڑا ہی بھلا مانس ترجمان ٹھہرا۔افسانہ نگار اس آنکھ کو قاری کی آنکھ بنانے کی متمنی ہے جو پس تصویر صداقت تک پہنچ کے لیے بصیرت کا اہتمام کر سکے کہ چشم انسانی سر تصویر پر صدیوں سے رکی ہوئی ہے اسی لیے تو معبر کو عینِ حیرت جادوگر کہہ کر اپنی مرعوبیت کا بار بار اظہار کرتی ہے۔۔۔جب شیخ فریدالدین عطارؒ کو تاتاری قتل کرنے لگا تو وہ نہایت اطمینان سے بولے:'اچھا تو اب اس روپ میں آگئے ہو۔۔۔!؟!سو، ہر بہروپ میں روپ موجود ہوتا ہے اور افسانہ نگار کی اصل دلچسپی کا محور روپ نہیں بہروپ ہوتا ہے کہ کلا روپ میں نہیں بہروپ میں ہے!!آخر میں جو کردار 'اُدھر' کا فلائنگ وزٹ کر کے جس نوعیت کا بیان دیتا ہے۔۔۔واضح رہے اس کے جملہ علائق باردگر اِسی جہان کی نمائندگی کرتے ہیں۔۔۔ہاں!اس افسانے کی یہ خوبی اپنی جگہ مسلم ہے کہ میٹافزکس سے منسلک موضوع کے باوجود ہماری زمینی حقیقت کی کئی اکناف سے مربوط بھی ہے۔یوں اس کی ماورائیت 'کسی اور ہی عالم' کی قرار دے کر جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔وجودی کرب کے ارضی شاخسانے بھی اس میں خاصی توانائی کے ساتھ موثر ہیں۔

ایک اعلا کہانی آج وہی ہے جس میں ماجرا سیدھی لکیر میں سفر نہ کرے اور اگر 'سیدھی لکیر' کو وقت کے 'صراطِ مستقیم' کی لحاظی تاویل میں پناہ دے دی جائے تو ہمیں ماضی، حال اور مستقبل کے اجزا زیادہ سے زیادہ زماں کی رائج الوقت تقسیم سے بلند کر دیتے ہیں جب کہ زماں کی تفہیم کے لیے ایک اور تناظر بھی مہیا کیا گیا ہے:''کیا وقت صرف وہی ہے جو حال کے راستے سے، ماضی سے مستقبل میں لمحہ

لمحہ بہتا رہتا ہے؟ یقیناً، معروف معنوں میں یہی وقت ہے۔ اسی کو ماپا جاتا ہے۔۔۔اسی وقت کے ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک کے دورانیے میں کچھ ہونے کو واقعے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔۔۔ (لیکن) فکشن کے باب میں Event اور وقت کے اس خاص رشتے میں رخنے پڑ جاتے ہیں یا پڑ سکتے ہیں۔۔۔کہانی وقت کی دیوار سے ادھر جست لگا دیتی ہے جہاں طبعی زندگی کے سارے جواز ہکا بکا رہ جاتے ہیں اور ایک نیا معنیاتی اور حسیاتی نظام قائم ہو جاتا ہے۔۔۔جہاں جہاں واقعہ وقت کو پچھاڑ دیتا ہے وہاں وہاں یہ متعین سمتوں کو چیر پھاڑ کر ان کے اندر سے فکشن کے نئے ابعاد اور وسعتیں نکال لیتا ہے۔'' (محمد حمید شاہد/ اردو افسانہ: صورت و معنیٰ) ایک پہلو تو: 'مربعوں کی دائرہ کہانی' سے ضرور ابھرتا ہے کہ افسانہ نگار نے وقت کے مروج پیمانے کو توڑا ہے۔۔۔ایک بار نہیں بار بار۔۔۔اور صرف بالائی سطح پر نہیں بلکہ زیریں سطحوں پر بھی؛ پھر ساکت تصویر جو وقت کے سیال تصور کی عارضی طور پر نفی کرتی ہے اور ایک منجمد آن کو حسی پیکر کی صورت سامنے بھی لا کر دکھا دیتی ہے۔۔۔لیکن افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر تصویر کے سکوت کو تحرک میں تبدیل کر دیتی ہیں۔۔۔اب یہ تحرک خیال کے منطقے سے جڑت رکھتا ہے، کسی مستند تقویم سے نہیں۔اس پس منظر میں کسی تعبیر کو جامد (Static) نہیں کہا جا سکتا۔۔۔ایک عجیب قوائیت (Dynamism) کا ظہور ہے جو روح کو فشار سے ہمکنار کر دیتا ہے۔سیمیں کرن کے اس افسانے کو شروع میں غیر معمولی اس لیے کہا تھا کہ یہاں زماں اپنے حسبِ حال مکاں کا اہتمام کرتا ہے، شاید اسے اپنی بقا کے چیلنج کا سامنا ہے۔۔۔اگر اس مکاں میں زماں کی ابعاد کا ایک منظران تین اکناف (Three Dimensions) پر مشتمل فرض کر لیا جائے جس کی تصریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''تینوں بعد کے معنی ہیں لمبائی، چوڑائی اور گہرائی یعنی وہ بات جو بڑے سے بڑے کینوس پر تصویر میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی، ایک ایسی تراشیدہ شبیہ کے ذریعے ظاہر ہو سکتی ہے جسے کئی زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔''

تو ایک بار پھر تائید ہوتی نظر آتی ہے کہ تصویر سے تعبیر تک کا سفر فی الاصل یہی 'مربعوں کی دائرہ کہانی' ہے کیونکہ جو مصور ہوا ہے، وہ تصویر سے پہلے بھی اپنا ایک وجود رکھتا تھا۔۔۔تخیلی وجود۔۔۔(''اور خیال اپنے پیرایۂ اظہار سے بہر کیف بہتر ہے کہ روح جسم سے بہر طور بلند و بالا ہے۔'' / افتخار جالب) پھر اسے ایک محسوس پڑاؤ کا وقفہ میسر آیا۔جب اسے تفسیر (Interpretation) بننا نصیب ہوا تو وہ ایک نئی صورت تھی۔تصویر ہونے والی سے جدا۔یہ سارے چوکور ٹکڑے کیا ہیں؟ یہی مربعے ہیں؛ ہمیں ان میں سے جو مل جاتا ہے، اسے حتمی یقین کرنے کا التباس مادیت کی محدودیت میں دھکیل دیتا ہے۔یوں 'عالم دوبارہ نیست' کا سرور مدہوش کر دیتا ہے! افسانہ نگار نے بس اسی نشے کو ترشی سے اتارا ہے اور بند دائرے (Closed Circle) کی بجائے حرکت پذیر (Spiral Circle) کا وسیع مدار (Orbit) کھینچ کر تسلسل کی معنویت شعور میں منتقل کی ہے، چونکہ وہ رمزنگاری (Encryption) سے دستبردار نہیں ہوئیں اس لیے انھوں نے ایک گمشدہ شیڈ کو اپنی تخلیقی توانائی سے دریافت کرنے کے بعد بیانیے میں ایسے شامل کیا ہے کہ عمیق فلاسفی کو 'سچ مچ کا افسانہ' بنا دیا ہے۔ایسا افسانہ جو سمجھی سمجھائی 'سچائی' سے اونچے رتبے کی تخلیق ہے۔

باقی رہا ان دونوں مجموعوں اور دیگر کہانیوں میں نثر کا آہنگ تو پڑھتے ہوئے یہ خیال مسلسل غالب رہا کہ شعریت کے فلیور سے قاری کو زیادہ لبھانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔اس کے برعکس شعوری سعی کے ساتھ لفظیات کی مدد سے فکشن کی اس ڈائمینشن کو سامنے لایا گیا ہے جو سماجی معاملات کو اپنے عمق کے ساتھ ابھار سکے۔جذباتیت کی آمیزش سے منزہ ایک متین متن اسی طرح سطحِ ورق پر نقش ہوتا ہے۔ہاں! جہاں میٹاریشنل ڈیٹا کی ترجمانی کا تقاضا تھا وہاں علمیت، اور تفلسف کی کارگزاری سے جملے کو بچایا گیا ہے، میمنہ میسرہ کے گھاؤ نہیں لگنے دیے گئے۔دراصل مقام نازک تھا کہ: ''زبان ایسی معروضیت ہے جو غیر کو موقع دیتی ہے کہ وہ میری داخلی حقیقت کو اپنے استعمال میں لائے۔'' سو، اعتراف سرسری نہیں۔۔۔باقی اگر اسلوب کو فی الوقت طرزِ اظہار میں محدود کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ سیمیں کرن کی نثر میں وہ ندرت ہے جو قاری کی آنکھوں کو بے دھیان نہیں ہونے دیتی!!۔۔۔!! ایسے منفرد افسانے تخلیق کرنے کے لیے جس آگہی کا ہونا ضروری ہے، اس سرّ تک افسانہ نگار کسی سچے لمحے میں پہنچ چکی ہیں کہ تخلیقی ساعت میں 'عقیدے' سے عارضی جدائی کا دُکھ طوعاً و کرہاً سہہ لیا جائے؛ تاکہ ہر افسانے میں 'جہانِ نو' کی بنا رکھی جا سکے؛ جو ایک طرف متناقضہ کا اثبات کرے تو دوسری جانب 'کی ہول' میں سے ہی سہی قاری کو یہ دکھا سکے کہ تخلیق کار اپنی ذات کو ان گنت پاروں میں منقسم کر کے بھی Indivisible رہتا ہے اور یاد رہے! نثر میں بجز فکشن کے یہ 'معجزہ' کسی اور صنف کو نصیب نہیں ہوا، یوں فکشن رائیٹر مذکورہ سہولت سے مستفید ہونے کا Edge تو رکھتا ہے لیکن اپنے وجود کے اجزا کو Bengal Light کی مثال فضا میں اچھال کر سالم اکائی کی صورت دفعتہً Catch کر لینے کی شعبدہ گری ہما شما سے ہو نہیں پاتی۔سیمیں کرن کے لیے دل صرف اس کا رن تالی بجانے پر مجبور ہوا ہے کہ انھوں نے فنِ فکشن کی سیماؤں کے اندر رہتے ہوئے اس کلاکاری کا حیران کن مظاہرہ 'دھوپ عہد' میں کیا ہے!!

حواشی

۱۔ عقیدے ٹوٹتے جاتے ہیں یوسف
مگر اِنساں مکمل ہو رہا ہے

۲۔ مطبوعہ: 'اجرا': ۱۶

۳۔ اختر رضا سلیمی کے ناول: ''جندر'' میں بھی ایک ایسی ہی سچوایشن ملتی ہے۔مرکزی کردار گاؤں میں ایک جندر وئی ہے؛ جسے جندر کی گونج میں ہی نیند آتی ہے مگر اس کی تعلیم یافتہ نوبیاہتا عروس اس آلودگی میں اپنے لیے آسودگی کا کوئی پہلو نہیں دیکھتی، یوں اسے آبائی پیشہ ترک کرنے پر مجبور کر دیتی ہے؛ واحد متکلم بادل نخواستہ اس فیصلے کو قبول تو کر لیتا ہے مگر نبھا نہیں سکتا۔۔۔یوں زوجین کے مابین سرد مہری حائل ہو کر رہ جاتی ہے۔۔۔ایک رات فطری جنسی داعیہ

باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

اردو ادب میں بارہا لفظ" محنت میں عظمت" کا استعمال جا اور بے جا طور پر ہوتا رہا ہے مگر آج محسوس ہو رہا ہے کہ شاید یہ لفظ صرف اور صرف پروفیسر جمیل احمد عدیل کے لیے ہی تخلیق کیا گیا ہے!

ہوسکتا ہے ہمارے بیان میں آپ کو تعلّی کا عنصر نظر آئے مگر برادرِ عزیز و محترم جمیل احمد عدیل صاحب کی جستجو، محنت اور لگن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پھر اس لفظ کا اس قدر موزوں استعمال شاید آج سے قبل نہ ہوا ہو!!

ذیل کے صفحات میں جناب جمیل احمد عدیل صاحب کی شخصیت و فن کو مربوط کرنے کی کوشش آپ کی توجہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ دیکھئے، پڑھیے، غور کیجیے اور اندازہ لگایئے کہ وطنِ عزیز کے ایک دُور دراز اور غیر معروف قصبے سے تعلق کے باوجود اس نوجوان نے اپنی راہ کے تمام کوہِ گراں اس سلیقے اور قرینے سے سَر کیے ہیں کہ بے ساختہ اقبال یاد آجاتے ہیں:

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
جو ڈالتے ہیں ستاروں پہ کمند

.....گلزار جاوید

☆ گفتگو کا آغاز ہمارے لیے ہمیشہ سے دشوار لمحہ رہا ہے۔ یادوں کی بغیہ میں یقیناً کوئی ایک پھول، پودا ایسا ضرور لہلہاتا ہے؛ جس پر ہر رنگ، موسم اور مزاج کے سدابہار پھول آپ کی توجہ کے منتظر ہوا کرتے ہیں؛ کیا کوئی جھلک قاری دیکھ پائے گا؟

☆☆ اس قدر رومانوی سوال کا 'علمی جواب' دینا اگرچہ ایک 'غیر شاعرانہ حرکت' ہوگی لیکن برگساں کی کتاب Matter and Memory سے ماخوذ یہ نکتہ پیش کرنے سے خود کو روک نہیں پا رہا ہوں کہ حافظہ مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ انسانی ذات کے عمل کی نمائش ہے۔ اب اس بحث میں نہیں الجھتے کہ 'مادہ' کی تعریف کیا ہے؟ اور 'ذات' جسم سے کس درجہ بلند مظہر ہے؟ لیکن سادہ تر لفظوں میں بس یہ کہنا ہے کہ یادیں جس لطیف ترین فیتے پر نقش ہوتی ہیں وہ رِیل اس بدن کی کثافت سے کافی فاصلے پر فعال رہتی ہے۔ فی الاصل یہی ایک تخلیقی شخص کا انمول اثاثہ ہے جس سے نامیاتی ناتا اس کی تخلیقات کے حق میں زندگی کا ضامن بنتا ہے۔ یہ صورت حال کسی 'میکانکیت' کے تابع نہیں۔ سو، اقرار کیا جاتا ہے اسی 'بغیہ' کے پھول کی پنکھڑیاں نچھاور ہو کر تخلیقی خزینے کو متمول کرتی رہتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اپنی بنیادی اکائی کی نفی کیے بغیر نئی اکائیوں کا اس میں جذب ہونا بھی جاری ہے، جسے آپ نے زیادہ موثر الفاظ دیے ہیں 'اس پر ہر رنگ، موسم اور مزاج کے سدابہار پھول برابر کھلتے رہتے ہیں۔'

یہاں تعین سے عمداً گریز اختیار کرتے ہوئے Obscurantism سے کمک پانا چاہوں گا کہ ابہام پسندی نامانوس اسلوب ہی تک محدود نہیں ہے۔ اپنے مخزن کو قدرے مُبہم کر دینا بھی بہرحال ایک واردہ ہے۔ سو، میں کیوں کہوں کہ پہلی کتاب، پہلے خواب یا پہلی محبت کی شمع فروزاں ہے؟ اپنی توانائی کے Source کی ایگزیکٹ نشان دہی کیوں کروں؟ سریت کی اپنی معنویت ہے کہ یہ ضروری نہیں جو منزل بالکل سامنے نظر آ رہی ہو، اس تک پہنچنے کے لیے راستا بھی سامنے ہی بچھا ہوا ہو۔ شاید یہ مبہم سا منظر نامہ 'جھلک' کے پیراڈائم پر پورا اتر پائے گا!!

☆ قرطاس و قلم سے باقاعدہ رشتہ کب اور کیوں کر استوار ہوا؟ خاص طور پر 'بی کہانی' اور اس کا کردار کب آپ کے روزمرہ میں شریک ہوئے؟

☆☆ اس ضمن میں ماہ و سال کو پیمانہ بنایا جائے تو قرطاس و قلم سے رشتے کی استواری کم و بیش چار دہائیاں پیچھے جانا چاہے گی۔۔۔ لیکن سچی بات ہے مسافت کی یہ پیمائش ایسی جاذب نہیں ہے کیونکہ اصل کشش جس منطقے میں اسیر ہے اس کی Fascination سے آج تلک آزاد نہیں ہوسکا! وہ سحر کیا ہے؟ اسے ایک لفظ میں Reduce نہیں کرسکتا۔ گلزار صاحب! معلوم نہیں یہ اوبسیشن ہے یا کسی نوع کا ڈیلیوژن مگر میں اپنے بچپن ہی سے معروض کو پراسرار دیکھتا آیا ہوں۔ آپ اسے Dichotomy کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف تو ریشنلزم کی جانب واضح جھکاؤ رکھتا ہوں تو دوسری طرف Mystery کی نفی کی جرأت سے تہی ہوں۔۔۔ کیا کروں متعدد احوال ایسے ہیں کہ 'حقیقت' اپنی واحد تعبیر کے ساتھ میرے شعور میں شامل نہیں ہو پاتی۔ اس متبائن صورت حال کے برابر زیرِ اثر رہنے سے دو نتائج سامنے آئے: ایک یہ کہ تجربہ تو ملا مگر عملی زندگی میں ان گنت ٹھوکریں میرا 'مقدر' بنیں۔ یوں بے شمار مرتبہ منہ کے بل گرا کہ جو سب کو دکھائی دیتا ہے، مجھ سے اوجھل رہتا ہے۔ یہ تو ہوا اس کا ضرر رساں پہلو! منفعت یہ میرے حصے میں آئی کہ اپنے لیے فکشن کی دنیا کو گہری زرخیزی سے مالا مال پایا۔ عہد طفولیت میں پڑھی جانے والی کہانیاں ہوں یا نوجوانی میں ڈائجسٹوں کے اندر منہمک رہنا ہو یا پختہ سنی میں عالمی سطح کے بہترین ناول/افسانے کی خواندگی ہو۔۔۔ قرات کے دوران جیسے زمین و آسمان یکبارگی منہا ہوتے رہے ہیں۔ اسی لیے واقعی پناہ گاہ فکشن ہی قرار پائی کہ سچ کا غیر دستوری متن یہیں رقم ہوسکتا تھا۔ سو، لکھنے کے لیے افسانہ ہی موزوں ترین صنف ثابت ہوا کہ یہ ساحلوں سے بے نیاز سمندر ہے۔ جس میں تھیالوجی سے لے کر اینتھرو پولوجی تک سب دریا، سارے ندی نالے اتر

سکتے ہیں۔'سچ' کو اپنے چولے بدلنے کی عادت ہے۔ہمیں بجا طور پر تناقض خوف زدہ کرتا ہے کہ سماج میں ساکھ/اعتبار قائم نہیں رہتے مگر یہ ناول/افسانہ ہے جو متعارضات کو اپنے وجود میں جذب کر کے اپنی گوتمی مسکان پر حرف نہیں آنے دیتا۔اس طرح میرے شوق کی مخالف سمتوں نے اس مامن کو پسند کر لیا!!

☆ ممتاز مفتی صاحب کے بقول آپ آندھی کی طرح آئے اور طوفان کی طرح چھا گئے! کچھ لوگ مفتی صاحب کی رائے کو ادھورا جان کر اپنے انداز میں پورا کرنے کی کوشش بھی کیا کرتے ہیں۔کیا ایسا ہی ہے؟

☆☆ سب سے پہلے تو داد کہ مذکورہ استفہام کو تشکیل دیتے ہوئے بڑی ہنرمندی کے ساتھ 'گفتہ آید در حدیثِ دیگراں' کی نظیر مہیا کی گئی ہے۔اس کے بعد اس Twist پر تحسین جسے اناڑی طنز بنا سکتا تھا مگر آپ نے رمز و ایہام کو خوبی سے گوندھ دیا ہے۔

مفتی جی کو جاننے والے جانتے ہیں کہ 'تاثیر' کی جادوگری ان کی شخصیت اور تحریر کا نقطہ ماسکہ تھی۔ان کے ہاں تاثر میں تاثیر اسی لیے تھی کہ وہ معروضیت پر داخلی صداقت کو ترجیح دیتے تھے۔یوں اتفاق و اختلاف اضافی ہو کر ان کے کہے کو وقعت کے مدار سے دور نہیں جانے دیتے تھے۔

مفتی جی سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی۔۔۔جو خاصی طویل تھی۔۔۔ہاں! ایک عرصہ خط کتابت ضرور چلتی رہی۔ان خطوط میں ہم دونوں کا Stance ایک سوا سی کے زاویے پر مصر رہا۔تاہم ان کی عظمت کا آج کی طرح تب بھی معترف تھا اور انھوں نے بھی شاباش دینے میں کبھی جزرسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔اس طرح ایک مضبوط Bond نے کوئی بے لطفی پیدا نہیں ہونے دی۔آپ کے سوال میں Quote ہونے والا جملہ بھی مذکورہ تاثر کے ہالے ہی میں اپنے معانی دے گا۔سو، دوبارہ عرض ہے کہ اس تاثر کو 'ادھورا کہنا اور پورا کرنا'؛ دل کے بہلانے کو 'غالب' یہ خیال اچھا ہے! کہ اس سے طرفین کو کوئی فرق نہیں پڑتا!!

☆ لفظ 'چھلاوا' ایک طرح سے منفی انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔برادرم اشفاق ورک صاحب نے آپ کی نسبت سے یہ اصطلاح کن معنوں میں بیان کی ہے؟

☆☆ (ہاہاہا) گلزار بھائی! اشفاق احمد ورک میرا سب سے بڑا 'روگ' ہے، and vice versa یونیورسٹی میں ہم ایک ساتھ پڑھے، ہوسٹل میں روم میٹ رہے اور گزشتہ چھتیس برس سے دوستی/محبت کا رشتہ قائم ہے۔فقرے کسنا اس عطر فتنہ کا پیشہ ہے۔اس ذہین و فطین اور طرار و طبیعت دار کے تیکھے، کٹیلے اور نوکیلے جملوں اور حملوں سے بچنے کے لیے ہر ہمدم دیرینہ اس سے ملنے کی بجائے مسیحا و خضر سے ملاقات کو بہتر سمجھتا ہے۔ہم نے یار بنتے ہی طے کر لیا تھا کہ وقت پڑنے پر ایک دوسرے پہ جان بھی نچھاور کر دیں گے مگر کبھی 'جرم عزت' کے مرتکب نہیں ہوں گے نیز اول تو دوسرے کے 'تحریری کارنامے' پر تعریف نہیں کریں گے، اگر بہ امر مجبوری یہ مرحلہ آ ہی گیا تو تعریف کے دودھ میں توفیق سے بڑھ کر مینگنیاں ضرور ملائیں گے۔اس تناظر میں 'چھلاوا' سب سے بے ضرر اظہاریہ ہے جسے ہماری اب تک کی قلمی و لسانی تو تکار میں سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔وولنر ہوسٹل میں جب ہمارے مابین مناظرہ شروع ہوتا تو کسی فریق کا مقصد ہرگز اپنے نقطۂ نظر کو منوانا نہیں ہوتا تھا بلکہ کامل نیک نیتی کے ساتھ حریف کو عبرتناک شکست سے دوچار کرنے کا 'عظیم جذبہ' کارفرما ہوا کرتا تھا۔اس لیے ہر نئے مباحثے میں بلا جھجک پہلے سے یکسر برعکس موقف اپنا لیا جاتا۔اسی 'پینترے بازی' کو اس نے 'چھلاوا پن' کہا ہے۔

☆ وہ کون سی سوچیں ہیں جن کی گونج آج بھی مفتی صاحب کے حوالے سے آپ کے طواف میں ہے؟

☆☆ ممتاز مفتی کی شخصیت اور ان کے افسانی ادب کا نقش مٹ نہیں سکا کہ ان کے فکری سروکار سرفراز سطح کے تھے۔یہ درست ہے کہ ان کے متصوفانہ خیالات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔صوفیانہ ادب تخلیق کرنے والے ان کے بعض معاصرین سے بھی ذہنی قربت کی مستقل صورت نہ بن سکی۔اس طرح مفتی جی کی غیر افسانی نثر میں متذکرہ موضوع سے تو گریز موجود ہے لیکن ان کے سماجی موضوعات پر تحریر کیے گئے مضامین (خصوصاً: 'رام دین' میں) آج بھی روشنی دیتے ہیں۔ان کے سفرنامے: 'ہندیاترا' اور ہیومیوپیتھی کی مناسبت سے لکھی گئی کتاب کو کبھی نہیں بھلا سکوں گا! 'عورت' کو اگر جزوی طور پر سمجھنے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے تو اردو میں ممتاز مفتی کو پڑھے بغیر شاید بہت مشکل ہوگا۔دنیا کے اس سب سے گنجلک معمے کو انھوں نے سلجھانے کی بہرحال ایک کوشش کی ہے۔اسی طرح ان کے افسانوں کا معتدبہ حصہ انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ و تجزیہ پیش کرتا ہے جو اس سبجیکٹ کے 'کتابی علم' سے قدرے اوپر کے درجے کی چیز ہے۔لاشعور میں منجمد فرد کی شخصیت کے بھید کھولنے میں انھوں نے جو جتن کیے ہیں، انھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔یہ عمیق نکتہ بھی مفتی جی کو پڑھ کر مدرکہ کا جزو بنا کہ مرد ہو یا عورت آخری سانس تک Unpredictable رہتے ہیں۔کوئی کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔بعد میں جب 'قلب ماہیت' کی ششدر کر دینے والی صورتیں مشاہدے میں آئیں تو مفتی جی بے طرح یاد آئے!!

☆ اس خیال میں رنگ بھر دیجیے کہ 'جمیل احمد عدیل کی افسانہ نگاری محض منزل نہیں ان کے تخلیقی وجود کے دستخط ہیں!'

☆☆ محمد حمید شاہد ہمارے نہایت مکرم حبیب اور سینئر ادیب ہیں۔ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کوئی شخصی اعتبار سے بھی مجسم اخلاص ہو اور اپنی لکھتوں میں بھی بیکن ٹاور نظر آئے۔محمد حمید شاہد صاحب اس مناسبت سے مثال قرار دیے جا سکتے ہیں۔انھیں نصیب ہونے والا Ora قابلِ رشک ہے! آپ کے اس سوال میں وہی متکلم ہیں۔یہ ان کی جانب سے ملنے والی تھپکی ہے جو عزم سے ثروت مند کر دینے والی ہے۔کیا عجب جیسا وہ چاہتے ہیں، ویسا لکھنے میں کبھی کامیاب ہو جاؤں!

☆ جملوں کو دلآویز بنانے کا فن آپ کے ہاں کب اور کس بنا پر دخیل ہوا اور اس سے کس قسم کے نتائج برآمد ہوئے؟

☆☆ گلزار جاوید صاحب! آپ کے سوال کا پہلا حصہ ہی سرشار کر دینے والا ہے۔۔۔اگرچہ راقم کی نگاہ میں یہ منزلِ جہد کی مزید متقاضی ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ تجمیل کے عمل میں ساری زندگی بے پناہ کشش محسوس ہوتی رہی۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ ہے کہ پڑھتے ہوئے 'اپنے آپ' کچھ 'آئیڈیلز' دل و دماغ میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ اسکول کے زمانے میں مجمع لگانے والوں اور سیاسی و مذہبی مقررین کو سننے کی مریضانہ حد تک للک تھی۔۔۔شاید خلقی کن رس ہونے کی وجہ سے۔۔۔خیر! گردوپیش سے بے نیاز ہو کر یہ تقریریں بڑے شوق سے سنتا رہتا۔ مجھے لگتا روانی سے بولنا ایک معجزہ ہے۔ چند سال کے بعد رفتہ رفتہ یہ احساس ہونے لگا کہ ان 'خطبوں' میں سے کلیشے/تکرار کو اگر تفریق کر دیا جائے تو باقی بہت کم بچتا ہے۔ اس طرح طبیعت اوب سی گئی۔۔۔ہو سکتا ہے اس کی وجہ Content کی تحدید ہو۔۔۔بہرحیث جی چاہتا کہ کچھ ایسا ہو جو پہلے جیسا نہ ہو، مختلف ہو۔ کالج تک پہنچا تو سوچ کی نہج یہ نتیجہ ترتیب دینے لگی کہ خطابت کے خطے محدود ہیں۔ جس جادو کی تلاش ہے وہ تحریری مواد سے ملے گا۔ واقعی یہاں مواج قلزم موجود ملے۔۔۔واضح رہے مجموعی طور پر میری پہلی ترجیح پڑھنا رہی، لکھنے کا عمل ثانوی درجے سے اوپر نہیں جا سکا۔۔۔اس پس منظر میں خود لکھتے ہوئے 'تفرید' کا موثر ہونا لازم تھا۔ موضوعاتی سطح پر اور اسلوبیاتی سطح پر بھی۔ ہاں! کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ اس ضمن میں برآمد ہونے والے نتائج ایسے حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوئے۔ شوقِ انفراد نے قارئین کے حلقے کو مآل کار سمٹایا ہے۔ اس کے باوصف 'پاپولر لٹریچر' کی جانب کبھی ترغیب محسوس نہیں ہوئی۔

☆ آپ کی سوچ، فکر، فلسفہ کو ثقیل گردانے والے کسی طرح کی غلط فہمی کا شکار تو نہیں؟

☆☆ اس پر غور ہونا چاہیے کہ ایک ادیب کے پاس کہنے کے لیے کیا ہے؟ کیا روایتی فلموں/ڈراموں کی طرح وہی کچھ ہے جس پر 'سب' متفق ہیں یا فرد کی واردات سے لے کر کائناتی اعماق کی بابت اس کا استنتاج مختلف ہے؟ جہاں افکار میں صلابت ہوگی وہاں کچھ نیا سامنے لانا ایک رنگ کی بغاوت کا اظہار ہے۔ یوں 'زعمائے علم' استرداد کے لیے وقت کی اضاعت کے مرتکب نہیں ہوتے کہ مقبولیت کے قبلے میں اپنا نشہ ہے۔ رہے عامی تو اجنبی جھیلوں میں وہ کیوں غواصی کرنے لگے! نتیجہ معلوم ان کی نظر میں اجنبیت اور ثقالت ایک دوسرے کے لیے مترادف قرار پا جاتے ہیں۔ ارون دھتی رائے نے ایک جگہ لکھا ہے، کسی فکشن رائیٹر کے لیے ہرگز روا نہیں کہ جو لکھا جا چکا ہے، وہ اسی موضوع پر خامہ فرسائی کرے (مفہوم)! آپ پریم چند کی 'ریپلیکا' سدرشن کی تحریروں کو دیکھ لیجیے! کیا جواز ہے ان کا؟! انسپیریشن کی نفی مقصود نہیں مگر بندہ کچھ تو 'بدعتی' ہو! ہاں! بالکل نیا کو 'ادعا' کہنا ایسا غلط نہیں ہوگا کہ 'مطلق جدید' کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک Continuity ہے بلاشبہ! مگر ڈیٹو کاپی بھی تو نہ ہو۔ جیسے ارادتمند اپنے مرشد کے حلیے کو اپنانے کی شعوری کوشش کیا کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی مثال آپ کے سامنے ہے، گھوم پھر کر ایک جیسا ہی سامنے آئے چلا جاتا ہے۔ کیا یہ لٹمس ٹیسٹ نہیں ہے کہ تخلیقی جوہر جامد ہونے کا عندیہ دے رہا ہے۔ اس پس منظر میں یہ پہلو فراموش نہیں ہونا چاہیے کہ نئے کے ساتھ ردعمل بھی وجود میں آتا ہے۔ پوسٹ ۱۹۷۷ء ہماری سوسائٹی جس منہاج پر گامزن کی گئی، اس میں ردعمل کی شکلیں شدید ہولناک ہیں! اس طرح ہمارے لاشعور میں دہشت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور وہ Groundless Fear نہیں ہے۔ بہرحال مجھے یہ ماننے میں کوئی تردد نہیں ہے کہ دہشت زدہ میں بھی ہوں مگر شعوری سطح پر پامال جادوں سے ہٹ کر چلنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ جس پر سب سے نحیف ردعمل یہ آیا ہے کہ لکھنوں کو ثقیل کہہ کر بعض کرم فرماؤں نے رنج کو نکاس کا راستا دکھایا ہے۔

☆ کچھ احباب مشتاق احمد یوسفی صاحب اور مختار مسعود صاحب کی پیروی میں آپ پر تحریر کے بناؤ سنگھار کا جو الزام عاید کرتے ہیں۔ اس کے دفاع میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

☆☆ اس صورت حال میں Defensive ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ واقعتاً مجھے لفظ کا شکوہ اور عورت کا حسن دم بخود کر دیتا ہے! اب تلک ذہن اس اصول سے متفق ہے: ''تخلیقی عمل میں لفظ کا برتاؤ Presentational ہوتا ہے۔ یہ انفرادی جوہر فنکار کی ذات کے حوالے سے تبدیل شدہ صورت حال، اچھوتا منظرنامہ ہے۔'' (ڈاکٹر مرزا حامد بیگ) خطابت اور صحافت میں ڈکشن اور ہوتی ہے۔ ادب کی زبان کو ان سے مختلف ہونا چاہیے نیز ہر صنفِ نثر کا فلیور جدا ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے! باقی جملے کی ساخت میں حسن کاری کا اہتمام ایسا محل اعتراض امر بھی نہیں ہے کہ اس باب میں حساسیت کسی نوع کے داخلی رجحان کی ترجمان بھی ہو سکتی ہے۔ جیمس جوائس کے متعلق بورخیس کا کہنا ہے: ''جوائس کے بیشتر کام کا حصہ تاریکی میں عمل پذیر ہوا۔ ایسی یادداشت میں جملوں کا چمکنا، کبھی کبھی دن کسی ایک جملے کی بنت اور درستی میں صرف کر دینا، پھر اسے لکھنا اور دوبارہ صحیح کرنا۔۔۔!'' میک اپ ہر عورت کرتی ہے، بہترین میک اپ وہ ہے، جو ہونے کے باوجود نظر نہ آئے! جملے کا جمال اس آرایش میں ہے، جس میں آرائشگی تیرتی ہوئی دکھائی نہ دے! سو، اگر 'بناؤ سنگھار' عبارت میں جذب نہیں ہو سکا تو مجھے مزید محنت کرنی ہوگی!

☆ آپ جیسے باوضع اور نفیس انسان پر 'عدم توازن' کا الزام کس بنا پر عاید کیا گیا ہے اور آپ نے اس سے کس طرح گلوخلاصی حاصل کی؟

☆☆ دیکھیے ہر الزام غلط نہیں ہوتا۔ یہ ہے اور ایسا ہی ہے کہ گھریلو ذمہ داریوں کے باب میں مترف یعنی کام چور واقع ہوا ہوں۔ ہے تو یہ خود کو ایکسپوز کرنے والی بات مگر حقیقت یہ ہے کہ ڈور بیل بجنے پر باہر جا کر دیکھنے کی بجائے اگر پھانسی گھاٹ کا آپشن ہو تو میں: 'جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے!' گنگناتا ہوا سوئے دار جانے کو ترجیح دوں گا۔ یوں اپنی اہلیہ اور بچوں کو جملہ فرائض تفویض کر کے گھر کو 'فل اٹانومسٹ ادارہ' بنانے کی عیاری مجھ ہی سے سرزد ہوئی ہے۔ وہ خوش ہیں مختار ہو کر کہ گھر کی بابت جو مرضی فیصلے کریں اور میں

مسرور ہوں کہ مجھے وقت پر کھانا پینا مل جاتا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا! لہٰذا 'گلوخلاصی' کے متعلق سوچنے کی کیا ضرورت ہے!!

☆ آپ کے افسانوں میں اساطیری اور دیومالائی اندازِ فکر کیوں کر در آیا اور ناقدانِ ادب اس بابت گومگو کا شکار کیوں ہیں؟

☆☆ آپ کے سوال پر یاد آیا، ۱۹۹۱ء میں میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ: ''موم کی مریم'' اشاعت پذیر ہوا تو میرزا ادیب نے لکھا: ''عدیل نے عام روایات سے بالکل الگ ہو کر اپنی راہ تراشی ہے۔ اس کے افسانوں کے لیے: اساطیر الاولیں، مابعد الطبیعیاتی عناصر، مذہبی حکایات اور ضمیاتی قصوں نے بنیادی مواد مہیا کیا ہے۔'' اس میں کلام نہیں کہ ابتدائی تین مجموعوں میں ان اکناف کا غلبہ ہے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ ہو کہ شروع میں میرے مطالعے کا محور مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ بنا۔ ایسا کیوں ہوا؟ فی الوقت اس کی تفصیل سے صرفِ نظر کرنا چاہوں گا۔ البتہ مذاہب و مسالک کے مابین اختلافی مباحث کی لذت سے جان چھڑا کر 'الٰہیات' کی طرف رخ کر لیا۔ یہاں وہ 'ماورائیت' مل گئی جو فکشن کے ذائقے کو فزوں تر کر دینے والی ہے۔ اس طرح داستانی ادب سے دلچسپی بڑھنا فطری ثابت ہو کر رہا۔ اس ترجیح کے اثرات افسانوں نے قبول کیے لیکن چند سال کے بعد احساس ہوا کہ اسی رنگ کو اپنائے رکھا تو یکسانیت کے عیب سے دامن کو بچایا نہیں جا سکے گا۔ سو، موضوع و اظہار کے نئے مطلقے دریافت کرنے کی اور جستجو متحرک ہو گئی۔ ممکن ہے اسی 'کشش و گریز' کا کھیل ناقدین کے لیے 'گومگو' کا باعث بنا ہو!!

☆ احباب اکثر ایک ہالے کا ذکر بڑے اشتیاق سے کیا کرتے ہیں جو آپ نے اپنی شخصیت کے گرد کھینچا ہوا ہے۔ یہ سراسر رنگ آمیزی ہے یا حقیقت کا عنصر بھی موجود ہے؟

☆☆ (ہاہاہا) بہت ہی مختصر جواب عرض ہے کہ فاصلے سے بڑھ کر کشش کسی اور چیز کے نصیب میں درج نہیں ہوئی۔ مشتاق احمد یوسفی نے کہیں لکھا ہے کہ آئل پینٹنگ اور ادھیڑ عمر عورت کو دور ہی سے دیکھنا چاہیے! ایک 'مکھوٹا' غالباً ہر فرد کی احتیاج ہے چنانچہ ضرورت کے تحت اپنی مرضی کے 'پرسونا' سے یہ عاجز بھی مستفید ہوا ہوگا۔ یہ بھی امکان ہے کہ اسے موثر کرنے کے لیے دوری نے اپنا حصہ ڈالا ہو۔ پر امر واقعہ یہی ہے کہ آپ کو میرے آس پاس بسنے والوں سے اس رنگین ہالے کی کبھی شہادت نہیں ملے گی۔ باقی اس سچ کو چھپانا کتمانِ حقیقت کے مترادف ہوگا کہ اپنے وجود میں براجمان خوف کی وجہ سے سوشل لائف بھاتی نہیں ہے۔ لوگ بہت اچھے ہوں گے، مگر مجھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے! یوں مجھے خالی عبادت گاہوں سے بے حد پیار ہے!!

☆ آپ کی ذہانت، فطانت اور تحرک کے ہم دل و جان سے قائل ہیں مگر اسّی کی دہائی میں طلوع ہونے والے افسانہ نگاروں میں آپ کے ویژن کو سب سے الگ، سب سے جدا گردانا دیگر دوستوں کے ساتھ زیادتی تو نہیں؟

☆☆ اب ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا کہ ہڈسن نے کہا تھا یا کسی اور جینئس نے کہ ہر مصنف کا اپنا انفرادی اسلوب و اظہار ہوتا ہے لیکن زمانے کی غالب روح وہ جو کچھ بھی ہو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر مصنف کے فن میں منعکس ہوتی ہے۔ گلزار صاحب! آپ خود شاہد ہوں گے کہ کوئی شعوری کاوش کے ساتھ بھی کسی کے مکمل صد فی صد مماثل ہونا چاہے تو وہ ایسا کر نہیں سکتا کہ الگ ہونا، وہ 'جبر' ہے جسے قبول کرنے پر بہر طور 'پابند' کیا گیا ہے۔ یوں افراد کی عمومی اکائیاں کسی واضح شناخت کے بغیر برابر فلوٹ کرتی رہتی ہیں۔ تاوقتے کہ کوئی اپنے انفراد کی صحیح خطوط پر نشو و نما کر کے ممتاز ہو جائے۔ ہم لکھنے والے بھی اپنی عمومی اکائیوں کے مدار میں اسیر رہ کر کام کرتے رہتے ہیں اور بیرونِ ذات کی مشترکہ میراث سے خام مواد حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔۔۔ مگر بالعموم یہ سب ایک جیسا ہی ہوا کرتا ہے۔۔۔ اب کسی کے اندر الگ ہونے کی تمنا زور پکڑ جائے تو وہ انرجی کا منبع بن جاتی ہے۔ یہاں رک کر کہنا چاہوں گا کہ انفرادیت فیشن نہیں ہے۔ یہ ضبط کا سرنامہ ہے، یہ ایک طرزِ احساس ہے۔۔۔ آپ سر درد سے دہرے ہوئے جا رہے ہیں، اگر آپ کے ہم نشین نے یہ کہنے میں پہل کر دی: 'میرے سر میں درد ہو رہا ہے!' تو اب جان بھی چلی جائے مگر یہ نہ لب پہ لائیں کہ میرے بھی سر میں درد ہو رہا ہے۔ میرے مکرم! اس خواہش کی نفی تو نہیں کر سکتا لیکن یہ کہنا کہ اس طرف سے کامرانی بھی مل گئی ہے، اسے تعلّی ہی سے تعبیر کرنا پڑے گا۔۔۔ اب اگر کسی مہربان نے اپنی Subjectivity کے زیرِ اثر 'سب سے الگ ویژن' پر مبنی تاثیر کو اظہاریہ بنا دیا ہے تو لازم نہیں اسے معروضی حقیقت تسلیم کر لیا جائے۔

☆ آپ کے ہاں انگریزی ادب کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جس کے ساتھ طبیعیات، مابعد الطبیعیات اور دیگر مغربی نظریات کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اس کے محرکات؟

☆☆ عہدِ موجود میں 'بین العلومیت' کی معنویت زیادہ ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ ادب اور آرٹ کی اپنی رفتار ہوا کرتی ہے، جو سائنسز اور سوشل سائنسز کی نسبت ہمیشہ دھیمی رہی ہے نیز سماج پر ان کے اثر و نفوذ کی صورتیں مختلف رہی ہیں اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے۔۔۔ یہ طے ہے کہ زمانے کے علوم و فنون لٹریچر میں جذب ہوں گے۔ اب انیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا نے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے انکشافات اور ایجادات کے ذریعے فرد کو نقشِ حیرت بنا کے رکھ دیا ہے! اس صورت حال پر مرعوبیت کا فتویٰ صادر کر کے فرار حاصل کرنا ممکن نہیں رہا۔ جنھیں کیمرے اور مائیک میں بجز کفر کے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اب ان کے ہاتھوں میں 'دوجیم' سے بھی زیادہ اول و آخر کو محیط 'دو کاف' نہایت خوشنمائی سے ظہور کر رہے ہیں۔ سو، میں نے بھی اپنی 'رینج' بڑھانے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ یوں دیگر السنہ کے فکشن اور نان فکشن دونوں تک رسائی کے لیے تگ و تاز کو ترجیح بنانا چاہا۔ اس طرح متنوع افکار کے سرو کار سے تعارف کی شکلیں بن رہی ہیں۔ ہر چند یہ سمندروں میں غوطہ زن ہونے کے مساوی عمل ہے مگر مقدور بھر جدوجہد ہو رہی ہے۔۔۔ ویسے یہ پیرا کی آپ کو لکھنے سے روکتی بھی

ہے کہ معیارات اونچے ہو جاتے ہیں۔۔۔لیکن اپنی ترجیحات میں پڑھنا مجھے ہمیشہ عیاشی محسوس ہوا اور لکھنا مشقت۔۔۔اسی پڑھنے نے عصبیت سے مجھے سدا دور رکھا ہے۔کوئی نظریہ، کوئی علم، کوئی مطالعہ میرے لیے ممنوع نہیں رہا، بھلے ہی وہ میرے پروان چڑھائے ہوئے میلان کے یکسر برعکس قطب پر واقع ہو۔اس لیے جب کسی کتاب کی نشرواشاعت پر پابندی عاید ہوتی ہے تو سخت حیران ہو جاتا ہوں کہ یوں کرنے سے کیا ہو جائے گا!؟!

☆ ہمارے عصر کے قد آور افسانہ نگار جناب رشید امجد آپ کے افسانوں کو اپنے عہد کے سماجی اور روحانی آشوب کی داستان بتلا کر کسی خاص سمت کی نشان دہی تو نہیں کر رہے؟

☆☆ ڈاکٹر رشید امجد کی یہ رائے میرے دوسرے افسانی مجموعے: ''زرد کفن میں نخلِ ایمن'' کی نسبت سے سامنے آئی تھی۔ یہ مجموعہ ۱۹۹۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس سے پہلے ۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والا پہلا افسانی مجموعہ بھی ان کے مطالعے میں آ چکا تھا۔اس لیے ان کا کہا اپنا تعین خود کر رہا ہے کہ محولہ افسانوں کا زمانہ قریب قریب وہی ہے جو ملک پر مسلط کی جانے والی دوسری عسکری آمریت کا دور کہلاتا ہے۔یوں تو ہر مارشل لاء ہی جبر کا دوسرا عنوان ہے لیکن ایک پاکستانی جانتا ہے کہ وطنِ عزیز پر بدترین اور طویل ترین ڈکٹیٹرشپ ضیا نامی ایک فوجی نے نافذ کیے رکھی۔ جن بدقسمتوں نے گیارہ برس پر پھیلی اس رات کی بھیانک تاریکی کو پایا ہے، ان میں میں بھی شامل ہوں۔سو، میرے متعدد افسانوں کے متون اس عہد کی مسموم قاشوں سے مرتب ہیں۔رشید امجد (مرحوم) نے جس طرف اشارا کیا ہے۔وہ درست ہے!

☆ تکنیک اور مطلوب تو انفرادیت کے حامل ہوا کرتے ہیں مگر لوگ باگ آپ کے مطالعے اور مشاہدے کو بھی انفرادیت کا حامل گردان کر یا غیر دانستہ طور پر قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ اس سوال کے اصولی مسئول تو وہ صاحبان ہیں جن کی جانب سے یہ تاثر رقم کیا گیا ہے۔۔۔لیکن کنارے پہ چلتے چلتے بس اتنا کہنا ہے کہ ایک افسانہ نگار کے لیے دو ہی مرکزی منابع ہیں جن سے وہ مواد حاصل کر سکتا ہے: گرد و پیش میں دھڑکتا سماج جسے 'معروض' کہا جاتا ہے، مختلف علوم پر مبنی مطالعہ، حقیقت یہ ہے کہ میں نے ثانی الذکر مصدر پر زیادہ انحصار کیا ہے کہ میرے حصے میں بہت ہی کم سفر آئے ہیں۔تاہم اذیت خیز حساسیت نے اس راستے سے جو وصول کیا، ممکن ہے وہ جوہری اعتبار سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہو مگر میرے اعصاب نے اسے کسی الگ سطح پر محسوس کیا تھا۔اس لیے امکان ہے کہ تہ پسند قاری نے اسے منفرد جانا ہوگا!!

☆ تحسین گیلانی صاحب نے ''سیاہ پہاڑ'' کے عنوان سے لکھے گئے افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے افسانے کے متن کو مارشل لاء سے تشبیہ دی ہے۔ آپ نہیں سمجھتے کہ وطنِ عزیز روز روز سے طرح طرح کے مارشل لاؤں کی زد میں ہے اور ہر طرح کا احتجاج اور واویلا قطعی طور پر بے معنی ہو کر رہ گیا ہے؟

☆☆ سید تحسین گیلانی صاحب نے اس افسانے کا ساختیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ وہ کئی برس اس کے متن پر رکے رہے۔اس طرح ان کے انہماک نے فکری تجزیے کو علمی رفعت سے ہمکنار کیا ہے۔ہاں! یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اس کی ایک ممکنہ تعبیر، مارشل لاء کے اعتبار سے بھی پیش کی ہے۔جس سے اختلاف کی مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔باقی آپ جس تسلسل کی طرف اشارا کر رہے ہیں تو اب کیسے انکار کیا جائے کہ فیصل آباد کے آٹھ بازاروں میں سے کسی ایک کا بھی چناؤ کر لیں، کلاک ٹاور بیچ ہی میں استادہ ملے گا! کبھی عیاں، کبھی پنہاں۔۔۔یہ جلوہ فرمائی ایسی ہے کہ 'ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است' اب رہا یہ قضیہ کہ اس آکٹوپس سے نجات کیسے ہو؟ تو واویلا یا احتجاج اپنی جگہ، صرف مفاد عاجلہ کو کعبہ بنانے والے سیاستدان جب اپنی 'خدمات' withdraw کر لیں گے تو سارا منظر نامہ تبدیل ہو جائے گا۔آپ دیکھ لیجیے جب بھی اعلانیہ مارشل لاء نافذ ہوا تو شوقِ اقتدار میں ایک سیاسی گروہ اٹھا اور اپنی سروسز غیر مشروط طور پر پیش کر دیں۔اسی طرح حجاب کے ایام میں بھی کمر بستہ رہنے والوں نے کبھی قحط الرجال کا شکوہ ابھرنے نہیں دیا۔اور کیا کہا جائے ان میں جاہ طلبی کا عالم یہ ہے کہ Social Stigma کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔اندریں حالات کسی بڑے تغیر کی توقع دیوانے کے خواب سے زیادہ کچھ نہیں!!

☆ کسی حوالے اور نشان دہی کے بغیر اپنی حساسیت کا سبب یا اسباب اور آپ کی شخصیت و فن پر ان کے اثرات بیان فرما دیجیے!

☆☆ اس ضمن میں اگر صریح نشان دہی ممکن ہوتی تو میری 'تحلیل نفسی' کے لیے اپنے آپ راہ ہموار ہو جاتی۔اب لاشعور میں کیا فریز ہوا پڑا ہے؟ اس ڈارک روم تک میری اپنی بھی پہنچ نہیں ہے، سو، اس باب میں کی گئی توضیح قاری کو کیا مطمئن کر پائے گی! البتہ کبھی کبھی گمان سا ہوتا ہے کہ بالفرض کسی روز 'تزکیہ' ہو گیا تو شاید ایک طمانیت سے سرشار روح تخلیق کے لیے موزوں نہیں رہے گی۔گلزار صاحب! حزن کا محاصرہ حسن کے محاصرے سے بھی زیادہ جان لیوا ہوا کرتا ہے! زیست میں موجود دکھ کے مستقل عنصر نے جس شدت کے ساتھ اپنا ہونا باور کرایا ہے، اسے بیان نہیں کر سکتا!

اضطراب کے زہریلے کانٹے وجود میں پیوست ہونے کا عمل تھمتا نہیں ہے۔ آپ نے حساسیت کے حساس موضوع کو چھیڑ دیا ہے تو پھر اس Traumatized کو سنیے! بعض اوقات یہ Intensity اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہر آن کے کرب کو دوسری آن کے کرب سے الگ محسوس کرنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ایسے میں عدم تحفظ کا احساس اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ طاق عدد میرے لیے Panicmonger ہو جاتا ہے یوں جلدی سے Even عدد سے مدد مانگنے لگتا ہوں۔جس طرح آئس برگ اپنے نو حصے پانی میں محجوب رکھنے کا عادی ہے، کچھ اسی طرح اسباب کے حجم کا بھی صرف دسواں حصہ ظہور کو کافی سمجھتا ہے۔جانے اضطرار کی کتنی مقدار توارث سے متعلق ہے؟ جانے محرومیوں کی کتنی قیامتوں کو ہمرکاب کرنا چاہا ہے؟ جانے ماحول کی کتنی 'مہربانیوں' نے یہ دن

دکھائے ہیں؟ جانے کتنے آلام دامنگیر ہوئے ہیں؟ اب کیا پڑتے لگائے جائیں! کوئی چاہے یا نہ چاہے تعذیب کی یورش رکنے والی نہیں۔ اگر ایک Pessimistic یہ سوچے کہ اس دنیا کی بنیاد عناد پر اٹھائی گئی ہے تو اسے Optimism کا خوش ذائقہ شربت تسکین نہیں دے پائے گا اور وہ زندگی کو خالق کا ناراض متن ہی یقین کرتا رہے گا۔۔۔ جس تن لاگے سوتن جانے۔۔۔ خیر! شکر ہے صحائف سماوی کی صورت میں Corrigendum کے ہم شکل وعدے موجود ہیں؛ جو ایک طرف کھلے دل سے اسے 'جہانِ خراب' تسلیم کرتے ہیں؛ تو دوسری جانب بے نقص بہشت کا دلاسا دیتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ متصورہ یا موعودہ فردوس میں موجود شعور کی ڈیزائننگ میں رہ یا رکھا جانے والا یہ Fault دور ہو جائے گا جس نے اسے فی الحال بغیر دکھ کے سکھ کو پہچاننے سے عاری رکھا ہوا ہے۔ میرے خیال میں اس موضوع کو جانے دیتے ہیں کہ افسردہ دلی افسردہ کند انجمنی را!

☆ نہیں اتنی جلدی کیسے جانے دیا جاسکتا ہے! محترمہ شاہدہ دلاور نے تو آپ کو ان خصوصیات کے حوالے سے ذات کا قیدی گردانے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی!

☆☆ یہاں ایک وضاحت ناگزیر ہوگی کہ آپ کے پہلے سوال کے ساتھ اس استفسار کی صورت حال کو منسلک کرنا مشکل ہوگا کہ وہاں حساسیت کی بنا پر فن و شخصیت پہ اثرات کا معاملہ ہے جبکہ یہاں 'ذات کا قیدی' ہونے کا قضیہ صاحب اسلوب' کی 'تہمت' سے جڑا ہوا ہے۔ شاہدہ صاحبہ اول الذکر پس منظر میں کچھ کہنے کی طرف پیش قدمی نہیں کرسکتیں کہ وہ مجھے ذاتی طور پر نہیں جانتیں ہاں! ان کی یہ بات دوسرے سیاق میں Valid ہے کہ ایک ادیب اپنی انفرادیت ہی کے بل پر علاحدہ شناخت قائم کرسکتا ہے مگر وہ دوسروں سے الگ ہو کر 'صاحب اسلوب' ہو بھی جائے تو وہ اپنے انداز نگارش میں اسیر ہو کر رہ جائے گا۔۔۔ یوں اپنا قیدی ہو جائے گا۔ اب اس سوال کو کیسے روکا جائے کہ اگر وہ اپنی مخصوص طرز کے بندی خانے سے رہائی پائے گا تو اس کا تشخص دوبارہ گم ہو جائے گا۔۔۔ وہی بات:

'غرض دوگونہ عذابست جان مجنوں را۔ بلائے صحبتِ لیلیٰ وفرقتِ لیلیٰ! فیصلہ کیسے ہو؟

تو اس مرحلے میں اجمالاً یہ جان لینا چاہیے کہ جدید شارحین اب ''اسلوب'' کو صرف طرز اظہار یا انداز بیان میں محدود کرنے کے قائل نہیں رہے مضمون و موضوع اس منطقے میں جذب ہو کر ہی اسے متمول کریں گے۔ اس طرح ایک اسلوب صنف سے وابستہ ہوا، دوسرا مصنف سے منسوب ہوگا۔ مطلب یہ کہ دونوں ہمقدم ہو کر چلیں گے تو انفراد ابھرے گا۔

اب آتے ہیں اس طرف کہ محترمہ کے مطابق یہ عاجز کیا 'ذات کا قیدی' ہے یا نہیں؟ تو بیانِ صفائی کی حیثیت ہمیشہ دفاعی رہی ہے۔ مطلب یہ کہ 'کمزور پوزیشن'! تو جیسے اپنی آنکھوں کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا، اسی طرح اپنے عیب و ہنر کا حقیقی محاسبہ و محاکمہ نہیں کیا جاسکتا۔ بہر رنگ اپنا احتساب کرنے کا عزم ضرور رکھتا ہوں۔ اس ضمن میں استمداد سے انکار بھی کفر کے زمرے میں شامل ہوگا کہ 'درویش رواں رہے تو بہتر۔ آب دریا بہے تو بہتر'!! Intake میں بتدریج اضافہ ہوتا رہے تو فکری سطح سرفرازی سے لطف اندوز ہوتی ہے، نتیجہ معلوم! امتیاز ارمغان بن جاتا ہے۔ یہی ڈگر مجھے مرغوب ہے:

عشق لہر تو کتدا رہو ہر دم
خورے تند کیہڑی منظور ہووے

☆ 'صاحب اسلوب' تخلیق کار کی نشانیاں کیا ہیں؟ احبابِ جمیل کو کب اس وصف بلکہ کمال کا احساس و ادراک ہوا اور اس کا اعتراف کس شکل میں نمایاں ہوا؟

☆☆ شاید اس سلسلہ میں وضاحت سامنے لائی جا چکی ہے۔ مزید یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسی کیسی بھی توجہ میسر آئی ہے، قارئین نے موضوع و انداز بیان کی یکجائی سے مشروط ندرت ہی کو پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا معیار بنایا ہے۔

☆ آپ کی فنی خوبیوں اور کمالات کو اجاگر کرنے والوں کا انداز واستدلال ارادی کوشش پر زور دیتا کیوں نظر آتا ہے؟

☆☆ دیکھیے 'وہب و اکتساب' کے مالہ، و ماعلیہ پر دقیق بحثیں بہت ہو چکی ہیں۔ سادہ الفاظ میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جس تحریر کو پڑھنا دشوار ہو، اس کی بابت یہ اخذ کرلیا جاتا ہے کہ لکھنے والا بھی جوکھم سے گزرا ہے۔ ایسا اگر ہوسکتا ہے تو نہیں بھی ہوسکتا۔ لکھت کے عمل کی 'میکینکس' ایسی سادہ بھی نہیں ہوا کرتیں۔ یہ ہر لکھنے والے کے تجربے کو الگ کرنے پر اکثر مصر رہی ہیں۔ ذاتی معاملہ کچھ یوں ہے کہ 'نوائے سروش' نے بس چند کوڈز ہی پر اکتفا کیا ہے۔ باقی الفا ٹو اومیگا ہر افسانے کے سلسلہ میں خود ہی سارا 'ترکھان پنا' کرنا پڑا۔ اس پر نازاں ہونے کی بھی کوئی گنجائش نہیں پاتا کیونکہ معجزۂ فن کی خونِ جگر سے نمود کرنے والے مشاہیر اور ہیں۔ یہ ان کا غیر معمولی مجاہدہ تھا جو انھیں اونچے سنگھاسن پر فائز کر گیا۔ اور حان پاموک نے ناول لکھنے کو سوئی سے کنواں کھودنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ جانے کہاں پڑھا تھا، جب ''رموزِ بیخودی'' کا حصہ یہ شعر:

درمیان کارزارِ کفر و دیں
ترکش مارا خدنگ آخریں

☆ چہرے پر شاہی قلعے کا روغن چڑھانے والی بات ہمارے قاری کو اُت سُک یعنی بے کل اور بے چین کرنے کے لیے کافی ہے؟

☆☆ (ہاہاہا) اشفاق ورک بہت مزے دار مزاح نگار ہیں۔ اس لیے ان کی 'خاکہ آرائی' سے محض حظ اٹھانا چاہیے۔ سنجیدہ نتائج آفرینی کہیں فکاہی ادب کے رقبے میں وسعت کا سبب نہ بن جائے!!

☆ میرزا ادیب کے روحانی بیٹے آپ کب اور کیسے بنے نیز میرزا صاحب کی آپ کے تحقیقی مقالے کی بابت پیش گوئی حرف بہ حرف درست کیوں کر ثابت ہوئی؟

☆☆ میرزا ادیب سے تعارف ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ ان کی وفات ۱۹۹۹ء تک ان سے برابر رابطہ رہا۔ وہ بہت ہی شفیق اور خلیق شخصیت کے مالک تھے۔

گلزار صاحب! اگرچہ صدیاں نہیں بیتیں مگر تیس چالیس برس ہی ہیں، بہت فرق آ چکا ہے۔ جب ہم نوجوان تھے تو یہ بزرگ ادیب شاباش میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ پیار بھری ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ اصلاح و رہنمائی جاری رکھتے تھے۔ اب بھی سینئرز نئے لکھنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہیں مگر اکثریت کے بازو ان کے اپنے ہی شانوں تک سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ جب اورینٹل کالج میں ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کی زیرِ نگرانی جامعاتی تحقیق کے نصابی مرحلے سے گزر رہا تھا تو میرزا ادیب ایک طرح سے دوسرے نگران بن گئے۔ ان کی لائبریری سے استفادہ کیا۔ ان کی ہمہ دم رہبری کام آئی۔ اس طرح جب مذکورہ سندی مقالہ ان کے مطالعے کا حصہ بنا تو انھوں نے فیاضی کے ساتھ اس کام کو سراہا! یوں بہت ہمت افزائی ہوئی اور پھر اس ٹریک کو ترک نہیں کیا۔ ان کے خطوط میں درج نیک تمناؤں کی مہک اب تک محسوس کرتا ہوں!!

☆ ''ٹائٹل سٹوری''، ''نروان'' اور ''شہرہ آفاق افسانے'' کے عنوانات سے یہ ایئتھالوجیز کس کی تحریک پر آئیں اور پیمانہ انتخاب کیا تھا؟

☆☆ 'ٹائٹل سٹوری' سے معنون انتخاب تو محض اس آئیڈیا کی ناولٹی کا صلہ تھا جو بس ایسے ہی یکا یک سوجھ گیا کہ آخر ایک افسانہ نگار اپنے کسی ایک افسانے کے نام پر مجموعے کا نام کیوں رکھتا ہے؟ یہ بس یونہی ہوتا ہے یا 'ٹائٹل سٹوری' میں کوئی خاص بات ہوتی ہے؟ دونوں جلدوں کے دیباچوں میں ان سوالات کے بساط بھر جوابات دینے کی کوشش بھی کی۔ اگرچہ اس وقت اسمیت (Nominalism) کے متعلق فکری آگہی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ ''نروان'' میں وہ افسانے یکجا کیے جنھیں روحانی، صوفیانہ تجربے کی اساس پر لکھا گیا تھا۔ Divinity کے شمے اپنے بطن البطون میں سموئے ہوئے یہ افسانے چونکہ پہلی بار انتخاب بنے تھے، اس لیے کچھ زیادہ پذیرائی پا گئے۔ ''شہرہ آفاق افسانے'' غیر ملکی افسانوں کے تراجم پر مشتمل کتاب تھی، جسے اس عاجز کا 'حاصل مطالعہ' کہا جا سکتا ہے، 'پیمانہ انتخاب' صرف اور صرف ذاتی پسند۔۔۔ سو، کوئی ادعا نہیں!!

☆ ممتاز مفتی صاحب آپ کو افسانہ نگار کی بجائے فلسفی گردانتے پر کیوں بضد ہیں؟

☆☆ مفتی جی تلقین کیا کرتے تھے کہ مروج 'بشریات' کو محسوسات کے آئینے میں دیکھ کر کہانیاں لکھو! انھیں فکر و نظر کی حریم میں مقید 'تجریدیت' سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میرے ہاں چونکہ 'نظری مسائل' کا غلبہ تھا۔ اس لیے ان کا خیال تھا فلسفیانہ قضایا کو فکشن سے دور ہی رکھنا چاہیے۔ مفتی جی بڑے آدمی تھے، اس لیے کوئی جسارت نہیں کرتا مگر کتابوں کے اوراق میں محصور 'بے جان فلسفے' کس درجہ طاقت ور ہوتے ہیں کبھی کوئی انھیں عملی زندگی میں شامل کر کے دیکھے! کیسا جوار بھاٹا وجود میں آتا ہے! تلاطم سب کچھ بہا کے لے جائے گا!۔۔۔ مثال کے طور پر 'بشر مرکز' کلٹ کا اینٹی تھیسز سوچ کر دیکھیے، سب بھک سے اڑ جائے گا۔۔۔!

☆ آپ نے کبھی ''فتاویٰ کالمگیری'' کے عنوانات کو اوق اور جمہوری جادے سے جدا بتلانے والوں کی تشفی نہیں کی؟

☆☆ میں نے اکثر و بیشتر اس سعی کو ترجیح بنایا ہے کہ تشفی کے عمل کو ممکن حد تک فعال نہ ہونے دیا جائے۔ جانے ایسا کیوں ہے کہ مخاطب کو قائل کرنے کی مساعی مجھے مبلغانہ سی محسوس ہوئیں اور Preaching ایک نوع کی مداخلت ہی تو ہے کہ کبیری بیانیے پر اپنا خلقی حق ظاہر کرتی ہے۔ رہی یہ جہت کہ کسی موقف کو اپنانے کی آزادی ہونی چاہیے یا نہیں؟ تو میں Freedom of Choice کے حق میں ہوں لیکن دوسرے کو 'گھیر کر' اپنی Doctrine تسلیم کرانا جارحیت ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ 'اکھ' عموماً مجھے مشکوک دکھائی دیتا ہے۔ بہر نوع بدگمانی سے بچنے کا طبعاً آرزومند ہوں! مذکورہ کتاب کے جملہ مضامین میں قاری کو ریشنل ڈسکورس ملے گا۔ اب مسائلِ حیات تو وہی ہیں جو صدیوں سے موجود ہیں مگر انھیں جس نظر سے دیکھا/ دکھایا گیا ہے وہ قدرے مختلف ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا انھیں 'عقلیات' کے دھاگے میں پرویا گیا ہے۔ غالباً اس لیے وہ عنوانات کچھ الگ ہو کر ادق ہو گئے اور جمہوری جادے سے جدا ہو گئے۔

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

بس جناب! یہ ہے ملخص فتاویٰ کالمگیری، کا۔۔۔ یہ تصریح بھی آپ کے سوال کے جواب میں ہے ورنہ کسی کی تشفی اب بھی مقصود نہیں کہ میں ایک معمولی طالب علم ہوں کوئی Canonist نہیں ہوں۔

☆ کوئی آپ کی پسندیدہ کتاب ڈکشنری بتلاتا ہے، کوئی آپ کے بارے فلسفی کا نظریہ رکھتا، کوئی انگریزی ادب کا پارکھ بتلاتا اور کوئی 'صاحبِ اسلوب' گردانتا ہے۔ ان تمام مثبت اور برحق آرا کے باوجود اہلِ نقد و نظر کے کانوں پر جوں نہ رینگنے کے اسباب آپ کے خیال میں کیا ہیں؟

☆☆ ویسے ہر لکھنے والے کی پسندیدہ کتاب 'ڈکشنری' ہی ہوا کرتی ہے کہ وہ جو لفظ بھی لکھتا ہے، اتفاق سے اس کی تحریری یا غیر تحریری ڈکشنری میں درج ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ کسی کے پاس مفلس کی جیب میں پڑی نقدی جتنی لغت ہو یا پچاس جلدوں پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا اس کے سرمائے میں شامل ہو۔ وقس علاھذا!

دراصل دورانِ ساعت یا مطالعہ ہر وہ لفظ سکون برباد کر کے رکھ دیتا ہے جو ہماری ڈکشنری میں نہیں ہوتا۔۔۔ اب Un Known کی دہشت سے انکار کیسے کیا جائے۔۔۔ یوں بعض طبائع Vocabulary سے لرزاں رہتی ہیں۔ انھیں محدود ترین ذخیرہ الفاظ میں تحفظ کا احساس رہتا ہے اور فی زمانہ خود کو محفوظ سمجھنا معمولی نعمت نہیں۔ البتہ دوسرے زاویے سے دیکھا جائے، لفظ بے چارے تو معصوم اور بے ضرر سے ہوتے ہیں۔ فی الاصل ان کا پیچیدہ فکری سیاق اذہان کو محزون کرتا ہے۔

اب رہا مسئلہ کان پہ جوں نہ رینگنے کا، تو جب تک صورت حال 'جوں کی توں' رہتی ہے، میں ان 'برحق' آرا کے مالکوں کو 'اہلِ نقد و نظر' یقین کرنے

کے 'التباس' میں مبتلا رہنا پسند کروں گا! اس سلسلہ میں آخری بات! ہزار طعنے سننے پڑے مگر آج تک کسی نے یہ کہہ کر مطعون نہیں کیا: تمھارا نام تمھارے کام سے زیادہ ہے! سو، آئندہ کے لیے یہ کم نہیں!!

☆ آپ کی نسبت Writer of Readers کی بجائے Writer of Writers کا خطاب خراج کے زمرے میں آتا ہے یا؟

☆☆ گلزار جاوید صاحب! ہر عجز کو منہا کر کے صرف یہ کہنا ہے کہ میں نے اب تک جتنا جیسا لکھا ہے، اپنی دھن میں، اپنے جنون کے زیر اثر لکھا ہے۔ اس لیے کسی بھی خطاب کا خود کو مستحق نہیں سمجھتا اور یہ کہ اپنے لکھے سے خود بھی مطمئن نہیں ہوں۔ البتہ آرزو ضرور ہے کہ کوئی قابلِ ذکر چیز لکھنے کی توفیق مل جائے!

☆ اکثر شعرا اور ادبا پر بسیار نویسی کا الزام بھی عاید کیا جاتا ہے۔ آپ بھی اس کی زد میں ہیں۔ اس کے نقصانات اور فوائد آپ کے خیال میں؟

☆☆ بسیار نویسی یہ نہیں کہ کسی نے زیادہ تعداد میں کتابیں لکھی ہیں۔ بسیار نویسی کا مفہوم یہ ہے کہ جس بات کو پندرہ سطروں میں تحریر کیا جا سکتا ہے، محرر نے اس پر پانچ صفحے صرف کر ڈالے ہیں۔ باقی ہر فرد کا اپنا پوٹینشل ہوا کرتا ہے۔ متعدد امثلہ مل جائیں گی کہ کم لکھا اور غیر معیاری لکھا، کئی نظیریں مہیا ہو جائیں گی کہ بہت لکھا اور عمدہ لکھا۔ اس قضیے میں یہ پہلو بہر طور نظر انداز نہیں ہونا چاہیے کہ جس نے مسلسل کام کیا ہے اور معیارات کو زک نہیں پہنچنے دی، اس کا درجہ بلند ہے بہ نسبت اس مصنف کے جس نے محدود تر دورانیے کے لیے چکا چوندھ پیدا کی اور اس کے بعد زندگی بھر Mute رہا۔ باقی عہدِ موجود کی دین تن آسانی پر بھی سوالیہ نشان عاید ہوتا ہے کہ دور کیا جانا اُنیسویں صدی کے متحدہ ہندستان میں ایسے اصحابِ قلم ملتے ہیں جنھوں نے اپنے علمی معیار پر کمپرومائز بھی نہیں کیا اور ہزار ہزار کتب کی فہرست اپنے کریڈٹ پر درج کرائی۔۔۔ اگرچہ مذکورہ علما مذہبی دنیا کے ترجمان ہیں مگر ان کا تصنیفی اثاثہ حیران کر دینے والا ہے۔۔۔ اس کے بعد اپنا ذکر کرنا تو کسی نوع کا کوئی جواز ہی نہیں رکھتا!!

☆ آپ کی نثری نظم کو ڈاکٹر محمد افتخار الحق نے بجا طور پر عشاقانِ ادب کے لیے حیرت و دلچسپی کا سامان کہا ہے۔ کھد بد، بلکہ ہلچل دماغ میں یہ ہے کہ اس طرف آپ کی توجہ اور یکسوئی کب اور کیوں کر ہوئی اور اس خاموشی بلکہ راز داری کا سبب کیا ہے؟

☆☆ نظم سے موسوم وادیٔ سخن کی سیاحت کبھی میرے سپنے کے پاس سے بھی نہیں گزری تھی۔ کوئی دو سال قبل کرونا لاک ڈاؤن کے دنوں میں 'اپنے آپ' کوئی سوئچ آن ہوا اور 'بارڑ' کے نام سے ایک نظم 'اتری'! 'اتری' میں نے عمداً کہا ہے کہ فرشتے اب بھی شاعری کے لیے 'سافٹ کارنر' رکھتے ہیں۔ نثر سے قدسی کچھ گریزاں ہی رہے، شاید اس میں لگتی ہے محنت زیادہ! بہر حال یہ نظم اسی وقت اپنے قریبی دوست ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کو سینڈ کر دی۔ فوراً ان کا ریپلائی آیا: 'ایک نظم تو ہو گئی، باقی رہ گئیں صرف چھیاسٹھ'، یوں آپ کی نئی کتاب نظموں پر مشتمل ہو گی۔۔۔ اب ظاہر ہے یہ سب مذاق میں کہا گیا تھا۔۔۔ لیکن کبھی کبھی کامیڈی بھی کشفی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چند ہفتے اس شدت کی گرفت رہی کہ بیان سے باہر! کہا پورا ہو کر رہا اور: ''سنگریزوں پر بہتی دھوپ'' کے ٹائٹل سے مجموعہ بھی چھپ گیا۔ اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ جیسے جبراً آپریشن تھیٹر میں لے جا کر Ligation کر دی گئی ہے۔ رحمِ دماغ میں کسی نظم کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔ یہ ایک Mystery ہے جسے Unfold کرنے سے قاصر ہوں! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر محمد افتخار الحق نے ان نظموں کے متون کو پیہم اپنے محدب عدسے کے نیچے رکھا۔ شاید پانچ فیصد نظمیں ہی عام فہم ہوں گی۔ باقی سب گرہوں میں بندھی ہوئی ملی تھیں لیکن ڈاکٹر افتخار ایک عبقری ہیں کہ انھوں نے فکری عقدوں کو اس نفاست اور خوب صورتی سے کھولا ہے کہ دل سرشار ہے ایکدم! اسی طرح عصرِ حاضر کے اہم نقاد ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی صاحب نے اپنے وقیع مقدمے میں ان نظموں میں ملتوی ہونے والے معانی کو عمدگی سے تفہیم کا حصہ بنایا ہے۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر: محترمہ بشریٰ دلدار، ڈاکٹر محمد اکرم اور عزیزہ ذونیرا بخاری کا ضرور ذکر کروں گا کہ کمال توجہ کے ساتھ انھوں نے چنیدہ نظموں کا انگلش میں ترجمہ کیا۔

☆ یہ بات تو بلا کم و کاست کہی جا سکتی ہے کہ نثری نظم میں آپ کا کام اور نام نمایاں مقام حاصل کرنے والا ہے بلکہ کر چکا ہے۔ منفرد صنف سے جڑے اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں بتائیے کہ اس الگ صنف کی پذیرائی اور ہر دلعزیزی کے لیے آپ کے خیال میں کس طرح کے اقدامات ضروری ہیں؟ یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اب تک آپ کے مطالعے میں نثری نظم کے کتنے تخلیق کار گزرے ہیں اور کن کے تخلیقی وجدان نے آپ کو متاثر کیا اور ان کے مستقبل کی بابت آپ کی اُمیدیں کیا ہیں؟

☆☆ یہ آپ کی محبت ہے کہ نثری نظم کی مناسبت سے میری کوشش پر شاباش دے رہے ہیں۔ جہاں تک خالص ذاتی تجربے کا معاملہ ہے تو دیگر احباب کی طرح آپ بھی جانتے ہیں کہ میں شاعر نہیں ہوں؛ یوں ان نظموں کا Fabric جہاں سے وصول ہوا؛ وہ ہے تو Pure Prosaic Source لیکن زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ نثر بھی ایک لطیف ترین تہ (Layer) رکھتی ہے؛ جس کے Motif میں خاص قسم کا لحن رقصاں ہوتا ہے؛ جیسے موجودہ آئی ٹرانسپلانٹ سرجری میں آنکھ کا صرف ایک شفیف حصہ یعنی Cornea ہی کارآمد ہو سکتا ہے؛ اسی طرح نثر کا مذکورہ نہایت نازک پرت نظم کی تخلیق میں اصولی معاونت کرتا ہے۔ کم از کم اس عاجز سے نثری نظم کی مخفی سطح اسی پائیں لہر سے مربوط ہو کر برآمد کی جا سکی ہے۔ جس کی اظہاری صورت گری کسی مروج بحر میں اس لیے نہیں کہ اس کے بحر کو موجوں میں اپنا اضطراب مضمر ملا ہے۔ اپنا یوں کہ مجھ سے نثری نظم میں جو رطب و یابس بیان ہوا ہے؛ شاید وہ نثری نظم ہی میں ہونا تھا؛ کسی اور صنف ادب میں نہیں۔ باقی سچی بات ہے اس صنف کی شعریات کے

متعلق میری علمی تنقیدی معلومات پرائمری نوعیت کی ہیں۔اسی طرح معاصر نظموں کے متون بھی بہت ہی کم مطالعہ میں آسکے ہیں۔البتہ جب کوئی صنف ایک بار کسی کے لیے اتفاقاً بھی وسیلۂ اظہار بن جائے تو شناسائی کا ایک آدھ در کھل ہی جاتا ہے۔اس لیے آپ کے بھرپور سوال کو مدنگاہ رکھتے ہوئے پہلی بات تو یہ کہنی ہے کہ نثری نظم 'مظلوم صنف' ہے۔اسے جی بھر کے رگیدا گیا ہے اور اسے 'شاعری' تسلیم نہیں کیا گیا۔غور کا مقام ہے کیا اس کو مسترد کر دینے کے لیے صرف ایک ہی منفی جواز کافی ہوگا کہ عروض و بحور کے ڈسپلن سے آزاد ہونے کے باعث اسے دائرۂ سخن سے خارج کر دیا جائے! انتقاد فتوے کے لہجے کو قبول نہیں کرتا۔قدرے اطمینان کے ساتھ سوچنا چاہیے کیا کسی صنف ہی کو دھتکار دینا مناسب عمل ہے؟ نیز وزن و بحر میں مقید: سطر / مصرع / شعر / نظم / بیت 'شاعری' قرار پا جائیں گے؟ ان کا کچھ بھی معیار ہو! حتیٰ کہ ویدوں / طبیبوں کے منظوم نسخے بھی؟ اس خاکسار کی دانست میں ایسا نہیں کہ نثری نظم نے تو اپنی باطنی سطح کے اثبات کو ایک اور طرح سے پابند کیا ہوا ہے اور وہ ہے متنی تشکیل کے دوران شبد اپنی خودمختار حیثیت میں ظہور کرے یعنی ایسے معنی کو منتقل کرے جس میں 'لغت' کا کردار نہ ہونے کے برابر رہ جائے۔اب وہ کون سا لفظ ہے جو لفظ ہوتے ہوئے بھی لفظ نہ ہو؟ تو اس کا Appropriate جواب دیا گیا ہے: ''نثری نظم فی الحقیقت لفظ کی مصرعے کے خلاف بغاوت ہے۔'' اور یہ بغاوت اسی صورت کامیاب قرار پا سکتی ہے جب نظم پہلے متن کو مٹائے بغیر ایک سے زاید متون قاری کی جھولی میں ڈالنے پر آمادہ ہو۔ اس لیے کہ: ''عام زبان قائم بالغیر ہوتی ہے اور شعری زبان قائم بالذات ہوتی ہے۔'' مطلب یہ کہ نثری نظم ایک سے زیادہ قراتوں کے جوہر سے متصف ہو۔ جواباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں نثری نظم کا اختصاص کیا ہے؟ عروضی شاعری سے بھی یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے! سوال سر آنکھوں پر مگر تفحص کی ضرورت ہے کیا وزن و بحر کی قدغن خیال کی کھلی اطراف کو مسدود کرنے کا باعث بنتی ہے یا نہیں؟ بعینہٖ، قافیے ردیف کے تقید نے آزاد نظم کے لیے جواز پیدا کیا تھا۔یوں بیاں کی وسعت کا تقاضا سدا کہنہ فریم توڑتا آیا ہے۔باقی نثری نظم کا ایک امتیاز برقرار رہے گا کہ یہاں لفظ کمپاونڈ بنتا ہے جبکہ روایتی موزوں صورتوں میں مصرع، شعر! اسی وجہ سے باقاعدہ غزل / نظم گوؤں نے بھی پابند شعری اصناف کی بجائے مخصوص مقتضا کے تحت نثری نظم کا بھی انتخاب کیا۔ایک معاصر نقاد نے اس بحث کو سمٹاتے ہوئے درست کہا ہے: ''شاعر صنف منتخب نہیں کرتا بلکہ شعری تجربہ اپنے لیے بہترین ہیئت خود ہی منتخب کرتا ہے۔نثری نظم میں تخلیقی تجربہ واحد ہیئتی عنصر ہے۔''

☆ وطن عزیز میں آج کل اہل سیاست اور اہل اقدار میں جس طرح کی کٹا چھنی چل رہی ہے، اس میں اردو ادب اور ادیب کا کردار کیا ہونا چاہیے جس سے عوام کو ہماری موجودگی اور اہمیت کا احساس ہو؟

☆☆ اعتذار کا طلبگار ہوں! میری آنکھ میں موجود عصبیت ایک ادیب / شاعر کو سیاسی جلسے کے سٹیج پر نہیں دیکھ سکتی کہ بھلے ہی وہ جلسہ اسٹیٹس کو کے خلاف ہو، سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت میں مزاحمت کا ترجمان ہو۔وہاں مائیک پر لہکنے والا شاعر مجمعے سے بے پناہ داد وصول کر کے شاداں و فرحاں بھی ہو جائے لیکن انجام کار اس ساری شاعرانہ کارروائی کا بینیفیشری اسی جلسے کا اصل کرتا دھرتا سیاستدان بنتا ہے۔اقبال نے درست کہا تھا:

خواب سے بیدار ہتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

☆ فی الوقت آپ جیسا ذہین، صاحبِ مطالعہ اور محنت و لگن سے بھرپور ادیب، شاعر، دانشور اور نقاد اردو ادب کو کم کم دستیاب ہے مگر جب ہماری نظر چہار جانب چھائے نیو ورلڈ آرڈر یا منی ورلڈ کے کالے بادلوں پر جاتی ہے تو تمام حوصلے اور ولولے پست ہو جاتے ہیں۔حالات موجود کی نسبت سے آپ کے خیال میں اردو زبان و ادب سے وابستہ احباب کو کس طرح کا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے؟

☆☆ 'نیو ورلڈ آرڈر'۔۔۔ زماں کی ہر کروٹ کے ساتھ یہ اتنی بار Execute ہوا ہے کہ اب اس میں 'نیو' ہی شاید سب سے زیادہ عمر رسیدہ ہے۔ جدل کے تواتر نے گلوب پر طاقت کے مراکز سدا تبدیل کیے ہیں لیکن حصول طاقت کے اصول کبھی تبدیل نہیں ہوئے۔ مثال کے طور پر معیشت ہمیشہ Spinal Column رہی۔جس ملک نے مثالی اقتصادی استحکام پا لیا وہی جہان کا محور بنا۔ مسئلہ یہ ہے کہ کوئی ملک تن تنہا یہ مہم سر نہیں کر سکتا۔ یہاں Collaboration کے بنا ہدف تک نہیں پہنچا جا سکتا۔۔۔ زبان کی نزاکت سے شغف رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس لفظ میں 'دوغلا پن' اپنے لیے جگہ رکھتا ہے، مخصوص مقاصد کے لیے حریف سے بھی خفیہ تعاون کا لین دین ہوتا ہے۔۔۔ اگر مثبت ہمکاری ہو تو یہ 'صراطِ مستقیم' ہے لیکن کیا کیا جائے 'مثبت' بھی اضافی ہے۔جیسے افغانستان کے پس منظر میں withdrawl Post پاکستان، چین، ایران، روس، افغانستان وغیرہ کی 'یکجائی' بھلا امریکا کے لیے کب قابل قبول ہو سکتی ہے! ماضی میں ہمارا حلیف ہونا ایک ایک طرح سے 'غیر مشروط' رہا اور ہم کبھی سبز ردا اوڑھ کر امریکا کی جنگ لڑتے رہے تو کبھی جدید روشن خیالی کا علم تھام کر حقِ دوستی ادا کرتے رہے۔ وہ الگ بات کہ بلی خدا واسطے چوہے نہیں مارتی! مگر اب جو بادی النظر میں فرق آیا ہے تو No کی گمک نے ہمیں معتوب کر رکھا ہے۔ان داتا کہتا ہے: امداد دور ہوگی؛ قرض میں سے سہولت منہا ہوگی؛ سیاسی استحکام کو ترسو گے؛ قیمتوں، نصابوں کا تعین ہم کریں گے! اسی طرح مبصر توجہ دلا رہے ہیں کہ پڑوس میں آباد روایتی عدو 'آقا' کی تھپکی سے سکیورٹی کونسل میں مستقل جگہ بنا سکتا ہے۔اگر یہ ہو جاتا ہے تو پاکستان کی خارجہ پالیسی مزید ضعف کا شکار ہو جائے گی۔ ماضی کی ساری وفاداریوں کے باوجود جو بائیڈن کو ابھی تک رام نہیں کیا جا سکا۔گویا وہ ہنوز غزل کا روایتی محبوب بنا ہوا ہے۔اس عدم التفات نے ہماری خود اعتمادی کو اورزک پہنچائی ہے۔امریکی انخلا کے بعد بے چارگی کے شکار افغانستان کے لیے چانکیائی دستگیری ظاہر تو کر رہا ہے لیکن ان بے آب و گیاہ،

پہاڑیوں میں چھپی قیمتی معدنیات کو اس کی تیز نگاہیں دیکھ رہی ہیں۔ افغانستان پاکستان پر انحصار ترک کردے، یہ ایسا سہل بھی نہیں کہ اس کا Land Locked Country ہونا ظاہر ہے۔ آخر روٹی تو اس مچھندر نے بھی کما کھانی ہے۔

☆ فرانسس کرک نے Blind spot کی جو بات کی ہے، آپ کے ہاں وہ کب کب اور کس رنگ میں ظاہر ہوئی اور اس کے نتائج کیا رہے؟

☆☆ آپ کے اس سوال کا مفصل جواب تو شاید پیش نہیں کیا جاسکے گا کہ یہ معمائی طرف ماسکہ سازی یا Focalization کی زیادہ متقاضی ہے اور میری معلومات بہت کم ہیں۔۔۔ بلاشبہ ہر اصطلاح میں ٹیون کی گئی یہ بیپ مسلسل کانوں میں انڈیلی جاتی رہی ہے: Keep The right perspective! لیکن Blind Spot بھی دیگر اصطلاحات کی طرح اپنے اشتقاقی رشتے کی نفی نہیں کرتی۔ تشریح الاعضا میں یہی کہا گیا ہے: 'وہ نقطہ جہاں بصری عصبہ، پردہ چشم سے جا کر ملتا ہے اور اس نقطے پر بصارت نہیں ہوتی۔' فرانسس کرک نے بھی آنکھ کے اسی حیاتیاتی عمل کی اساس پر اپنے مضمون کو وسعت دی ہے، جسے ہمارے یہاں غالباً پہلی بار ڈاکٹر وزیر آغا نے موضوع بنایا۔ سادہ ترین الفاظ میں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دید کے دوران ایک مقام پر 'نظر نہ آنے والے منظر سے بھی واسطہ پڑتا ہے' یوں جو نہیں ہے، ناظر کو وہ بھی اپنی مرضی سے، دیکھنا پڑتا ہے۔ اب فرد کا 'دارو غہ' تو اس کا دماغ ہی ہے۔ اس کی دی ہوئی کمانڈ کے عین مطابق مذکورہ 'بلینک' کو اس اس طرح 'فل' کر دیا جاتا ہے کہ دیکھنے کے عمل میں بظاہر کوئی تعطل واقع نہیں ہوتا۔ یوں دیکھا/ ان دیکھا برابر ہو جاتے ہیں۔ درا کی سے متصف ذہن یہ گمان تک نہیں ہونے دیتا کہ جہاں کچھ تھا ہی نہیں، اسے بھی 'کچھ' بنا دیا گیا ہے۔ گویا ماضی کے تجربات نے نظر کو یہ اعتماد بخش دیا کہ Blind Spot بھی اسے Object کا ایک جزو ہی ملا۔۔۔ اب 'فریب نظر' کے واقعات ایسے ایسے پر لطف شاخسانے رکھتے ہیں کہ فرد نے اپنی 'دو نگہی' کو خوب انجوائے کیا ہے!

مجھ کو مارا ہے اسی ایک غلط فہمی نے
میں سمجھتا تھا مجھے خوب نظر آتا ہے

اب رہا آپ کے سوال کا یہ حصہ کہ اس عاجز کے افسانوں میں مذکورہ جہت کی شمولیت کیا نتائج سامنے لائی؟ تو بس یہی کہنا ہے کہ میری کہانیوں کے اکثر کردار انحراف کے روگ میں مبتلا ہیں۔ اسی ساحلی علاقے میں وہ آزادی سے سانس لینے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان پہ جب 'ہذیان' طاری ہوتا ہے تو سچ اپنے آپ ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ ان میں سے بعض خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں بھی کرتے رہتے ہیں اور حیات بعد الممات پر ایمان بھی نہیں رکھتے۔ یوں دھوکا کھاتے بھی ہیں دھوکا دیتے بھی ہیں۔ سادہ اتنے ہیں کہ انہیں Holographic Reality کا پتہ نہیں، یوں جیولری کے عکس کو اصلی زیورات سمجھ کر چھونے لگتے ہیں اور عیار اتنے ہیں کہ ابلیس کو بھی اپنے فعل میں مختار تسلیم نہیں کرتے نیز جھگڑالو اس قدر ہیں کہ باقاعدہ Argu کرتے ہیں۔ اصل میں ان کے افکار و اعمال میں Interference کو مناسب نہیں سمجھتا، سو، جس اندھے پن سے بھری Space کو انھوں نے موجود حقیقت سمجھا، اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ کہانی میں جس واقعے کی حقانیت Narrate ہوئی اس کا بار راوی کے شانوں پر ہے۔ میں کسی کو ڈیفینڈ نہیں کر رہا مگر ایسا ہو بھی تو سکتا ہے جیسے جس ساعت میں جو دیکھا/ دکھایا گیا ہے وہ اس گھڑی کا سچ ہو: 'کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا!' میں بھی تو کوئی سچ کا رفرما ہوگا کہ آخر آنات کا کھیل بھی اسی دنیا کا حصہ ہے۔ اگر ان کرداروں کی نظر نے ٹھوکر بھی کھائی ہے تو مجھے یہ اپنی حریت کی وجہ سے عزیز ہیں کہ ان کی باتوں سے مجھے وہ بو نہیں آتی جو بند کمروں میں خشک کیے گئے کپڑوں میں رچی ہوئی ہوتی ہے!!

☆ بقول رولاں بارت: ادب ایسا متن ہے جو معنی ور معنی، پس معنی، نئے معنی سے ملواتا اور طے شدہ معنی قاری تک نہیں پہنچاتا۔ اردو ادب پر یہ کلیہ کس حد تک منطبق ہوتا ہے جہاں گرتے ہوئے معیاری تعلیم کے باعث تلفظ اور املا تک جاں کنی کے عالم میں ہیں!

☆☆ کہیں پڑھا تھا: ''دو متضاد مفروضے بیک وقت غلط یا بیک وقت درست بھی ہو سکتے ہیں۔'' یوں تفکیر کا عمل 'تضادات کے شعور' پر مرتکز ہونا چاہیے۔۔۔ اگرچہ اس ارتکاز کا ایک ہی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔۔۔ پھر بھی مظاہر میں موثر تعارض دعوت فکر دیتا آیا ہے مگر یہ صورت حال ابتداً بھیتر میں Chaos پیدا کرتی ہے اس لیے گھبراہٹ کے عالم میں ہم 'مینیو' سے وہی منتخب کر لیتے ہیں جس سے سخت اکتا چکے ہوتے ہیں۔ اس طور ح ریستوران سے باہر آتے ہوئے کسی نئی ڈش کا چناؤ نہ کر پانے پر خود کو برا بر کوستے چلے جاتے ہیں! رولاں بارتھ کا معاملہ بڑا دلچسپ ہے! اس مجروح روح کا قصہ بیان کرتے ہوئے نقادوں نے اس نکتے کو نظر انداز نہیں ہونے دیا کہ اپنے نظریات کے اعتبار سے وہ مجموعہ اضداد، اس لیے تھا کہ اس کی نجی زندگی ہولناک تضادات سے عبارت تھی۔ ہے نا مزے کی بات! کہ اس نابغہ کا لینڈ مارک کام: The Death of the author ہے۔ جس کا Basic thesis مصنف کو منہا کرنے پر مصر ہے۔ مطلب یہ کہ لکھت کے عقب میں فعال عناصر اور ہیں۔ مصنف تو زیادہ سے زیادہ ایک ماتن ہے۔ جیسے ہی متن قاری کے سپرد ہوتا ہے، ایک نیا ماتن وجود میں آجاتا ہے۔۔۔ یہ سلسلہ رکتا نہیں ہے کہ رک سکتا نہیں کیونکہ فرد کا انفراد اپنے اپنے: لسانی، سماجی، فکری نظری اور ثقافتی عوامل سے تشکیل پاتا ہے۔ اس پہلو سے Textuality اور Intertextuality نے جن لطیف و دقیق مباحث کو فروغ دیا ہے، فی الوقت اس سے صرف نظر کرتے ہوئے اتنا کہنا ہے بلکہ اس تمنا کا اظہار کرنا ہے: اے کاش! ہم رشتگی کی پیچیدگی معمولی کاوش سے کھل جایا کرتی پر کیا کیا جائے منزل سفر پر فوقیت حاصل نہیں کر سکی کیونکہ منزل ایک متعین مقام ہے، سفر کا امتیاز اس کے عدم تعین میں پوشیدہ ہے۔ اب مسافر خود کو تسلی تو دے لیتا ہے کہ اس کا رخ 'حتمیت' کی جانب ہے لیکن کہیں من ہی من میں یہ احساس بھی موجود رہتا ہے کہ تعینات کے بیچ

عدم تعینات کی صورتیں نئے امکانات کو خلق کرتی رہیں گی اور سفر، اسفار میں تبدیل ہوتے رہیں گے۔ واحد بھلے ہی ایک وقت میں متکلم ہو، جائے مگر جمع کو متکلم ہونے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔۔۔ واضح رہے 'جمع' سے مراد اجتماع کا یک زبان ہونا نہیں۔۔۔ آپ نے رولاں بارتھ کا حوالہ دے کر کچھ کہنے کا موقع دیا ہے تو اس کے انوکھے تصورات پر بہت گفتگو کرنے کو جی چاہ رہا ہے لیکن اس عجیب شخص کو اتنی داد دے کر آگے بڑھنا چاہوں گا کہ چاہے خود اسی کی پیروی میں کوئی اس سے لاکھ اختلاف کرلے مگر اس کی آئیڈیالوجی کی زرخیزی بے حد قابل توجہ ہے! مثال کے طور پر جب وہ 'مصنف' لکھت/ٹیکسٹ اور 'قاری' کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو ان الفاظ کے وہ معانی نہیں ہوتے جو ہمارے یہاں عمومی طور پر رائج ہیں۔ اس نے 'محرر' اور 'مصنف' میں فرق کیا ہے۔ اسی طرح اس نے 'عام قاری' اور 'خاص قاری' میں حد فاصل قائم کی ہے۔ یعنی اس نے لکھت کو بھی دو درجوں میں منقسم کیا ہے۔ ایک کو وہ Readerly سے موسوم کرتا ہے تو دوسری کو Writerly کا لیبل دیتا ہے۔ آپ نے اپنے سوال میں اس طرف اشارا کیا ہے کہ اردو ادب پر 'التوائے معانی' کا کلیہ کس حد تک منطبق ہوتا ہے؟ تو بہت اختصار کے ساتھ صرف یہ کہنا ہے کہ رولاں بارتھ کا 'آئیڈیل' کسی حتمی/متعین مفہوم کا پیش کار نہیں ہے کہ اس کی نظر میں، کسی متن کو اس 'ہدایت' کی روشنی میں پڑھنا کہ 'انجام کار' اس معنی تک رسائی ہو جائے گی جس کی ترسیل کے لیے یہ تحریر وجود میں لائی گئی ہے، کارِ بے کاراں ہے۔ اس لیے کہ مآل، اخیر، انجام، تمت، انتہا، نتیجہ، تکمیل وغیرہ تو Exist ہی نہیں کرتے۔ اب ہمارے ہاں جس مائنڈ سیٹ کا راج ہے، اس میں 'باقاعدہ ابتدا' ہے اور 'باضابطہ انتہا' ہے۔ سو، اسی کے زیر اثر لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ ان حالات میں قرات کا وہ تجربہ جس میں قاری 'مسافر' سے 'سیاح' میں منقلب ہو جائے، کم کم ہی سوچا جا سکتا ہے۔ اگر خواندگی کے بعد کوئی یقینی سبق برآمد نہ ہو تو ہم اس تحریر کو بے معنی کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں۔۔۔ یہ الگ بات کہ اس روش مسلک کے علی الرغم 'ہم سب' کسی ایک ہی معنی/ نتیجے پر متفق نہیں ہو سکے۔۔۔ لہٰذا لکھت کی زیریں لہروں میں دراصل کچھ بھی نہیں ہے، ہم سے کب ہضم ہو سکتا ہے! ہماری اعلانیہ مقصدیت پرستی بھلا زبان کے چند کوڈز اور تہ در تہ Space اور مجرد قسم کی Conventions پر کہاں مطمئن ہو سکتی ہے! (تفصیل کے لیے دیکھیے، ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون: رولاں بارت کا فکری نظام) ہمیں تو مقاربت کا لازمی صلہ عترت کی صورت میں درکار ہے اس لیے ہر آن کی جداگانہ نشاط کے چکر میں پڑنا تو تضیع اوقات ہے۔ یوں کسی تحریر کو پڑھنے پر اکتفا کر جانا ہماری تربیت کا حصہ نہیں۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ صرف 'پڑھنا' ایسا وسیع عمل ہے؛ جس میں 'سب' شامل ہے کہ متن کے ساتھ سرمدی سنگت بہت ہی مختلف تجربہ ہے؛ پر ہم کہ ٹھیرے 'خوگر پیکر محسوس'! اس لیے یہ 'تجرید کاری' عبث فعل ہے۔ ہمارا تصور حیات چونکہ Utter Reality کو مرکزی حیثیت دینے پر اپنی بقا سمجھتا ہے، اس لیے بہت دشوار ہے کہ ہم تعبیر کی آزادی کو فرد کا بنیادی حق مان لیں۔ درآں حالے کہ اس میں فکرمندی والی کون سی بات ہے کہ Word of Man پر تو 'مطلق' لگ ہی نہیں سکتا۔ اگر بالفرض کھلے دل کے ساتھ دوسرے کو Inter pretation کا 'اختیار' دے دیا جائے گا تو کیا یہ اختیار اپنے آپ خود کو تفویض نہیں ہو جائے گا؟ ایک اور پرلطف بات یاد آئی کہ چلیے تخلیقی/ جمالیاتی تحریروں یا متون کے لیے تعبیروں کی گنجائش نکال بھی لی جائے تو کہا یہ جاتا ہے کہ غیر تخلیقی متن کو یہ Freedom نہیں دی جانی چاہیے وگرنہ آپ کا سماج کیسے کام کرے گا؟ سوشل فیبرک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا! تو عرض یہ ہے سب سے زیادہ غیر ادبی، غیر تخلیقی، غیر جمالیاتی متن تو آئین/ دستور کا ہوا کرتا ہے لیکن ہم دن رات دیکھ نہیں رہے کہ ایک ایک Clause/Sub clause کی تشریح پر قیل وقال ہو رہی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں پھر ذہن کچھ اسی طرح سوچنے لگتا ہے کہ سیدھے سادے معاملات نہیں ہیں۔ Complexity کارفرما ہے۔ آئین، قانون، سائنس، طب، سپورٹس، ریاضی۔۔۔ سب قواعد رکھتے ہیں، کہا یہی جاتا ہے کہ یہ Self Explanatory ہیں مگر اس کے باوصف کسی نہ کسی خاص درجے میں تشریح کی طلب سامنے آ کر ہی رہتی ہے۔ اس کے بعد وہ وقت بھی آتا ہے کہ آئین ہی نئی ترمیم کے ساتھ روبرو آ جاتا ہے۔ اس کائنات کا ہر ذرہ بھی تو Dynamic ہے، جب دمادم صدائے کن فیکون کی صدا پر اعتقاد ہے تو پھر ساتھ کے ساتھ نئی 'اصول سازی' بھی ہو رہی ہوگی! لیکن ہمیں آئین نو سے ڈر لگتا ہے، طرز کہن پہ اڑنا ہمارا مشغلہ ہے! سات جج ایک سال تک مقدمے کی سماعت کرتے ہیں: وہی مدعی، وہی مدعا علیہ، وہی وکیل، وہی گواہ، وہی شہادتیں، چار جج ملزم کو مجرم قرار دے کر سزائے موت سنا ڈالتے ہیں۔ تین باعزت بری ہونے کا فیصلہ نشر کر دیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ 'عدد' کی فتح ہے۔۔۔ اور 'عدد' کیا ہے؟ اگر اس نے اپنی رگوں میں جارحیت کا بارود بھر لیا ہے تو وہ سب انفجار کے ساتھ اڑا کے رکھ دے گا! اگر وہ نمانا ہے، قرۃ العین حیدر کے ''آخر شب کے ہمسفر'' کا عبدالقادر کو چوان ہے تو محکمہ مردم شماری کے لیے واقعی وہ صرف ایک عدد اور اہل سیاست کے لیے ایک ووٹ کی حیثیت رکھتا ہے!! مختصر یہ کہ رولاں بارتھ کا مہیا کردہ منہاج کم از کم اس باعث تو اپیلنگ ہے کہ یہ ٹیبوز کو توڑ سکتا ہے۔ مانا کہ عمرانی ٹیکسچر کو منہدم کر دینا دانائی کے منافی ہے لیکن یہ Sensibility اگر ذہنی انجماد کو عارضہ ہی نشان زد کر دے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اگر تحریر اپنی مکمل اکائی کے ساتھ بہجت نچھاور کرنے لگے تو کیا یہ کافی نہیں؟ آخری پردے کے رومان کو میری دانست میں اب رخصت سے محروم نہیں رکھنا چاہیے کہ اس تجسس نے مسافرت کی لذت کو بہت زک پہنچا دی ہے۔۔۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے الفاظ میں علمیاتی استبداد کسی دوسرے شعبہ علم کو اکلوتے، مستند ذریعے کے طور پر پیش کرنے سے سامنے آتا ہے۔۔۔ سو، سرچشمہ اکتشاف کے اجرا اور تعبیر کے تسلسل کو بھی آزمانا چاہیے! اس مقام پر اگر غالب کا شعر نہ سنایا گیا تو لطف ادھورا رہے گا:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

نفی اثبات کا چشمہ زار

ممتاز مفتی

(●)

آج سے ستاون سال پہلے جب مَیں نے پہلی کہانی لکھی تھی ، مجھے وضاحت سے معلوم تھا کہ کہانی کیا ہوتی ہے! اس کے لوازم کیا ہوتے ہیں! آج کوئی مجھ سے پوچھے کہ کہانی کیا ہوتی ہے؟ تو میں سوچ میں پڑ جاؤں گا! آج اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ آج زندگی کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ پچھلے پچاس سال میں ہماری ذہنی دنیا کہاں سے کہاں آ پہنچی ہے۔ ہمارے تخیلات بدل گئے ہیں، تصورات بدل گئے ہیں۔ Conceptions بدل گئے ہیں۔ اظہار کے انداز بدل گئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری ''مَیں'' بدل گئی ہے۔

دو شخص آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک، دوسرے سے کہہ رہا تھا: میری کلہاڑی، تمہاری کلہاڑی سے زیادہ پرانی ہے۔۔۔ کتنی پرانی ہے؟ اس نے پوچھا۔ بولا، بیس سال۔۔۔ پوچھنے والے نے پھر پوچھا: کتنی بار مرمت کرائی؟ کلہاڑی والے نے جواب دیا، صرف پانچ بار۔ تین بار دستہ بدلا، دو بار پھل۔۔۔ آج نئے نئے تخلیق کار میدانِ ادب میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے اندر خیالات کا ایک چھتہ بھڑوں کی طرح بھن بھن کر رہا ہے۔ وہ اظہار چاہتا ہے اور اظہار کا مقصد اندر لگی بھیڑ کو ہلکا کرنا ہے۔ گھٹن سے خود کو آزاد کرنا ہے۔

جمیل احمد عدیل آندھی کی طرح آیا اور چھا گیا۔ میں خوف زدہ ہو گیا کہ یہ سکندر کہاں سے آ گیا؟ اس کے ساتھ میرا تعلق صرف اس لیے پیدا ہوا ہے کہ یہ Talented ہے، مستقبل کا ستارا ہے اور مجھے حکم ہے Talent کی قدر کرو!

جمیل احمد عدیل بنیادی طور پر ایک فلسفی ہے۔ اس کے ذہن میں سوالات یوں پھُدک رہے ہیں جیسے برسات میں مینڈک۔ ''فلسفی'' ایک وقار بھرا لفظ ہے۔ وقار بھرے لفظ سچ کہتے نہیں چھپاتے ہیں۔ مطلب ہے سوچوں کا مارا ہوا عدیل، سوچوں کا مارا ہوا فرد ہے۔ سوچوں کا مارا ہوا ایک ''المیہ'' ہوتا ہے۔ عدیل دو آتشہ ہے۔ سوچوں کے ساتھ ساتھ اس کی حسیات میں بھی شدت ہے۔ سیانے کہتے ہیں دونوں میں شدت ہو تو انسان پھانسی پر لٹک جاتا ہے!!! سوچیں اور محسوسات دو سوکنیں ہوتی ہیں۔ دونوں میں ہر وقت ٹھنی رہتی ہے۔ عدیل کا بند بند پھانسی پر لٹکا رہتا ہے۔ اس تناؤ سے بچنے کا صرف ایک راستہ ہے۔ اظہار۔۔۔ اظہار۔۔۔ اظہار!!!

عدیل کے پاس مرکزی خیالات کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں تنوع ہے۔ وہ پٹے ہوئے راستے نہیں اپناتا۔ نئے راستے تلاش کرتا ہے۔ عدیل بسیار نویس ہے۔ لکھتا جاتا ہے، لکھتا جاتا ہے۔ یوں جیسے پیچھے پولیس لگی ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ کہانیوں کے دو مجموعے شایع کر چکا ہے اور تیسرے کی بیشتر کہانیاں فائل میں لگی ہوئی ہیں۔

میرے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے بریک پر پاؤں رکھا ہوا تھا۔ اب ایکسی لیٹر پر رکھ لیا ہے۔ بیچارے نوجوان دَرُت ناچ نا چنے پر مجبور ہیں۔ رفتار کی شدت کے ہاتھوں مظلوم ہیں۔ عدیل کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ بہت پڑھا ہوا ہے۔ پڑھ پڑھ کر ''گڑھ'' گیا ہے۔

عدیل سنجیدہ طبیعت کا مالک ہے۔ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ۔ اس کے پاس کہنے کے لیے بات ہے، تخیل فلسفیانہ ہے۔ انداز ہ Learned ہے، مقفیٰ عبارت لکھتا ہے، ہلکے پھُلکے لفظ کی نسبت Equivocate لفظ کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی Conceptions اونچی ہیں۔ تحریر over dignified ہے۔ عدیل میں تخلیقی قوت موجود ہے اور وہ کافی شدت والی ہے۔ ابھی عدیل کے دل میں یہ فکر گھن کی طرح لگا ہے کہ دل کی بات پوری طرح سے کہہ دے، کچھ رہ نہ جائے۔ اس لیے اس کا اسٹائل مشکل ہے، Involved ہے۔ ابھی وہ پڑھے لکھوں سے باتیں کر رہا ہے۔ دانشوروں سے محوِ گفتگو ہے۔

عدیل کا ایک قریبی دوست اشفاق احمد ورک جو آج کا جانا پہچانا اور کل کا بڑا مزاح نگار ہے، اپنی کتاب ''قلمی دشمنی'' میں عدیل کی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں لکھتا ہے:

''اسے دنیا میں سب سے زیادہ دلچسپی کتابوں سے ہے۔ عشق، محبوب، دنیا، دولت، آخرت، عزت، شہرت اور اقتدار سے بھی زیادہ۔۔۔ اتنی سی عمر میں جتنی کتابیں خرید چکا ہے، کسی غریب ملک نے اس قدر اسلحہ بھی نہیں خریدا ہوگا۔ کتابوں کا ایسا عشق سوار ہے کہ بازارِ حسن میں بھی جائے تو یہی پوچھتا ہے: ''کوئی نیا ایڈیشن آیا؟'' ذہن اتنا ہے کہ سیدھی سادی بات کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔ اس کے افسانوں کے مطالب محبوب کی زلفوں سے بھی زیادہ الجھے ہوئے ہیں۔۔۔ سمجھتا ہے کہ غالب کی عظمت کا مکمل راز اس کی مشکل پسندی ہی میں مضمر ہے۔''

عدیل کا دانشوروں سے محوِ گفتگو ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ ہر فنکار ابتدا میں اونچی باتیں کرتا ہے۔ پھر جب چالو ہو جاتا ہے تو مدھم پڑ جاتا ہے۔ دریا، پہاڑی دور میں اچھلتا کُودتا ہے۔ میدان میں آ کر شانت ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگ عدیل کو علامتی سمجھتے ہیں۔ مجھے ان سے اتفاق نہیں۔ کہانی کے بارے میں مَیں ''اظہاری'' ہوں۔ چاہے کیسی بھی لکھو، علامتی لکھو، تجریدی لکھو، یا روایتی لکھو۔ اگر پہنچ گئی تو پو بارہ، نہ پہنچی تو تین کانے۔ اس سلسلے میں مَیں نے ایک اصول بنا رکھا ہے:

کہانی سمجھ میں آ جائے تو اچھی
دل پر تاثر چھوڑے تو بہت اچھی
اور تاثر گھر لے جاؤ تو سبحان اللہ

مجسم ذہانت تخلیق کار

میرزا ادیب

(●)

یونیورسٹی کی مقرر کردہ کمیٹیوں کی کئی میٹنگوں میں بحث ہوئی، بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ یہ موضوع بہت پھیلا ہوا ہے۔ اس پر فیض صاحب کو پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت نہ دی جائے! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر موضوع پھیلا ہوا ہے تو اس سے کمیٹیوں کو کیا تعلق؟ یہ کام تو خود مقالہ نگار کا ہونا چاہیے کہ وہ موضوع کو سمیٹے اور موضوع سے متعلق اختصار سے کام لے یا اسے زیادہ نہ پھیلائے ____ ڈاکٹریٹ کا تھیسس، ایم۔اے کا تھیسس نہیں ہوتا۔ میں نے ایم۔اے کا ایک تھیسس دیکھا ہے جو ساڑھے پانچ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا موضوع ہے:

تقسیم کے بعد

اردو ادب میں خودنوشت سوانح عمری

مقالہ نگار ہیں، جمیل احمد عدیل؛ کمیٹیوں نے فیض صاحب کے تھیسس؛ جو ڈاکٹریٹ کا تھیسس ہے؛ اس پر موضوع کی وسعت کا کیوں اعتراض کیا؟____؟

دراصل کچھ مدت ہوئی، میں نے یونیورسٹی اورئینٹل کالج کے مذکورہ طالب علم کا تھیسس پڑھا تھا۔ یہ تحقیقی مقالہ کالج کے استاد ڈاکٹر تحسین فراقی کی زیرنگرانی لکھا گیا تھا اور انھی کی کرم فرمائی سے مجھے اس کے مطالعے کا موقع ملا تھا۔ یہ تھیسس جب میرے ہاتھوں میں آیا تو میرے ذہن میں فوری طور یہ سوال اٹھا کہ یہ تھیسس ایم۔اے کا ہے یا ڈاکٹریٹ کا؟ کیونکہ اول الذکر مقالہ زیادہ سے زیادہ تین سو صفحات کو محیط ہوتا ہے اور یہ ساڑھے پانچ سو صفحات کی حد سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ بہرحال میں اسے گھر لے آیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ پہلے تو مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ ایم۔اے کا تھیسس اس قدر ضخیم کیوں ہے اور اب جو ورق گردانی کی تو یہ محسوس کر کے مسرت انگیز حیرت یا حیرت انگیز مسرت ہوئی کہ طالب علم نے متعلقہ موضوع سے متعلق دستیاب مواد کی ژرف نگاہی سے چھان پھٹک کی تھی اور اس جرأت سے بھی کام لیا تھا جو تحقیقی معاملات میں بہت ضروری ہے۔ متذکرہ دستاویز پڑھنے کے بعد میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ جس طالب علم نے یہ تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا ہے وہ اپنے عظیم تدریسی ادارے کی نیک نامی برقرار رکھنے میں ضرور کام کرے گا۔ بشرطیکہ اس نے تخلیقی کام کی طرف خصوصی توجہ دی اور آج میں یہ دیکھ کر اپنے دل میں احساس خوشی پا رہا ہوں کہ میں نے اس طالب علم کے بارے میں جو سوچا تھا، وہ صحیح ثابت ہوا ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑا جامع، خوب صورت اور گراں قدر یہ تحقیقی و تنقیدی کام اس وقت میرے سامنے پڑا ہے جبکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ سامنے نہیں آنکھوں سے ہوتا ہوا دل میں اتر گیا ہے!

یہ تھیسس مجھے اس بنا پر بہت عزیز ہے کہ اسے ایک ایسے مجسم ذہانت طالب علم نے لکھا ہے جسے میں اپنا روحانی بیٹا تصور کرتا ہوں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں عدیل نے اپنے موضوع سے پورا عدل کیا ہے! بلاشبہ نوعمر مقالہ نگار نے اسے بڑی محنت، تفکر اور ژرف بینی سے لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تھیسس ابھی تو الماریوں میں گوشہ نشین ہے مگر جب یہ اپنی خلوت گاہ سے نکل کر منظر عام پر آئے گا تو ایک ہنگامہ خیز کارنامہ ثابت ہوگا! اسے کتابی صورت میں شایع ہونا چاہیے تا کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو کہ اعلا درجے کا تھیسس تحقیق اور تنقید کا کیسا معیار سامنے لاتا ہے۔ میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب یہ اشاعت پذیر ہوگا! یہ مختصر اور بہت مختصر تحریر محض رسید کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے توقع نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ جمیل احمد عدیل اردو ادب کے لیے جمیل بھی ہوگا اور عدیل بھی! اس نوجوان کا مستقبل بہت تابناک ہے! ولی نہیں ہوں، بادہ خوار بھی نہیں ہوں، بات سچ ہوگی!!

بے خواب جزیروں کا سفر

جمیل احمد عدیل کے فن کی اور تیکنیلیٹی نے مجھے متاثر کیا، ماہنامہ ’’علامت‘‘ میں مطبوعہ ان کے ایک افسانے: ’’شام کے شیشے میں کانپتا بوڑھا‘‘ کے اچھوتے پن کی میں نے اپنے دوست اجمل کمال (مدیر ’آج‘) سے خاص طور پر تعریف کی تھی۔ میں عدیل کے فن کی قدر کرتا ہوں۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر ان کے اسلوب کی ندرت، تازگی اور نئے پن کا احساس ہوا اور وہ مجھے معاشرے کے ایسے کلوز اپ، فوٹوگرافوں کے مثل لگیں جن میں ہر خط و خال واضح اور تیکھا ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں ابھارے گئے نقوش اور زاویے ذہن سے جلد محو ہونے والے نہیں۔ جمیل احمد عدیل یہ بھی جانتے ہیں کہ اختصار ذکاوت کی جان ہے اور اس راز سے بھی آگاہ ہیں کہ اصل گُر (Trick) کہی میں نہیں ان کہی میں نہاں ہے ____ عدیل کا مشاہدہ بے رحم، انوکھا اور چونکا دینے والا ہے۔ ان کے افسانے بیگانگی کے ڈسے اس عہد کے سماجی اور روحانی مرقعے ہیں۔ اس ناپرساں سیارے پر بسنے والے فرد کی ازلی تنہائی اور بے کسی کے آئینہ دار ہیں اور یہی ان کی بنیادی تھیم (Theme) ہے۔ میری نظر میں جمیل احمد عدیل کا افسانہ سنگل آدمی کی دشا (Predicament) ہے!!

محمد خالد اختر

نقشِ تنقید

نسیم سحر
(راولپنڈی)

پروفیسر جمیل احمد عدیل عہدِ جدید کی ادبی کائنات میں اپنی ہمہ جہتی تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی جہات کے ساتھ حیرت انگیز حد تک تیزی اور کامیابی کے ساتھ اپنا مقام بنانے میں یوں کامیاب رہے ہیں کہ اب ان جہات کا کوئی تذکرہ بھی اُن کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ان کی تحریر اپنے لفظیات کے انفرادی رنگ سے نہ صرف ایک الگ ذائقہ دیتی ہے بلکہ ان کی فکر وخیال کی وسعت بھی اُس میں ایک جُدا رنگ بھر دیتی ہے۔کسی بھی تحریر سے اس کے لکھنے والے تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا،مگر جمیل احمد عدیل کی تحریر خود اعلان کر رہی ہوتی ہے کہ وہ جمیل احمد عدیل کی تخلیق ہے۔یہ سلیقہ اور قرینہ ہر قلمکار کے نصیب میں کہاں!

پروفیسر جمیل احمد عدیل کا تنقیدی اور تحقیقی رویّہ دیانتدارانہ سنجیدگی اور متوازن اندازِ بیان کا مظہر ہے۔ان کا نام محمد جمیل احمد ہے لیکن قلمی نام جمیل احمد عدیل ہی سے ان کی اصل پہچان ہے۔ان کا تخلیقی وفکری اظہار بطور خاص فکشن، تنقید اور نثری نظم کے میدان میں ہے، سچ پوچھیں تو کبھی کبھی اُن کے افسانے اور تنقیدی مضامین میں اُن کی خوبصورت اور مرصّع نثر نگاری پر بھی ایک نثری نظم کا سا گمان ہونے لگتا ہے۔تنقید، تحقیق اور تخلیق سے ہٹ کر کچھ دیگر موضوعات بھی اُن کی توجہ کا مرکز رہتے ہیں، اور اب تک متنوّع موضوعات پر ان کی تیس سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ان کی تحاریر کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی منتخب تخلیقات کا انگریزی اور پنجابی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جاچکا ہے۔

اس وقت اُن کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا خوبصورت مجموعہ ''اُردو افسانہ: نقشِ تنقید'' میرے سامنے ہے۔دوسو چوبیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب صریر پبلیکیشنز، لاہور کے زیرِ اہتمام روایتی گیٹ اپ کے ساتھ اور اچھے کاغذ پر ۲۰۲۰ء میں شائع ہوئی ہے کہ جمیل احمد عدیل جس طرح خود ایک شفاف اور خوبصورت شخصیت کے مالک ہیں ان کی کتاب کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔کتاب کا انتساب انہوں نے اپنے پیارے دوست ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کے نام کر کے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔معنی خیز سرورق کا تعلق بھی کتاب کے مشمولات کی ترجمانی کرتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر خالد سہیل نے افسانے کے بارے میں مختصر الفاظ میں اہم باتیں لکھی ہیں۔ڈاکٹر اقبال احمد آفاقی جیسے قدآور نقاد اور محمد حامد سراج مرحوم جیسے نامور افسانہ نگار کی افسانے کی صنف پر مختصر مگر خیال افروز تحریریں بھی شامل ہیں۔ڈاکٹر اقبال احمد آفاقی جمیل احمد عدیل کی تحریر کی اثر انگیزی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''مصنف کو اپنی پہنچ اور رسائی کے چھوٹے سے دائرے کے اندر رہ کر اثر انگیزی کے کرشمے دکھانے پڑتے ہیں''۔حامد سراج مرحوم جیسے بڑے افسانہ نگار نے ان کی افسانہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''افسانے کی دنیا بہت عجیب وغریب ہے، یہ انسان کا پورا وجود مانگتی ہے''۔ان دونوں مستند صاحبانِ قلم کی آراء سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔کتاب کے مصنّف جمیل احمد عدیل نے اپنے پیش لفظ میں لفظوں کے موتی پروتے ہوئے فکشن کی ارتقائی منزل کی سمت نمائی کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''فکشن کا عہدِ موجود تخلیقی زرخیزی سے تہی نہیں ہے۔نئی آوازوں کی گونج اپنی توانائی پر شاہدِ ناطق ہے''۔چنانچہ انہوں نے اسی تخلیقی زرخیزی کے اعتراف میں اُردو افسانے پر یہ مضامین لکھے ہیں۔ڈاکٹر شفیق آصف جیسے معروف قلمکار نے 'افسانے کی تنقید اور جمیل احمد عدیل' کے عنوان سے کیا خوب لکھا ہے کہ ''عدیل کا تخلیقی جہان بے پناہ وسعتوں کا حامل ہے۔ان کا سب سے بڑا حوالہ افسانہ نگاری ہے تاہم تنقید وتحقیق اور کالم نگاری کے میدان میں بھی وہ ایک الگ اسلوب رکھتے ہیں''۔

کتاب کے آغاز میں جمیل احمد عدیل نے فن اور روایت کے عنوانات سے اپنی دو تحریروں میں افسانے کی پوری تاریخ نہایت بلیغ اور تفصیلی انداز میں بیان کر دی ہے جسے افسانے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انتہائی اہم اور رہنُما قرار دیا جاسکتا ہے۔فنِ افسانہ نگاری پر بھی اور افسانے کی روایت پر بھی یہ تمام باتیں کسی بھی اُردو افسانہ نگار، نقاد اور محقق کے لیے اہم ہیں کہ اس میں اردو افسانے کی تنقید کے حوالے سے ماضی کے تقریباً تمام اہم تنقید نگاروں اور تمام ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے جبکہ اردو افسانے کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔'روایت' کے عنوان سے طویل تر مقالہ جمیل احمد عدیل کے نثری حسن کا عکّاس ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کی عمیق نظری اور موضوع پر گہرے مطالعے اور مکمل گرفت کی گواہی بھی دیتا ہے اور یہی گواہی ''آئینۂ تعبیر'' کے عنوان سے لکھے گئے ان کے پندرہ تنقیدی مضامین بھی دیتے ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں، اور جن میں ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کی دو کتابوں کے علاوہ محمد منشایاد مرحوم کی دو کتابوں پر مضامین بھی شامل ہیں۔جن دیگر افسانہ نگاروں کی کتب پر مصنف کے تنقیدی مضامین کتاب میں شامل ہیں ان میں ظفر اقبال ہاشمی، ڈاکٹر غافر شہزاد، محمد عاصم بٹ، ڈاکٹر امجد طفیل، محمد جاوید انور، نسیم سید، پرویز انجم، سیمیں کرن، دردانہ نوشین خان، منزّہ احتشام گوندل اور محمد جواد جیسے معروف افسانہ نگار شامل ہیں۔

کتاب میں دو مضامین دو قدآور افسانہ نگاروں کے افسانوں پر نہیں، بلکہ ان کی فن وشخصیت پر لکھی گئی کتابوں پر ہیں، ان میں سے ایک مضمون احمد اعجاز کی کتاب ''رشید امجد کے منتخب افسانے'' پر اور دوسرا مضمون اسلم سراج الدین کی کتاب ''محمد منشایاد، شخصیت اور فن'' پر ہے۔اس طرح جمیل احمد عدیل نے اپنی تنقیدی فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے افسانے کے ساتھ ساتھ اہم افسانہ نگاروں کے فن وشخصیت کا احاطہ بھی بہ طریقِ احسن کیا گیا ہے، جس سے ان کی یہ کتاب اُردو افسانہ نگاروں، محققین اور تنقید نگاروں کے ساتھ ساتھ طلبہ کی نصابی ضروریات کے لیے بھی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔

تخلیق بمقابلہ اظہار

ڈاکٹر افتخار الحق
(لاہور)

اردو میں پیراڈوکس کا ترجمہ قولِ محال ہی پڑھا ہے، گو کہ 'قرانِ تضاد' کی ترکیب میری رائے میں کہیں بہتر اصطلاح کے طور پر متعارف کرائی جاسکتی ہے۔ یہ تمہیدی جملہ اس لیے لکھا کہ شعروسخن کے بیشتر قارئین نثری نظم کا ذکر سنتے ہی بدکنے اور چیں بجبیں ہونے کا رویہ اپناتے ہیں۔ اس مقالچے میں کوشش کی جائے گی کہ اس متنازع موضوع کے لیے کچھ ممکنہ حل پیش ہوسکیں۔ شاعری کی تاریخ شعورِ انسان کے ارتقا کی تاریخ ہے۔ انسان نے جب اپنے ماحول سے تعامل کیا تو کسی نہ کسی شکل میں اسے آہنگ اور ربط کی متنوع صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ الہامی کتب کے مطابق انسان چونکہ افضل ترین مخلوق ہے؛ سو، اس نے دریافت شدہ آہنگی اشکال کی بازگشت اپنے شعور کے تخلیقی محکمے؛ جسے سائینسی زبان میں سیربرم کے بلند مراکز کہا جاتا ہے؛ کی مدد سے شاعری کی اولین اور شاید خام ترین کاوش کرنا شروع کی۔ اس طویل تدریجی عمل میں اب تک کے دریافت شدہ نقطہ معراج پر پابند شاعری کا ہاتھ تھامے آزاد نظم کھڑی 'ھل من مزید' کی گردان کر رہی ہے، جو مطلوبہ سماعتی اہداف تک کچھ کٹ کٹ کر، کچھ رک رک کر پہنچ رہی ہے۔

کوئی نصف صدی یا اس سے کچھ زائد عرصہ پہلے آزاد نظم نے روایتی شاعری کے گھرانے کو سلام کیا تو اس کے ساتھ کافی دیر تک بن بلائے مہمان یا خاندان کے سوتیلے فرد جیسا سلوک ہوتا رہا لیکن اب دیکھیں تو شعرا میں کون سا بڑا نام ہے، جس کے ساتھ اس صنفِ سخن کا قریبی رشتہ نہیں ہے؟ آزاد نظم کو قبول بہرحال اس لیے بھی کیا گیا کہ اس میں عروضی پابندی کا بالواسطہ ہی سہی، خیال تو رکھنا لازم ہے۔ اس میں باقاعدہ بحر اور کسی حد تک زمین، کی صورت کسی نہ کسی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے نثری نظم میں بحر و زمین کے عنقا ہونے کے سبب اسے شاید 'خلائی مخلوق نما' صنف گردانا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ کیا جانے والا سوالیہ اعتراض یہی ہے کہ یہ شجرِ سخن ہی کی شاخ ہے یا نثری میدان میں اگنے والا کوئی خود رو پودا؟ اب تک جن اصحابِ قلم نے اس صنف میں اپنے جوہر دکھائے ہیں ان کے مطابق یہ سو فیصد شاعری ہی کی تازہ ترین صنف ہے اور یہی بات دل کو لگتی بھی ہے کہ شاعری جامعیت کا موثر ترین منظوم اظہار ہے۔ نثری نظم کے شاعری ہونے کی قوی ترین دلیل یہی ہے کہ یہ کسی طویل مضمون، خطاب، مراسلے یا مقالے کی صورت میں ہونے کی بجائے ایسی سطور/مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے آپ محض تجربے کے طور پر کسی ایک کو مصرعِ طرح بنا کر پابند شعر کی شکل میں بھی ڈھال سکتے ہیں۔ تاہم اس سے زیادہ اہم پہلو اس نظم کے ہر مصرعے یا چند مصرعوں کی بطور اکائی جامعیت ہے۔ جمیل احمد عدیل صاحب کے تازہ ترین کلام میں سے کچھ نمونے پیش کر کے مزید وضاحت کی طرف آؤں گا:

جھولا

بھول جاؤ
تمھاری خواب گاہ
بندوق کی بیرل ہے
جس سے ہر صبح
تمھارے بدن کی بُلٹ فائر ہوتی ہے

گرمیِ بازار
فوڈ پوائنٹس پر منڈلاتے کیمرے اور مائیک
جیسے
بقالۂ قصاب کے آس پاس
مخلوقِ خاص

شکمی آنکھ کی شہوت بچی گئی

بازارِ عالم میں
سانس سے دعا تک
غیر مطبوعہ زیست کی جستجو

صداقت کا اکلوتا مخزن
نعرے کا ناگ ٹھہرا
عروضی طنابوں میں کسی گئی
زندگی کی شاعری میں
ایک رکن کی کمی بیشی بھی روا نہیں
کہیں شعرِ حیات
ساقط الوزن نہ ہو جائے

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ایسے مصرعے/سطور کسی شاعر کے لکھے لگتے ہیں یا کسی صاحبِ اسلوب نثر نگار کے؟ ظاہر ہے یہ شرطیہ انداز میں کہا جاسکتا ہے کہ صرف اور صرف کوئی شاعر ہی اتنے معنی خیز اور قاری کو کثرتِ قرات کے لیے مجبور کرنے کے حامل مصرعے لکھنے پر قادر ہے۔ یوں نثری نظم کو اصنافِ سخن میں شامل کرنے کی ایک اور دلیل مل گئی۔ پیش کردہ مصرعوں میں الفاظ کا معمولی ردوبدل کر کے دیکھیے کتنے مصرعے آپ کے تخیل کی آغوش میں گر کر خود کو طرح مصرع کی شکل میں اٹھانے پر اصرار کریں گے۔

اب ذرا انھی اقتباسات کی مناسبت سے کثرتِ معنی پر دھیان دیں تو کیا واقعی گنجینۂ معنی کا طلسم کدہ سامنے نہیں آجاتا؟ اقتباس نمبر: ایک، میں لفظ ''تم'' پر

ہی کچھ غور کرلیں تو کہاں کہاں دھیان نہیں جاتا، کون کون سے جہانِ معنی ذہن کی تفہیمی سکرین پر نمودار نہیں ہوتے! اقتباس نمبر: دو، میں ''بقالہ قصاب'' اور ''شکمی آنکھ'' جیسی پراسرار تراکیب وتماثیل پر غور کرتے ہوئے لامحالہ یک تفہیمی رویے سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ تیسرا اقتباس تو استعارے اور کنائے ہی پابند شاعری کے حوالے سے پیش کر رہا ہے، جیسے: ''عروضی طنابوں میں کسی گئی'' اور ''کہیں شعرِ حیات ساقط الوزن نہ ہوجائے!'' دراصل پیش کردہ تین امثلہ کے شعری اسلوب میں سب سے خاص اور نمایاں بات یہ ہے کہ یہ قاری کو سطور اور بین السّطور شستوں پر بیک وقت نظر مرتکز رکھنے پر مجبور کرتی ہیں اور یہی عنصر اس صنفِ سخن کا شاید جزوِ لازم بھی بن جائے! یوں دیکھیے تو نثری نظم میں کثرتِ معنی کا تقریباً ناگزیر حد تک وجود اور وہ بھی ایسے مربوط انداز میں جو اسے بہرصورت کسی بھی فکشن یا غیر فکشن طرزِ نثر سے بہت واضح حد تک ممتاز کرتا ہے، اس کے خانوادۂ سخن سے مضبوط رشتے پر دال ہے۔

اس مرحلے میں جمیل احمد عدیل کی چنیدہ نظموں کے حوالے سے تاثر کی قدرے تفصیلی صورت قارئین کی نذر کرنا چاہوں گا!

جبر وقدر کے مباحث جس قدر قدیم ہوتے جاتے ہیں ان کے گرداگرد طلسماتی تجسس کا دائرہ کبھی گھٹتا نظر آتا ہے تو کبھی غیر معمولی پھیلاؤ اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی فلسفہ خلاقی اذہان کے لیے ہر عہدِ ادب میں مہمیز بھی رہا ہے۔ 'سمارٹ سٹریٹیجی' کی ابتدا میں اسی بابت بہت طاقتور استعارے استعمال کر کے نظم کی عمارت آنے والی سطور میں کھڑی کی گئی ہے:

'نوشتے کے محاصرے سے نکال کر
تصرفِ ارادی کے ٹریننگ کیمپ میں
شفٹ کیا گیا ہے'

اگر صرف انھی سطور پر کچھ دیر خود کو مرتکز کریں تو سوائے نشاط انگیز تحیر کے کچھ اور کشید کرنا محال ہے! آگے مخلوق اور خالق کے رشتے کی گپھاؤں میں سفر کرتا شاعر کا تخیل، بہت ہاتھ پاؤں مار کر طنز کے کئی نگینے برآمد کر کے انھیں تخیل کے مرصع ساز کے حوالے کرتا ہے کہ ایسی مہم جوئی کا انجام صدیوں سے اسی گہر کی دستیابی پر منتج ہوتا آیا ہے۔ کبھی یہ جون ملٹن سے 'پیراڈائز لوسٹ' کا شہپارہ تخلیق کراتی ہے تو کبھی 'ڈیوائن کامیڈی' اور 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' جیسے امر شہکار لکھواتی ہے۔

جمیل احمد عدیل کی متذکرہ نظم میں کہیں تو گمان ہوتا ہے کہ 'تصرفِ ارادی کے کیمپ' سے نظم کا مرکزی کردار کہیں نازیوں کے 'کنسنٹریشن کیمپ' میں تو نہیں جا نکلے گا؟ پھر کچھ سطور پر ٹھٹھک کر یہ خدشہ سا ابھرتا ہے کہ شاید 'تخلیقِ کائنات کا مجرم' کسی 'فرینکنسٹائن' سے محاذ آرا تو نہیں ہونے لگا؟ لیکن تمام تر توقعات وتوہمات سے رستہ بناتے ہوئے ایک بار پھر جبر کی جیت کا کڑوا گھونٹ، قاری کو کم از کم حلق تر کرتا ضرور محسوس ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس نظم کی یہ ممکنہ تفہیم اپنے متوازی کم سے کم تین چار اور تفاہیم کے علاوہ ہے کہ علاماتی اظہار کے ساتھ لامتناہی پن پیوستہ وابستہ رہتا ہے۔ باقی سائنسی اصطلاحات کو سخن کے سانچے میں لے جا کر اپنی مرضی کے تشکیلی تجربے کرنا بے حد مہارت کا طالب ہوتا ہے اور جمیل صاحب کی مذکورہ نظم اس مہارت کی تازہ ترین امثلہ میں شماری جائے گی۔

اسی طرح: ''شاید ہماری ملاقات نہ ہو پائے!'' کمال نظم ہے جو طویل ہوتے ہوئے بھی لگتا ہے چند سطروں کے بعد یکلخت ختم ہوگئی! ___ انجانے، انہونے، ممکنات وخدشات کا پیہم خوف ایسی ہی تخلیقات کو جنم دیتا ہے۔ جہاں روانی میں 'فیسی نیٹ' اور 'آرکی ٹائپ' جیسے انگریزی الفاظ نظم کے سانچے میں کسی ازخود میکانیت کے زیر اثر بآسانی سماتے چلے جاتے ہیں؛ وہیں قرص جیسا تقریباً متروک، اردو زبان کا لفظ اور آبِ وظیفہ جیسی ترکیب؛ قاری پر اضافی سحر طاری کرتی ہے۔ خوف کی معراج پانی اور مٹی کے ملن سے تشکیل دینے والے بیانیے پر دکھائی دیتی ہے، جہاں لطافت اور کثافت کو شاعر نے اتھاہ معنوی گہرائیاں عطا کی ہیں! شدید حزن کے ساتھ لامحالہ پشیمانی کا انسلاک ہوتا ہے اور شاعر نے خاصی قوتِ ارادی صرف کرتے ہوئے اس بالکل یقینی اتصال کو علامتی چٹانیں کھڑی کر کے روکا ہے، جس کا ثبوت اختتامی سطور میں ملتا ہے:

'سانس کی ڈور کٹ جانے سے
کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی'

ہائے! گویا تسلی بھی خود کلامی کی شکل میں! اور یہ کتنا مشکل امر ہے، اس کا اندازہ اس پائے کے شاعر کا حساس دل ہی کچھ لگا سکتا ہے:

'میں ایک روز چپکے سے منہا ہو گیا تھا'

یہ سطر اپنی جگہ خود اس مہا نظم کا مرکزہ بھی ہے اور ایک چھوٹی سی نظم بھی! تخیل میں سرایت کرتے وساوس کے کو برے کو کیسے رجائیت اور توجیہہ کی بین بجا کر شعریت کی پٹاری میں بند کرتے ہیں، اس کے ادراک کے لیے بھی یہی سطر بہت بڑی شارح ورہنما ہوگی۔

''گرمیِ بازار'' کیا خوب نظم ہے:

'شکمی آنکھ کی شہوت بیچی گئی'

کاروبارِ دنیا کے تمام لوازمات واجناس اس ایک سطر میں سما گئے ہیں!

اس مہا، جرعے کو جوفِ تخیل میں ذرا ساکن کرلوں تو آگے بڑھتا ہوں ___ دنیا واقعی ایک بازار ہے لیکن کیسے؟ طنزاً تو اسے نثر ونظم میں بارہا برتا گیا اور سادے، راست پیرائے میں نظیر اکبرآبادی جیسے کلاسک استاد نے تو ایک طویل نظم اسی موضوع پر لکھ دی تھی:

''دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے!''

لیکن چند صدیوں نے بازار کی تعریف، ہیئت اور معنوی وسعت میں برپا کیسے کیسے تغیرات دیکھے ہیں، وہ سب کچھ جمیل احمد عدیل کی اس شہکار نظم میں باقاعدہ محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ نظم کا ظاہری بیانیہ دنیا کو بازارِ حسن کے زاویے سے دیکھنے کی طرف مائل کرتا ہے لیکن جب بین السّطور شناوری کرتے ہوئے متن

کی گہرائیوں میں اتریں تو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کچھ اور آلات ساتھ ہوتے تو مشاہدے کا حق ادا ہوتا۔ تاہم درونِ متن ایک پھسلواں فرش پر قدم جمانے کی سعی میں توازن کھو کر سنبھلتے ہوئے کئی نایاب اشیا ہاتھ لگتی ہیں جن میں سے کچھ کو دیکھ کر کچھ یاد آنے کی سی کیفیت کا گمان ہوتا ہے۔

سانس، دعا، موسم، بوسے اور پرائس ٹیگ کی ٹہنیاں پکڑ کر جب مجھ سا ادنیٰ قاری غربت کی بلند ترین شاخ کو گرفت میں لیتا ہے تو اس پر معانی کا ایک ایسا دبستان اپنے در وا کرتا ہے جہاں سے صرف 'ھل من مزید' کی صدا اپنی زوردار گونج کے ساتھ استقبال کرتی ہے۔ خیر! یہ تو استقبالیہ ہے:

'اس کے سفوف سے تیار ہونے والا حرف
خطابت سکھاتا ہے
سلطان بناتا ہے'

ہائے ہائے ہائے! استقبالیے سے آگے اتنا مختصر ہال جس کی پیمائش کے لیے بہت طاقتور دوربین کی ضرورت ہے؛ پھر یہ طے کرنا کارِ محال ہے کہ شاعر سے کچھ مزید سطور کا تقاضا کریں تو، توجیہہ کیا ہو اور اگر اسی نظم کا سیکوئل/حصۂ دوم لکھنے کی فرمائش کریں تو تاویل کہاں سے لائیں؟

سو، پلٹ کر انھی آخری سطور کو ابتدا سے ملائیں تو بلا مبالغہ:

''ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا!''

کا سماں ملنے پر اپنی گزشتہ دونوں خواہشیں بالک کی ہٹ کی طرح لگتی ہیں جو راج ہٹ اور تریا ہٹ کی طرح محض ضد ہی کا درجہ رکھتی ہے۔

''معجزے کی میکینکس'' نظم میں ثنویت کے خیمے کو اساطیری طنابوں سے باندھتے ہوئے بڑی پیچیدہ گرہیں لگائی گئی ہیں جنھیں کھولنا اپنی جگہ سرور انگیز ہے۔ 'سیاہ پوٹلیوں' سے آغاز کر کے 'سب قالب کے طالب' پر امید افزا اختتام بہت ہی اچھا لگا:

'کہ انس کا لمس
خود صدائے قم ہے'
خوب است!

''سات قاشوں سے آراستہ رکابی'' بلاشبہ تہوں میں لپٹے متن کی خوب صورت اور قدرے جھنجھوڑنے والی نظم ہے! آنکھوں پہ بندھی پٹی کھل کر بھی شاذ ہی لوگوں کو عارضے اور عارضی کا فرق سمجھ میں آئے گا! نظم کی پہلی دو سطور دیکھیے:

'چھ دن آرمیدگی کی مشقت
ساتویں دن کام کی تعطیل'

کیا زبردست علامتی اسلوب ہے اور قول محال/پیراڈوکس کی جگہ سہلِ ممتنع برت کر ذو معنویت کی وسعت پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے!!

''جھکولا'' نظم میں حسبِ روایت وتوقع معنویت کی تہوں میں ملبوس متن جو ململ یا لان جیسے فیبرک سے ایسے بنا ہوا ہے جس کی سلائی اور استری دونوں ہی مشکل ہیں۔ تجریدیت کی تجسیم: بار بار کی قرات سے جمیل احمد عدیل صاحب کی اس نظم میں 'بھول جاؤ!' کے تخاطب کے بین السطور جانے کیوں یہی لکھا ہوا اور جلتا بجھتا نظر آتا ہے:

'سونے سے پہلے
تم اپنے وجود سے کیا اتارتے ہو
تم گوشت میں ملبوس اس ننگی فاحشہ کو اتارتے ہو'

کیا احتجاج اور طنز میں بجھے تیر ہیں جو ان سطور کی صورت فرد کے تخاطب کی آڑ میں معاشرے کے سینے کو ہدف بناتے ہیں۔

گوشت میں ملبوس ننگی فاحشہ: انسان دن بھر محنت کے نام پر کیا جمع کرتا ہے؟ فیض یاد آ گیا:

یہ گلیوں کے آوارہ بیکار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی

فیض صرف یاد ہی آیا کہ الفاظ اور ان کے معانی پر غور نے لامحالہ دھیان اس جانب کیا وگرنہ ہر دو نظموں کے تناظر، مضمون اور خیال میں بُعدِ مشرقین ہے۔

خیر! بات تھکے ہارے انسان کی ہو رہی ہے، اس انسان کی جو محض مادی احتیاجوں کی تسکین کے لیے اپنے بدن کو داؤ پر لگاتے ہوئے بھول جاتا ہے کہ دنیا بڑی عیاری سے تاش کے پتّے بدلتے ہوئے انسان کی روح اور ارفع افکار کی عبا چپکے سے اتار کر مادی وارذل اشیا کی دوڑ کا فحش لبادہ اوڑھا دیتی ہے اور انسان کو شاید تب پتا چلتا ہے جب عدیل صاحب جیسے مشاق شاعری کا دبیز مگر نہایت پیچیدہ عدسہ اس کے دل کی آنکھ پر زبردستی نصب کر کے اسے جھنجھوڑا جاتا ہے۔ حیف! کتنی گھٹیا کمائی ہے اور کیا پست درجے کی سودے بازی ہے جس کے لیے فاحشہ کا لفظ نہ برتا جائے تو کیا کیا جائے! کب اور کیوں کر انسانوں کی بڑی اکثریت افکار و ضروریاتِ عالیہ کے معطر مخملیں قبا کو اپنے بدن کے قلب کی زینت بنائے گی:

'اور تم
فوٹیج بنانے کی بجائے
یہ سوچنے لگے، کہ۔۔۔'
اختتام تک کی سطور میں 'عذرِ گناہ بدتر از گناہ' یا
'ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ' یا
'نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'

کی کیفیات کی جامع تر تفسیر کا درجہ رکھتی ہیں، بلا مبالغہ یہی جدید ترین لہجے کی نظم ہے!!

نظم: ''بائی پولر ڈلارڈ'' کے حوالے سے بس یہ کہنا ہے کہ جمیل احمد عدیل کی تخلیقات میں انوکھے، اچھوتے اور منفرد الفاظ و مشتق مصادر تو دست بستہ کھڑے ہی ہوتے ہیں لیکن ان کے متنوع معانی بھی سر بسجود ہونے کو تیار رہتے ہیں۔ ثنویت جس کی بنیاد پر کائنات قائم واستوار ہے، اسے بظاہر عصری منظر نامے سے

'بائی پولر ڈلارڈ' میں یوں منسلک کیا ہے کہ نظم کے متن کو آبِ حیات سا پلا دیا ہے۔ رنگوں اور نفسیاتی مرض کو اس باریکی سے باہم جوڑا ہے کہ متن سے بار بار تفہیم پھسلتی ہوئی بین السّطور خواں میں غوطے لگانے کا لطف لیتی ہے۔ زرد نارنجی اور کافور کی سفیدی کے ساتھ اجالوں کے مسائل جیسی گمبھیر علامتوں کے قفل کی کلید بار بار بدل کر بھی جھلاّہٹ ہونا محال ہے۔ 'بائی پولر ڈس آرڈر' سے 'بائنری کوڈ' تک کے جسرِ صراط کا سفر، کوئی کوئی قاری ہی ہوگا جو بنا ڈگمگائے جنتا / افسر شاہی کی منزل تک پہنچ پائے! مقتدرہ کی پہلی اور آخری مانگ ایک ہی ہوتی ہے: متناقضہ کی منہ زور حشر سامانی کو لگام ڈالنے والے وہ نورتن دستیاب رہیں جو ظلِ الٰہی کے متضاد بیانات پر بھی: 'حضور! ہم بھی یہی کہنے والے تھے!' کی تسبیح دست و زبان و قلب سے گرنے نہ دیں۔

بہت عمدہ نظم جس کے لیے داد کے الفاظ کی الگ سے قاموس مرتب کرنا ہوگی!

''ایک مثالیہ'' پڑھ کر زبان سے معاً یہ ادا ہوتا ہے: 'ہائے ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد!' وقت اور اس سے جڑا وجود و عدم کا قضیہ شعر و ادب کا سب سے بڑا لیکن اتنا ہی پیچیدہ موضوع ہے۔ جمیل احمد عدیل کا علامتی بیانیہ ایک مخصوص Crescendo کی سی صورت ابھرتا ہے اور توضیحی امکانات کی ایک گمبھیر کہکشاں تشکیل دیتا چلا جاتا ہے۔

قوسین میں کیا غضب کی بات لکھ دی:

''(دائروں کا اصولی مفاد بھی خطِ مستقیم سے وابستہ ہے)''

''امیدواروں کی کھوپڑیوں سے
بھیجے نکالے جا رہے ہیں
پانی سے دھو کر
دوبارہ ڈالے جا رہے ہیں''

بظاہر شعری کشش سے کچھ دور ان سطور کو بین السّطور پڑھ کر ہی معنوی جمالیاتی حس انگڑائیاں لینا شروع کرتی ہے:

''ایک ہی حکم
بس چکّر لگاؤ
حوض کے گرد
مسلسل
رکنے نہ پائے دولابی گردش
کہ
اعادہ ہی تنہا
دارالامان ہے۔۔۔
فریبی ندیا کے ساتھ مت چل پڑنا
زندگی کے ازلی راز سمیت
سدا کے لیے گم ہو جاؤ گے!''

اس ندیا کے خالق کی سادیت پسند فطرت/ Sadistic nature کس سہل کاری سے ان سطور میں سمیٹ کے رکھ دی گئی ہے!!

بطور خاص ان نظموں کی خواندگی کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ جمیل صاحب نظم، فکشن اور نان فکشن نثر کے میدان کے زبردست شہسوار ہیں! اپنے تخیل کی وسعت کو جانچنا اور پھر حسبِ ضرورت اس کے گرداگرد چار دیواری بنا کر اس میں سے مختلف حجم کے شہ پارے نکالنا ان کی پہچان ہے!

اب آتے ہیں اس پیش پا افتادہ اعتراض کی جانب کہ جو سمجھ میں ہی نہ آئے وہ بھلے شاعری ہو یا علامتی نثر ہمیں اس سے کیا لینا دینا! سو، جمہوری روایات کے مطابق تو ایسا استردادی رویہ بھی قابلِ قبول ہے لیکن یہ ذہن میں رکھنا بہت اہم ہے کہ انیسویں صدی کے مرزا غالب اور اکیسویں صدی کے شعرا کے قارئین کے درمیان شرح و تفہیم کی محض زمانی اکائیاں ہی حائل نہیں ہیں بلکہ اس دورانیے میں دنیا نے تاریخی، سماجی اور سائنسی حوالوں سے انسان کو جتنی طویل اور بلند زقندیں بھرتے دیکھا ہے، ان سے بننے والی خلیج کی گہرائی اور چوڑائی سے صرفِ نظر کرنا بھی مدافعانہ سا رویہ ہوگا۔

ایک بنیادی اور اہم بات شعر کی از سرِ نو تعریف کرنا یا طے شدہ تعریف میں توسیع و ترمیم کرنا بھی ہے۔ عروضی شاعری کے عدسے سے دیکھیں تو افاعیل، بحر اور زمین کا ایک خوبصورت مگر پیچیدہ جال شعر کی تعریف کو اپنی گرفت میں لیے دکھائی دیتا ہے۔ اس جال کو چھیڑے بغیر ہم شعر کے قالب تک رسائی کر کے دیکھیں تو منظر نامہ بدلنا شروع ہوتا ہے۔ الفاظ کے ساتھ بین السّطور کچھ ہیولے دکھائی دیتے ہیں جنھیں کچھ مزید قریب سے دیکھیں تو اظہاری جہات کی ایک کائنات بناتے نظر آتے ہیں۔ یہی ہیولے عروضی شکنجے سے نظریں چراتے ہوئے اور کسمساتے ہوئے وہ کچھ کہتے جاتے ہیں جن کی کچھ اشکال ابتدا میں پیش کردہ تین اقتباسات سے جھانکتی نظر آتی ہیں اور ایک معروضی طرزِ فکر کا قاری اور ناقد ان کے خدوخال دیکھتے ہوئے یہی کہتا ہے:

''تو قریب آ تجھے دیکھ لوں تو وہی ہے یا کوئی اور ہے؟''

شاید شعر اور روایتی شاعری کے بارے میں جو مروّج تصورات چلے آ رہے ہیں انھیں کچھ مزید باریکی سے دیکھنا ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں صدیوں سے رائج یا متصورہ تعریف پر مزید بات کرنا ہوگی۔ جمیل احمد عدیل اور معاصر شعرا، جن پر مفصل اور الگ سے بات ان شاءاللہ کسی اور تحریر میں کرنا زیادہ مناسب ہوگا، نثری نظم کے حوالے سے نہ صرف مستقبل میں رجحان ساز گردانے جائیں گے بلکہ اس سنگلاخ میدان میں ہراول دستوں کی قیادت کرتے دکھائی دیں گے۔ نثری نظم کے شعرا اس صنف کے حوالے سے شعر اور شعریت کی تعریفِ نو پر شعوری و لاشعوری طور پر جو کام کر رہے ہیں وہ روایتی شعرا، ناقدین اور قارئین کے ذوق و جستجوئے تحقیق کے لیے وافر سامان بہم کرے گا۔ اگر ہم چاہِ سخن کی کچھ مزید گہرائی میں جھانکتے ہوئے چند اور تجزیاتی کنکریاں ڈالیں تو شعریت کی تعریف، پہچان

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ کیجیے

سیاہ پہاڑ

(کوہِ اسود کا ساختیاتی مطالعہ)

سید تحسین حیدر گیلانی

(بورے والا)

فکشن کی جادوئی دنیا میں بعض اوقات اصل حقیقت کی جو مبہم تصویر ہمارے حواس خمسہ، ہمارے سامنے بناتے ہیں وہ بالعموم ناقص اور غلط ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے یا ایسا کیوں سوچا جاتا ہے؟ یہ سوالات اپنی جگہ اہم ہیں۔

فرانسس کرک نے اپنی کتاب The Astonishing Hypothesis میں ایک عمدہ بات لکھی ہے:

ہمارے دیکھنے کے عمل میں ایک " نظر نہ آنے والی جگہ " بھی ہوتی ہے جسے Blind Spot کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ایک مضمون: ''حقیقت اور فکشن'' میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔۔۔

وہ لکھتے ہیں:

''انسانی دماغ کا یہ وتیرہ ہے کہ وہ اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں اس 'نظر نہ آنے والی جگہ' کے اندھے سوراخ کو بھر دیتا ہے۔''

سیاہ پہاڑ جمیل احمد عدیل صاحب کے پہلے افسانوی مجموعے (موم کی مریم:۱۹۹۱ء) میں شامل تھا جسے میں نے ۱۹۹۶ء میں پڑھا۔ بطور کم سن قاری اس وقت میں اس فکشن کی غیر مرئی کھائیوں (نظر نہ آنے والی جگہ) Groves کو بھرنے کا متحمل نہ ہو سکا لیکن میں جہاں جہاں بھی گیا میں نے جسے بھی پڑھا اس متن کی موجودگی نے مجھے بھرے رکھا۔ اس پیٹرن کے دھاگوں اور ریشوں نے جو اس ساختیے کے پیٹرن کو ہمہ وقت تغیر پذیر کیے ہوئے ہیں، نے مجھے اس کی Structuring سے جوڑے رکھا، کچھ متن ایسے ہوتے ہیں جو سایے کی مانند آپ کے ساتھ چپک کر رہ جاتے ہیں۔ مسلسل تین سال سے وقت ملنے پر میں اس پر کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، لکھتا ہوں مٹا دیتا ہوں۔ ملاقات پر جمیل احمد عدیل صاحب نے بتایا کہ انہوں سے اس افسانے کو دوبارہ نئے نام کے ساتھ اپنے تازہ انتخاب میں شامل کیا ہے تو اس وقت میں خاموش رہا۔ دوبارہ متن سے ملا تو عنوان نے مجھے سب سے زیادہ ڈسٹرب کیا۔ فکشن میں اپنی پہلی محبت کو نئے نام کے ساتھ میں قبول نہیں کر پا رہا تھا۔۔۔ مصنف نے اپنا مصنفانہ اختیار استعمال کیا اور اسے نیا نام دے دیا جو میری نظر میں منصفانہ نہیں تھا۔۔۔ اب میں نے بطور قاری اپنا حق استعمال کرتے ہوئے اسے بطور ''سیاہ پہاڑ'' ہی سامنے رکھا ہے۔۔۔ خیر! ''کوہِ اسود'' پر بھی بات ہوگی۔

تو عرض ہے کہ نظر نہ آنے والی حقیقت illusion (فکشن) ہے۔ اسے سراب بھی کہا گیا اصل کا سایہ بھی۔ جیسے انسانی جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ، تو یہ اس کی ساختیہ نشان دہی نہیں، کوئی بھی متن/جسم صرف ڈھانچے سے مکمل نہیں ہوتا کہ ساختیہ صرف اپنے عناصر یا اجزا کی حاصل جمع کا نام نہیں، یہ روح کا حامل بھی ہے۔ ہر حاصل جمع کے عقب میں ایک ساخت یا سسٹم یا کوڈ (code) ہمہ وقت موجود ہوتا ہے۔

افسانے کے تجزیے کی جانب پیش قدمی سے پہلے اس کی مختصر نثری تلخیص مناسب رہے گی۔ ضمناً چند نکات اہم ہوں گے:

☆ افسانے کا منظر نامہ کسی عجیب دنیا سے مترشح ہے۔

☆ متن، زماں Time اور مکاں Space دونوں سے ماورا دکھائی دیتا ہے۔

☆ مصنف بار ہا اپنی ہی کہی بات کو رد کرتا ہے یوں بنت کاری کے عمل میں Deconstruction کا عمل جاری رہتا ہے۔

☆ سیاہ پہاڑ سے (کوہ اسود) تک کا سفر۔۔۔ یعنی عنوان کی تبدیلی نے سارے افسانے کو متاثر کیا ہے۔

☆ منظر نگاری نے متن میں جو مدلول Signified عکس دکھائے گئے ہیں وہ کہیں تجریدی ہو کر بھی ذہن پر منعکس ہوتی دھندلی تصاویر بناتے ضرور ہیں۔

☆ دوران قرات قاری خود سے بار بار سوال کرتا ہے، یہ کون سا جہان ہے، کون سی دنیا ہے؟

☆ غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے یہ دنیا تو جانی پہچانی دنیا ہے۔

☆ کیا یہ خواب کی دنیا ہے جہاں ہمہ وقت سٹرکچر بنتا اور مٹتا رہتا ہے؟

☆ پہلی قرات میں اس متن کا متحرک پیٹرن غیر شعوری طور پر ہزار پیکر تراشتا ہے جو ہمہ وقت صورتیں بدل رہے ہیں۔

بطور قاری مزید کئی سوالات میرے سامنے سر اٹھائے کھڑے ہیں:

کیا ایسا کوئی مقام دنیا میں موجود ہے؟

کیا ایسی دنیا کا وجود ممکن ہے؟

کیا یہ کوئی دیومالائی یا اساطیری دنیا سے ماخوذ دنیا ہے؟

کیا یہ کسی خواب کا منظر نامہ ہے جہاں ہمہ وقت منظر بدلتے ہیں، اگر ایسا ہے تو سچ کیا ہے اور فکشن کیا؟

کیا سیاہ پہاڑ علامت ہے؟ کس دنیا کی علامت؟

کیا اس متن کے سارے نشانات کنونشل ہیں؟

الفاظ کی تکلمی، املائی معنوی سماجی رسمیات Conventions کیا ہیں؟

اس متن کی شعریات Poetics کیا ہے؟ (واضح رہے صرف شاعری ہی شعریات سے مملو نہیں ہوتی نثر کی بلکہ علامتی نثر کی اپنی شعریات ہوتی ہے)۔

عرض کرتا چلوں شعریات دراصل ادب کی وہ تھیوری ہے جو صرف معانی کی تفہیم سے متعلق نہیں بلکہ کسی بھی ادب پارے میں لفظوں کے بہتے نظام سے معانی پیدا کرنے والے نظام تک رسائی کا اہتمام کرتی ہے۔ نوام چومسکی نے اسے Literary competence بھی کہا ہے۔ یعنی شعریات متن سے زیادہ متن

کی قرات سے دریافت کرنے پر یقین رکھتی ہے۔اس میں قاری بذریعہ قرات نہاں کو عیاں کرتا چلا جاتا ہے۔

اساطیری کوڈ:

اگر یہ افسانہ حالت خواب کا بیانیہ بھی سمجھا جائے تو کیا خواب حقیقی زندگی کی قاشوں سے مرتب نہیں ہوتے؟

خواب کی صورتیں جب حقیقی دنیاؤں میں شریک ہوئیں تو دنیا کی تنظیم ہوتی گئی۔موجود اور ماورا کے ملاپ سے نئی صورت تجسیم ہوئی ایک نئی کائنات مرتب ہوئی۔یوں ہی اساطیری دنیائیں منظم ہوکر کائنات کی تخلیق کی کہانیاں سناتی ہیں۔یہ سارا متن کسی اساطیری دنیا کے انتشار کی کہانی بھی لگتا ہے:

''درختوں کی شاخیں اس درہ کوہ میں اندھا اندھیرا کر رہی تھیں۔۔۔ چاروں جانب سر بفلک سیاہ پہاڑ، جیسے ان پر تارکول مل دی گئی ہو۔۔۔یوں لگتا تھا جیسے کالے پانی میں آگ ہے جو پتھروں کو پگھلا رہی ہے۔پانی غالباً پاتال میں بھی بہہ رہا تھا۔۔۔''

دیکھ سکتے ہیں یہ سارا منظر نامہ کسی دیومالائی اساطیری دنیا کا منظر پیش کر رہا ہے۔انتشار، بے ترتیبی بے ہیئتی سے جنم لیتا یہ سارا منظر نامہ کسی مصری دیومالا کے علاوہ یونان اور ہندوستان کی دیومالاؤں کے واضح نشانات دکھا رہا ہے، جیسا کہ مصر میں سیلاب کے بعد دریائے نیل کی بے ہیئتی بے ترتیبی کا منظر۔۔۔

منظر دیکھیں:

''سورج کی شعاعیں کالے پتھروں پر منعکس ہوتیں تو معکوس ہوکر سیاہ ہو جاتیں۔یوں لگتا تھا جیسے کالی کرنیں کالے پتھروں سے نکل رہی ہوں اور روشن شعاعوں سے نبرد آزما ہیں۔سیاہ شعاعیں بہت بلندی تک تو نہیں پہنچ پا رہی تھیں لیکن ہر سیاہ شعاع، روشن شعاع سے محو جنگ تھی جہاں سیاہ شعاع ختم ہوتی وہاں واضح طور پر روشن شعاع شروع ہوتی نظر آتی۔۔۔کچھ دیر کے بعد ایسا ہوا کہ کالی کرنیں جیت گئیں، روشن شعاعیں ہار گئیں تاریکی بڑھنے لگی۔۔۔''

اس سارے منظر نامے کی بے ترتیبی، بے ہیئتی ہمیں کئی انواع کے اساطیری ادوار میں جھانکنے پر مجبور کرتی ہے۔۔۔

کیا سورج یہاں دیوتا کی علامت ہے؟

سورج دیوتا جو روشن شعاعیں تقسیم کر رہا تھا لیکن اس کا مقابلہ اندھیرے سے تھا، ازلی سیاہی سے، جہالت سے۔۔۔

سیاہ شعاع، روشن شعاع سے محو جنگ تھی۔۔۔

(یعنی خیر اور شر کی ازلی جنگ)

اگر ہم یونانی دیومالا کی جانب دھیان دیں تو ایک نظر سمیریائی دیومالا پر ڈالنا ہوگی۔۔۔سمیریائی دیومالا میں تخلیق کائنات کا ذکر کسی ٹھوس صورت میں گو کہ موجود نہیں۔ہاں! لیکن کئی قاشوں اور ٹکڑوں میں منقسم ملتا ضرور ہے جو آپ کو بے نظم اور بے ترتیب نظر آئے گا۔جی ہاں! ہم اگر بابل کے اسطوری صفحات پر نظر ڈالیں تو ان کی ساری کڑیاں ٹھوس حالت میں موجود ہیں۔ یوں ہی یونانی دیومالا میں کائنات کی تخلیق سے متعلق واقعات مجھے کچھ منضبط نظر آتے ہیں۔

Men&HeroesGoods:D.H.W.Rouse میں لکھتے ہیں کہ:

''شروعات میں صرف خلا تھا جہاں ہر شے بے نام اور بے صورت انداز میں گردش کر رہی تھی پھر آہستہ آہستہ صورتیں بننے لگیں۔بوجھل اجزا زمین بن گئے اور ہلکے اجزا اوپر اٹھ کر آسمان سے متصل ہوئے۔آسمان پر سورج چاند ستارے چمکنے لگے۔صفحہ خاک پر ارض سمندر سے الگ ہوئی اور دریا بہنے لگے پھر خلا سے کچھ عجیب وغریب ہستیوں نے جنم لیا۔۔۔''

(سیاہ پہاڑ، افسانے کی آخری سطر دیکھیں: وہ بزرگ سفید کبوتر بن گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں پرواز کر گئے)

یاد رہے دیومالا کبھی حقائق کو اس طرح پیش نہیں کرتی جس طرح وہ ہیں۔دیومالا میں واقعے کی تفصیل بحیثیت' کل 'مثالی ہوتی ہے، یہ تمام تر اساطیری بیانیہ ہوتی ہے ان قصوں میں کوئی منطقی ربط نہیں ہوتا اور اہم بات یہ کہ دیومالا میں غالب عوامل ماورائے مادہ ہوتے ہیں۔ان کا سارا عمل (Action) انسان کی قدرت اور دائرۂ اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ایسے کردار اس افسانے میں نظر آئیں گے جیسا کہ بلی کا کردار، آگے جا کر ہم اس پر بھی بات کریں گے۔

بات ہو رہی تھی Men & Heroes Goods کی تو اس کا مصنف مزید لکھتا ہے:

''سب سے پہلے دھرتی پر Eros محبت نے جنم لیا پھر محبت کے وسیلے سے ہی کائنات ایک اکائی میں ڈھل گئی۔اس کے بعد خلا سے ہی کالی رات اور چٹے دن نے جنم لیا۔''

اب اس 'سیاہ پہاڑ' کی یہ سطور دیکھیں جو کالی رات کے جنم سے کڑیاں جوڑ رہا ہے:

''روشن شعاعیں ہار گئیں، تاریکی بڑھنے لگی، فضا پر سیاہ بادل چھا گئے، ان سیاہ بادلوں میں بجلی کی لہریں کبھی کبھار بل کھاتی نظر آتیں تو ایسا لگتا جیسے بادلوں میں آگ لگ گئی ہے۔''

اب اس افسانے کا مکمل بیانیہ اگر سامنے رکھا جائے تو بطور قاری اس کی ایک خوبی جو مجھے نظر آئی وہ یہ بھی ہے کہ اس متن Text نے مجھے بیک وقت کئی اساطیری اشارے دیے ہیں۔ممکن ہے کوئی اس متن سے سرسری گزر جائے جیسا کہ پہلی قرات پر میرے ساتھ ہوا لیکن یہ متن پہلی قرات میں بھی اپنے قاری کے ذہن پر کئی ایک سوالات کے نقوش چھوڑے گا اور سوچنے پر مجبور کرے گا چاہے وہ اسے صرف منظر نگاری سمجھے یا عام فہم سے بالا ایک کہانی۔اس کو یہ بستی یہ پہاڑ عجیب وغریب منظر ضرور دکھائیں گے جو کسی ان دیکھی دنیا کے مناظر ہیں۔

یاد رہے مکانی بعد Space Dimension ہر سرزمین اور قوم کی دیومالا میں تنوع پیدا کر دیتی ہے۔

ممکن ہے اس کہانی کی Decoding کے عمل میں میں جا بجا بھٹک جاؤں کیونکہ میرا دھیان Decoding سے زیادہ Recoding پر ہے کہ میں مستور علامتی معنی سے زیادہ ان دیکھے/ پس متن پر توجہ دے رہا ہوں۔

What is behind the text. I might wrong but its my try to show what I saw.

اس افسانے نے مجھے کئی دنیاؤں کی کھوج پر بھی مجبور کیا مجھے بیک وقت سمیریا/ آنو/ ان لل/ نینوا/ ای آنے/ ٹیمس / وشنو/ ویوموزی اور پرومیتھیس پر بھی ایک نظر ڈالنا پڑی۔

اس متن کی خوبی یہ ہے کہ بطور فکشن زبان اور موضوع کے بہاؤ نے جو تسلسل دکھایا ہے، تسلسل کا یہ احساس دراصل زماں کے بہاؤ کا احساس ہے۔ ہمارا دماغ دوران قرات ظاہر پر جب نظر غائر ڈالتا ہے تو وہ قربت اور تسلسل کے تحت لفظی دھاگوں کی دبازت پر نگاہیں مرکوز کرتا ہے یوں Anti-realism کی Detail گنجلک ہو کر اندر کے منطقے تک رسائی کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اب وہاں کیا مناظر ہیں:

اساطیری، ماورائی، مافوق یا حقیقی؟ اس کا تصور الگ کائنات ہے جسے علامتی کائنات کہتے ہیں جو رنگارنگ ہے۔

علامت/ نشانیاتی/ سمبالک کوڈز:

ساختیات کا معروف نقاد رولاں بارت کہتا ہے:

''ادب وہ ہے، ایسا متن جو معنی در معنی پس معنی نئے معنی سے ملواتا ہے جو طے شدہ معنی قاری تک نہیں پہنچاتا۔''

ہر علامتی متن اپنے کوڈز اینڈ کنوینشنز کے ساتھ موجود ہوتا ہے ہر نشان (Sign) ایک کوڈ ہے جسے ڈی کوڈ یا ری کوڈ کیا جاتا ہے۔ ہر نشان کسی حقیقی شے مظہر یا کیفیت کے ساتھ وارد ہوتا ہے۔ ساختیات ایک اہم کلیہ بھی سامنے لاتی ہے کہ بنا افتراق کے کوئی معنی ممکن نہیں۔ لسانی بحث میں ہاں! ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت، زبان کے اندر اور زبان کے وسیلے سے ہی تشکیل پاتی ہے گویا حقیقت کا جنم زبان کے اندر ہوا ہے جسے Decode کرنے کے لیے پڑھنا پڑتا ہے یوں ساختیات کہتی ہے حقیقت ایک متن (Text) ہے اور اس حقیقت میں خود انسان کی حقیقت بھی شامل ہے۔ جی ہاں! اب ہمیں آگے بڑھنے سے پہلے نشان اور علامت اور سمبل کی پہچان کرنا ہوگی۔ ہیگل نے بات کرتے ہوئے نشان اور علامت کے فرق کو یوں بیان کیا ہے:

"In symbol there is a direct relation between meaning and its vehicle, in sign by contrast there is no such relation."

یعنی نشان من مانا ہے، مگر علامت کسی نہ کسی منطق مشابہت یا قربت پر استوار ہوتی ہے اس طرح icon اور index ہیگل کے یہاں علامت ہوں گے۔

ایک نظر اس متن کے Signs اور Symbols پر ڈالتے ہیں۔

پہلے عنوان پر بات کرتے ہیں۔

سیاہ پہاڑ:

اس کا دال Signifier ہمیں جو مدلول Sgnified (عکس) دکھا رہا ہے وہ کسی کالے دیوقامت پہاڑ کا منظر ہے جو سراسر ہیبت کی علامت ہے۔ کسی دیو مالائی دنیا کا اشارہ کسی اماوس نگری سے قریب کوئی انوکھی مافوق کائنات کی جانب متوجہ کرتا ہے۔

واضح کرتا چلوں کہ سوسئیر نے دال اور مدلول کو لازم و ملزوم قرار تو دیا ہے لیکن ان میں جو رشتہ ہے وہ من مانا Arbitrary ہے۔

مزید وضاحت کرتا چلوں!

دال signifier کیا ہے؟ دال زبان کا مادی پہلو ہے۔

مدلول Signified کیا ہے؟ مدلول غیر مادی اور ذہنی روح ہے۔

لسانی تجزیے کی رو سے کوئی معنی (مدلول) لفظ دال کے بنا قائم نہیں ہوسکتا۔

کوہ اسود:

اس کا دال ہمیں جن متبرک خیالات سے جوڑتا ہے ان کو یہاں پرنٹ کریں تو ہمیں کوہ تو بطور پہاڑ نظر آتا ہے لیکن اسود نے اس کو کسی خاص عقیدے سے جوڑ کر اس کے معنی کو محدود کر دیا ہے بلاشبہ اس میں مصنف کی عقیدت در آئی ہوگی لیکن کیا متنی سطح پر اسود معنیاتی تفہیم میں کہیں بھی یہ اپنے آپ کو جسٹیفائی کر پا رہا ہے؟ دیکھنا یہ ہے:

عنوان ''سیاہ پہاڑ'' ہمیں کئی اطراف کی مناسبت سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

جبکہ ''کوہ اسود'' ہمیں کسی مذہبی نشان تک لے جا کر ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔

سیاہ پہاڑ = علامت Symbol

کوہ اسود = نشان Sign

متن میں مزید علامات دیکھتے ہیں:

سیاہ شعاع + شر + بدی + ابلیس = علامت

روشن شعاع + خیر + نیکی + خدا = علامت

کالی کرنوں کا روشن شعاعوں سے نبرد آزما ہونا۔۔۔

یعنی خیر اور شر کی جنگ کا منظر نامہ

لیکن اگلی سطر میں مصنف کا سیاہ شعاعوں کی لامحدودیت کو ایک لمحے کے لیے رد کرنا کہ،

سیاہ شعاعیں بہت بلندی تک تو نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔۔۔

یعنی متن آپ کو جا بجا Deconstructed ہوتا بھی دکھائی دے گا۔

اب شروع سے ذرا اس پورے منظر نامے کی جھلکیاں دیکھتے ہیں:

دن کا وقت ہے سورج کی حدت ناگوار ہے

'میں' (بیان کنندہ) ہے

'میں' تنگ گھاٹی میں جا نکلتا ہے وہاں اسے درختوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا ہے کہ یکا یک تنگ راستہ ختم ہو جاتا ہے ایک اور منظر کھلتا ہے۔۔۔چاروں جانب سیاہ پہاڑ جو آسمان تک اونچے جا رہے ہیں کالے یوں کہ جیسے ان پر تارکول مل دی گئی ہو یعنی خوف اور دہشت ناک فضا! عام دنیا سے ہٹ کر یہاں سارا منظر اس متن کو تشکیلی حقیقت Hyper Reality سے قریب کرتا ہے گو کہ یہ Symbolic Discourse ہے لیکن بغور جائزہ لینے پر اس کے Signified ہمیں حقیقت کے پیراڈوکس سے قریب کر رہے ہیں یعنی حقیقت ہے بھی اور نہیں بھی لیکن اس منظر کا اثر حقیقت سے زیادہ حقیقی دکھائی دے رہا ہے۔

آگے بڑھتے ہیں:

ان پہاڑوں پر ایک بھی درخت نہیں یعنی پہلا منظر کسی مانوس دنیا کا ہے جہاں درخت ہے پھر اچانک منظر بدل جاتا ہے Just like in dreams ننگے ویران چٹیل سیاہ پہاڑ خاموش، موت کے منہ کی طرح تاریک پہاڑ۔۔۔اگلا منظر ان پہاڑوں کے بیچ ایک دریا بہہ رہا تھا، کامل سیاہ پانی بظاہر رکا ہوا محسوس ہوتا لیکن اس کا پرسرار شور بتا رہا ہے پانی رواں ہے۔

سیاہ پہاڑ اور اس سیاہ وادی کی علامت یہاں سارے منظر نامے کے بعد مجھے کسی ملک کے سیاہ عسکری دور کی جانب بھی متوجہ کر رہی ہے ممکن ہے یہ متن مارشل لا دور میں لکھا گیا ہو۔ جو کتاب ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آئی ہے اس کا متن یقیناً اسی کی دہائی میں لکھا گیا ہے۔ شاید غیر ارادی طور پر اسی سیاہ دور کو پینٹ کیا گیا ہے۔ اگر متن کی ارضیت کا جائزہ لیں تو بنت سے تو یہ متن ارضیت سے ماورا دکھائی دے رہا ہے جس کا مبہم اور غیر واضح تصور قاری کو کئی طرح سے دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس تخلیق کو پرت در پرت کھولتے ہوئے مجھے کئی بار احساس ہوتا رہا کہ کسی بھی تخلیق میں مصنف کی دریافت بہت لازم ہے تا کہ تحریر کی وضاحت میں آسانیاں نصیب ہوں۔

علامت، نشان، سمبل۔۔۔افتراق کے حوالے سے یہاں مزید بات کرنا لازم ہوگا۔

عمومی نظریہ ہے کہ علامت کو ہی سمبل سمجھا جاتا ہے بلاشبہ ان کی سوچ اس حوالے سے درست ہے کہ علامت کی انگلش سمبل ہی ہے۔۔۔علامت کو سمبل کے ہم معنی قرار دینے والے اپنی جگہ درست یوں ہیں کہ صلیب کی علامت قاری کو ایک مخصوص معنی پر لے جا کر روک دیتی ہے جیسا کہ اسود کی علامت۔۔۔انہیں معروف علامتیں کہا جاتا ہے جو علامتیں تو ہیں لیکن ایک ہی معنی پر رک جانے کی وجہ سے کلیشے بن کر رہ گئی ہیں۔

یوں علامت، سمبل کے ہم معنی نہیں۔۔۔

سمبل ایک کثیر المعنی نظریہ ہے اور متن سے آزاد کلام تحریر یا جملہ ہے۔ یہ غیر ارادی طور پر خلق ہو کر کبھی کبھی مصنف کو بھی پریشان کرتا ہے۔ Actually یہ رویا Vision اور القا کی کیفیت میں خلق ہوتا ہے۔ یہ داخلی تجربات اور احساسات کے ذریعے غیر ارادی طور پر وجود میں آتا ہے۔

روبن اسکلٹن نے "یونگ اور آرکی ٹائپ" میں لکھا ہے:

''سمبل تخلیق کرتے وقت ہم ایک غیر فانی شے کو جنم دیتے ہیں۔ یہ فرد اور نسلوں کی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے لیکن یہ لازمانی کیفیت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب تک وہ کثیر المعنی ہو، جب علامت کو الیگری (محدود) علامت مان لیا جائے تو اس کی کوئی شعری اہمیت نہیں رہ جاتی۔ بہت سے سمبل کسی ایک مذہب کا عقیدہ بن کر شعوری طور پر زوالی علامت یا کلیشے بن کر رہ جاتے ہیں۔''

علامت کو مزید سمجھنے کے لیے چلیے چلتے چلتے ایک نظر اردو علامتی مباحث پر ڈالتے ہیں:

۱۹۸۴ء میں 'اوراق' کے شمارے میں علامتی افسانے پر بحث کا آغاز ہوا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے علامتی افسانے کو منفی رجحان کہا تو اردو کے جید ادبا نے اس مکالمے میں شرکت کی۔ جالبی صاحب کے جواب میں انتظار حسین صاحب نے لکھا:

''جالبی صاحب! یہ منفی رجحان کیا ہوتا ہے؟ یہ منفی عجب لفظ ہے! سیاسی اور قومی معاملات میں برسر اقتدار لوگ بھی اسے بہت استعمال کرتے ہیں اور ترقی پسند حضرات بھی کسی کو سولی پر چڑھانے کے لیے یہ ہی کہتے ہیں اس کا زندگی کے بارے میں منفی رویہ ہے۔''

ڈاکٹر انور سدید نے جواباً لکھا:

''اردو افسانے میں علامت کا استعمال اچانک شروع نہیں ہوا بلکہ علامتی افسانے کا شانہ روایتی افسانے کے ساتھ ملا ہوا ہے چنانچہ ساتویں دہائی سے قبل احمد علی (میرا کمرہ)، منٹو (پھندنے، ٹوبہ ٹیک سنگھ) عزیز احمد (مدن سینما اور صدیاں) اختر اورینوی (کینچلیاں اور بال جبریل) کرشن چندر (غالیچہ، سرائیلی تصویر) ممتاز شیریں (میگھ ملہار) زندہ علامتی افسانے لکھ کر ثابت کر چکے ہیں کہ حقیقت کی تہہ در تہہ کیفیتوں کو پیش کرنے کے لیے علامت ایک موثر وسیلہ ہے۔''

زاہدہ حنا بھی شریک_بحث ہوئیں:

''آج سے چالیس سال پہلے کی سیدھی سادھی کہانیوں کا طور اپنی استعمالی قدر کھو چکا ہے۔ وہ طور آج کے پیچیدہ مسائل کے اظہار کا اہل نہیں ہے جن سے آج کا ذہن دوچار ہے۔ یہ ہی وہ نقطہ ہے جہاں سے علامتی افسانے کی اہمیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔۔۔قصور علامتوں یا استعاروں کا نہیں انہیں برتنے والوں کا ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا:

''علامتی افسانے نے سائیکی کی گہرائیوں میں اتر کر کیفیات کو اور واردات کو مس کیا ہے اور یہ عمل گرائمر میں جکڑی ہوئی زبان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ علامتی افسانے کی زبان تخلیقیت کے دباؤ کے تحت معنی آفرینی کے عمل میں کامیاب ہوئی ہے بلکہ جدید علامتی افسانے کے باعث اردو زبان کی توسیع ہوئی ہے۔ علامتی افسانہ خود کو حقیقت سے منقطع نہیں کرتا تاہم وہ خود کو محض بالائی سطح

تک محدود نہیں رکھتا بلکہ علامتی افسانہ سدا شے یا کردار کو دوسری جانب کی پراسراریت کو مس کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے باعث افسانے میں معنی کے کئی نئے پرت پیدا ہو جاتے ہیں۔''

اس بحث نے علامت کو سمجھنے اور اردو افسانے میں اس کی بقا کے حوالے سے کئی اشارے فراہم کیے ہیں۔ جالبی صاحب شاید تجریدی عبارات کو علامتی کہہ کر نالاں ہو رہے ہیں۔ تجرباتی دور میں ایسا اکثر ہوا کہ دوست یار علامت اور تجرید میں تفریق کرنے سے قاصر رہے لیکن آہستہ آہستہ یہ قضیہ حل ہوتا گیا لیکن میں دیکھ رہا ہوں آج کی نئی نسل وہی غلطی دہرا رہی ہے اور تجرید اور علامت کو احباب الگ نہیں کر پاتے یوں علامت مہمل ہو کر قاری کو متنفر کرتی چلی جاتی ہے۔

سمبل کے وجود پر دلالت کرتے ہوئے اور سمبل کو رمز، کنایہ، اشارے (نشان، Sign) اور استعارے جیسی ریشنل ارادی ادبی صنعات سے جدا کرنے میں انیسویں صدی کے ماہرین نفسیات فرائیڈ، یونگ اور ایڈلر قابل ذکر ہیں۔

(اس متن کو سمجھنے کے لیے ان تمام نظریات و مباحث پر ایک نظر ڈالنا انتہائی ضروری سمجھتا ہوں کہ ان سب کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق اسی متن سے ہے)۔

مندرجہ بالا ان تینوں قابل ذکر ہستیوں نے ہمارے شعور اور خارجی احساسات کے نیچے لاشعور اور تحت الشعور کو دریافت کیا جہاں ہمارے ابتدائی اور آبائی اوصاف و خصائل، حرص و ہوس، شوق و خوف، کامیابی و محرومی کی ایک دنیا آباد ہے اور ایسی حالت میں تہذیب و تکلفات کا سنسر جسے فرائیڈ نے Super Ego کہا ہے، ہٹ جاتا ہے۔

یونگ کے مطابق یہ طراز البدی images کے طور پر، اور فرائیڈ کے مطابق جنسی سمبل کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر فہیم اعظمی کہتے ہیں کہ فرائیڈ نے اپنی تخلیق اور تجربے کی بنیاد پر سمبلز کی فہرست تیار کر کے اسے قدرے محدود کر دیا ہے۔ لیکن یونگ نے اس کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے۔

اس کوڈ کی مزید تفاصیل اگلے کوڈ میں ملیں گی۔

تشریحاتی کوڈ:

سیاہ پہاڑ کی علامتیں symbolic ہیں یا نشان اس ساری گفتگو کو مدنظر رکھ کر اس پر مزید بات کرتے ہیں۔ ابتدا میں عنوان سے متعلق بات ہو چکی اور چند متنی علامات بھی زیر غور رہیں وہیں سے آگے بڑھتے ہیں۔ منظر دیکھیں:

''پراسرار کالے پانی کا دریا ان کالے پہاڑوں کے بیچوں بیچ بہہ رہا ہے، بظاہر رکا ہوا لیکن پراسرار شور بتا رہا تھا کہ پانی رواں ہے یوں لگ رہا تھا جیسے کالے پانی میں آگ ہے جو پتھروں کو پگھلا رہی ہے۔ پانی پاتال میں بھی بہہ رہا تھا۔''

اب دیکھیں سارا منظر دکھانے کے بعد مصنف نے ایک نظارہ پاتال کا بھی دیکھا جسے اس نے فوراً قاری کو دکھایا، یعنی یہ منظر پاتال کے منظر سے کہیں جا کر جڑتا ہے؟ یا متن کی خوابنا کی صورت حال پر مہر لگانے کو یہ جملہ کہا گیا ہے۔

یہاں متن خود کو Deconstruct کرتا ہے یعنی مصنف خود کی اوپر کہی ساری بات کو ایک جملے میں رد کر کے قاری کو اگلے منظر سے جوڑتا ہے۔ اگلے منظر نامے میں روشن شعاعوں اور سیاہ شعاعوں کا تصادم پھر کالے بادلوں کی آمد پھر ایک بار دہشت ناک فضا کی ہولناک تاریکی کا بڑھ جانا، زور کی بارش ہونا! ایک اور حیرت ناک منظر سیاہ بارش سیاہ کوئلوں جیسی بارش پھر یکا یک بھونچال کا آنا اور غاروں کے منہ کھل جانا دیکھتے ہی دیکھتے چند انسان نما لوگوں کا غاروں سے نکل آنا۔۔۔ ان کے ہاتھوں میں تلواروں کا ہونا اور سب کا ایک دوسرے سے جنگ میں مصروف ہونا لیکن دوسرے ہاتھ کا فارغ ہونا اور دوسرے ہاتھ کا گرمجوشی سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں پیوست ہونا۔

یہاں میں قارئین کو ذرا دیر کو اپنے ساتھ روکوں گا یہ سارا منظر اور اس کی علامتیں/ نشانات/ سمبلز مجھے مابعد نوآبادیاتی دور کی جھلکیاں دکھا رہے ہیں۔ سفید مائیتھولوجی کو رد کرتے ہوئے یہاں مصنف بالخصوص تیسری دنیا کا منظر نامہ دکھا رہا ہے جہاں ملک و ملت کا ہر فرد ایک دوسرے سے ذہنی سماجی معاشرتی جنگ میں مبتلا ہے لیکن بظاہر وہ سب شیر و شکر ہیں۔ سیاسی عسکری طاقتیں اپنی طاقت کے بھونچال سے ان کو تباہ کر رہی ہیں لیکن یہ پراسرار گروہ عجیب و غریب مبارزت میں مصروف ہے جیسے افریقی ادب میں سیاہ فام ادب کی روایت کے اندر رہتے ہوئے اس کی آواز کو سنا جا سکتا ہے۔ ہم اس علامتی متن میں نئے مطالب کی کھوج کے دوران اپنی دھرتی کے سیاسی، سماجی، عسکری، مذہبی، معاشرتی کوڈز بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ کسی علامت کا سمبالک ہونا اسے ہی کہا گیا ہے کہ بیک وقت آپ اساطیری اور مابعد نوآبادیاتی مناظر سے ملاقات کا شرف حاصل کریں۔ یہ منظر دیکھیں:

''انہوں نے بہت عمدہ لباس زیب تن کر رکھے تھے۔۔۔ سیاہ گاؤن بھی پہن رکھے تھے ان کے تلواروں والے ہاتھ مسلسل چل رہے تھے۔ غور کیا تو معلوم ہوا وہ تلواریں نہیں زبانیں تھیں جو منہ سے نکل کر ان کے ہاتھوں میں آ گئی تھیں ان زبانوں کا رنگ بھی سیاہ تھا۔''

یہاں منظر نامہ ایک بار پھر اوپر کے منظر نامے کو رد کر رہا ہے اسے مابعد جدیدیت میں رد تخلیق/ رد تشکیل یا ضد ہیئت Anti form کہا گیا ہے جو خود ایک تضاد ہے۔

یہاں جبکہ متن بار بار Deconstruct ہو رہا ہے یہ متن ادغام و انضمام سے قریب ہو کر بیک وقت Synthesis اور Anti thesis کا نمونہ دکھائی دے رہا ہے۔ اس متن کے master codes کسی ایک سمت یا ثقافت یا علاقے کے نمائندہ نہیں لگ رہے۔ یہ بیک وقت عالمی تناظر میں بھی کثیر الشکل دکھائی دے رہے ہیں۔

Symbol کیسے realism کا عکاس ہو سکتا ہے، یہ متن اس کی عمدہ مثال ہے کہ مصنف ہمیں اساطیری دنیا کی سیر کرانے کے بعد نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی دنیاؤں کی جھلکیاں بھی واضح طور پر دکھا رہا ہے۔ مزید دیکھیں:

''دھندلکے کی وجہ سے ان کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔۔۔

کالے بادلوں میں بجلی کی کڑک پیدا ہوئی تو چہروں کو دیکھا مجھے ہر کسی کے سر پر نہایت عمدہ دستار نظر آئی۔۔۔اچانک ایک تلوار نما زبان ایک شخص کی 'دستار فضلیت' سے ٹکرائی تو اس کی دستار نیچے گر پڑی۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اس دستار کے نیچے سر ہی نہیں تھا! جس کی تلوار سے اس کی دستار گری تھی اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کی دستار اٹھائی اور اس کے سر کی جگہ پر رکھ دی اور اسی کے ساتھ دوبارہ لڑائی میں مصروف ہو گیا۔''

دستار کی علامت نے یہاں ایک بار پھر علامت کو محدود کر دیا ہے لیکن تلواروں کا زبانیں بن جانا اس کا Signified گو کہ پہلے نظارے میں مجرد ہے لیکن اپنے مفاہیم کو واضح کر رہا ہے اور متن کی خوابناک حالت کی مزید تصدیق کر رہا ہے۔ یہاں اگر میں اس متن کو Art object کہوں تو اس کی معنویت کے ڈانڈے ڈاڈاازم سے جا ملیں گے جس کی تفصیل کا محل نہیں، یہ خوبی ہے اس متن کی کہ تمام تر علامتی اسباب کے باوجود معنی کی openness حیران کن ہے یا شاید یہ متن مجھ پر میری پہلی محبت کی طرح منکشف ہو کر تحیر زدہ کیے ہوئے ہے!!

تلوار کا زبان بننا= یعنی زبان ہی تلوار کی مانند ایک دوسرے کو ضرب لگا رہی ہے۔منافقت/ بدکلامی/ بدتہذیبی کا سمبل (آج کے شعرا کا سمبل بھی ممکن ہے)

دستار فضیلت کے نیچے سر کا نہ ہونا= مذہبی پیشواؤں کے کھوکھلے پن/ بے عمل علم/ جاہل کا عالم ہونا/ جھوٹی دینی شخصیات کا سمبل (یہ سمبل آج کے شعری پیشواؤں کو بھی Represent کر سکتا ہے)

دستار کا اٹھانا اور دوبارہ سر پر رکھ کر لڑائی میں مصروف ہونا= کسی سماج کی گراوٹ کی انتہا/ جہلا میں معاشرے کا کفیل ہونا/ معلوم ہونے پر بھی آنکھیں میچ لینا/ انتہائے منافقت اگلا پیراگراف دیکھتے ہیں:

''زبانوں کی تلواریں چلتی رہیں اور دوسرے ہاتھ گرمجوشی سے ملے رہے۔ مجھے اس دشمنی نما دوستی اور دوستی نما دشمنی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔آخر یہ تضاد کیوں تھا؟ وہ لوگ کون تھے؟ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔''

اب دیکھیں اس حصے میں زبانوں کی تلواروں کا چلنا اور دوسرے ہاتھ کا گرمجوشی سے ملنا کسی خاص معاشرے کی منافقت اور دنیا کی بدلتی صورت حال کو دکھا رہا ہے جہاں ہر انسان ایک دوسرے سے مل بھی رہا ہے اور جڑیں بھی کاٹ رہا ہے۔

اصلا یہ متن Pattern Oriented سٹرکچر سے قریب تر ہے۔ یہ ایک ایسی دھرتی کے سٹرکچر کو رائج دکھا رہا ہے جہاں حقیقت وہ نہیں ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔اصلاً یہ ایسی بستی کا منظر نامہ ہے جہاں تعصب بھرے دلوں کا راج ہے، دکھاوا بناوٹ جن کے رہن سہن کا حصہ بن چکا ہے۔وہ اس تضاد کو سمجھ نہیں پا رہا کیا وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہے یا حالت خواب میں وہ خود سے یہ سوال پوچھ رہا ہے؟

آگے بڑھتے ہیں بدلتے مناظر کیا دکھا رہے ہیں:

آگے منظر نامے میں بجلی چمکنے پر دکھائی دیتا ہے کہ وہ گروہ بھی آگے بڑھ رہا ہے سب کے چہرے مسخ ہو چکے ہیں پھر یکا یک نظر آتا ہے کہ سب کے چہرے سرخ ہو چکے ہیں آنکھوں سے خون بہہ رہا ہے سب زبانیں روک کر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کسی سفید لباس میں ملبوس شخص پر متوشش ہیں جوان سا نہیں ہے۔وہ عمر رسیدہ شخص اطمینان سے کھڑا ان کے درمیان مسکرا رہا ہے وہ ان کی تیز نوک دار خوف ناک زبانوں سے بالکل خوف زدہ نہیں ہے وہ یہاں (خیر کا سمبل) ہے۔ سب اس کو اپنے جیسا بنانا چاہتے ہیں، جملہ کردار پروٹو ٹائپ کی اساس پر استوار ہوتا ہے۔اس کردار کی وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں پنجر Skeleton کی ہے ___ وہ بے ریش نورانی بزرگ (ممکن ہے کسی خاص عقیدے کا سمبل ہو) لیکن میں اسے مخصوص نہیں کرنا چاہتا۔خدا، اوتار، دیوتا کوئی بھی روپ دھارن کر کے خیر کے سمبل کے طور پر اپنی بات کہنے دھرتی پر آ سکتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے پروٹو ٹائپ کردار دنیائے فکشن میں اپنی صفات کے ساتھ اپنی پہچان بناتے نظر آتے ہیں۔مثلاً خوجی کا بونا پن، ٹریزر آئی لینڈ کے لانگ جان سلور کا لنگڑا پن یا حاتم طائی کی سخاوت یہ سب کردار اپنی غیر معمولی صفات کی بدولت چونکا دینے والے ہیں۔ یوں ہی اس شخص کو بے ریش نورانی بزرگ دکھا کر دستار فضلیت والوں کے درمیان فضیلت دیتے ہوئے مصنف اور کئی مسائل کی جانب متوجہ کر رہا لیکن ہمیں اس پیٹرن کے کردار کو بطور بند نظام Closed System پرکھنا مقصود ہے جہاں یہ عمر رسیدہ بزرگ شر کے درمیان ایک خود کار اکائی Autonomous Whole کے طور پر نمودار ہوا ہے۔ ہر دور میں ہر معاشرے میں ایسے کردار جنم لیتے ہیں جنہیں بدتہذیب معاشرہ کہتا ہے تم ہم جیسے نہیں ہو! بائبل/ قران/ وید/ گرنتھ/ صحیفے ایسے کرداروں سے بھرے پڑے ہیں۔ چاہے وہ: نوح ہوں، یحییٰ، زکریا، صالح، یوسف، موسیٰ، عیسیٰ . ابراھیم یا محمد مصطفیٰ۔ ان بگڑے چہرے والوں نے ہمیشہ ان بزرگوں کو معتوب کرنے کی کوشش کی اور ان کے پیغام کے جواب میں ہمیشہ کہا گیا: ''اگر تم اپنا چہرہ بگاڑ کر ہم میں آن ملو تو ہم تمہیں اپنا سربراہ بنا لیں گے۔''

ان سے ہٹ کر بھی کئی ہستیاں انسانوں میں موجود رہیں جنہوں نے خود کو الگ کر کے ان بگڑے چہرے والوں کو اگر خیر کا پیغام دیا تو ان کے گرد گھیرا تنگ ہوا بھلے ہی وہ: زرتشت ہو، بدھ، ارشمیدس، سقراط، ارسطو یا افلاطون۔ ایسی خلاق ہستیاں بھی اپنے دور میں ان بے رحم انسانوں کے عتاب کا شکار رہیں۔

اگلا منظر:

''بے ریش نورانی بزرگ بولا: تم سب تو ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو، صرف مجھے تم معتوب کر رہے ہو؟ ان میں سے ایک نے جواب دیا: ہاں! ہم سب ایک دوسرے کے دشمن ہیں لیکن دوست بھی ہیں (مابعد جدید دور کی ایک جھلک) کیونکہ ہم سب ایک جیسے ہیں، ہم سب کے چہرے مسخ ہو چکے، ہمارے وجود انسانوں کے سے نہیں رہے مگر ہم انسان ہیں۔ یہ دیکھو! ان میں سے ایک نے اپنی قبا اٹھائی تو میں نے دیکھا اس کے باریک قیمتی لباس میں عجیب الخلقت جسم تھا۔''

(یہاں متن خود کو ایک بار پھر Deconstruct کر رہا ہے، یوں لگ

رہا ہے جیسے یہ کوئی ایسی قوم ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہو چکا ہے اور یہ سب اس کی باقیات ہیں)

''اپنی قبا کو درست کرتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی ہم سب اپنی انسانی شناخت کھو چکے ہیں، اس لیے درست ہاتھ پاؤں والے انسانوں سے ہمیں نفرت ہوگئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو انسان کہتے ہیں حالانکہ صحیح انسان ہم ہیں۔ ہمیں جہاں کہیں انسان نظر آتا ہے ہم اسے اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ وہ ہمارا بچا ہوا کھاتا ہے، چند دنوں کے اندر اندر ایک تحول برپا ہوتا ہے اس کا یا کلپ کے نتیجے میں پہلے اس کی زبان دراز ہو کر تلوار کی دھار ہو جاتی ہے پھر اس کا سر غائب ہو جاتا ہے اور پھر نچلا دھڑ بھی بدل جاتا ہے۔''

کایا کلپ کا ذکر کیا آیا میرے سامنے کئی کہانیاں گھوم گئیں ایک معروف جرمن ناول نگار اور سٹوری رائٹر کی بہت مشہور کہانی Metamorphosis (قلب ماہیت) اس میں ایک سفری بیمہ ایجینٹ ایک بہت بڑے کیڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ کہانی تھی جس نے کئی زبانوں کے جدید افسانے کو ایک نیا موضوع دیا۔ فرانسیسی زبان کے ڈرامہ نگار انسکو کے ڈرامے Rhinoceros کی یاد آئی جس میں انسان گینڈے کے قالب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یوں ہی ہم ہرمن ہیسے کی کہانی پکٹورکی کایا کلپ کو یاد کر سکتے ہیں اور ہاں! انتظار حسین کے 'آخری آدمی' کو کیسے بھولا جا سکتا ہے، جہاں پوری بستی بندروں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ان کا ایک اور بہترین افسانہ ''کایا کلپ'' جس میں شہزادہ مکھی بن جاتا ہے اور اسے دوبارہ انسان بننا نصیب نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان لکھتے ہیں:

''جدید علامتی افسانہ نگاروں نے ''تبدیلی قالب''، ''قلب ماہیت'' یا ''کایا کلپ'' ایک حتمی تجربے کے طور پر قبول کیا ہے کیونکہ انہیں جدید زندگی میں اس تجربے کے اگلے مرحلے کا کہیں سراغ نہیں ملتا تو وہ اس علامتی واردات کے ایک خاص رخ کو جدید انسانی صورت حال پر منطبق کرتے ہیں۔''

سیاہ پہاڑ میں کایا کلپ کا یہ تجربہ اس افسانے کو بیک وقت افسانے اور داستان کے درمیان لا کھڑا کرتا ہے۔ داستان نگاری میں ایسے بے شمار کردار موجود ہیں جو تبدیلی ہیئت کے بعد قارئین کو تحیر زدہ دنیاؤں کی سیر کراتے ہیں اور اپنے انداز میں اپنی بات کہتے ہیں۔ انسان کا جانور یا دوسری مخلوقات میں تبدیل ہو جانا گو کہ ایک دہشت ناک تجربہ ہے۔ یہ زیادہ تر انسان کے زوال کے موضوع سے منسلک رہا ہے۔ کم مثالیں ایسی ہیں جو تنظیم ذات کے مراحل سے گزریں۔

اس متن میں بھی اس پوری بستی کے چہرے جنّے کی تبدیلی ان کی زاول کی داستان ہی تو ہے لیکن وہ خود کو افضل اور معتبر جانتے ہیں۔ شر کی نمائندگی کرنے والے اپنے درمیان خیر بھرا ایک جسم بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔

اگلی سطور میں وہ بار بار بزرگ کو تبلیغ کرتے ہیں کہ ہم آزادی سے اس بستی میں گھومتے ہیں جو جی میں آئے کرتے ہیں۔ ہمیں ہر سہولت میسر ہے تم بھی ہمارے ساتھ آن ملو اور اقرار کرو کہ تم انسان نہیں ہو! لیکن وہ معمر شخص بدستور انکاری ہے کہ اچانک ایک اور کردار افسانے میں وارد ہوتا ہے۔ سیاہ بلی کا کردار جو قد وقامت میں خاصی بڑی ہے اور وہ غراتی ہوئی نسبتاً چھوٹے قد کی کئی بلیوں کے ساتھ غار میں سے باہر آتی ہے۔ وہ تلوار نما زبان والے شخص کے پاس جاتی ہے اور وہ اس کے کان میں کچھ کہتا ہے تو وہ شخص بولتا ہے: اے بوڑھے شخص اگر تو ہماری بات نہیں مانتا تو اس کی بات مان لے جو نہ تیری نسل سے ہے نہ ہماری نوع سے۔

یہ بلی کا کردار مجھے کافی حد تک غیر مانوس لگ رہا ہے لیکن کیا یہ عورت کا Represented ہے؟؟ ممکن ہے یہ عیاری کی تجسیم ہو، جیسے سیاسی رویہ پینترے بدلنے والا شخص۔

تاہم بلی کی علامت یہاں اپنا ابلاغ کرتی دکھائی نہیں دے رہی اور پورے متن کو بھی کسی حد تک ڈسٹرب کر رہی ہے یا پھر میری ناقص عقل اس کردار سے ابھی مانوس نہیں ہو پا رہی ہے۔ لیکن اگلی سطر میں دیکھیں بوڑھا شخص بلی کو پہلی نظر میں پہچان جاتا ہے یہ تو وہی ہے جس نے پچھلے جنم میں ملاوٹ والے دودھ اور جعلی شہد کی فروخت سے ٹھیک ٹھاک دنیا کمائی تھی۔ اب دودھ اور شہد کی علامتیں تعینات کے مدار کے جوار میں واقع ہیں۔ یہ علی الترتیب روحانی و اخلاقی قدروں اور آسمانی علوم کے سمبلز ہیں مگر وہ بلی جعلساز ہے۔ اس نے ملاوٹ والا دودھ اور جعلی شہد فروخت کیے ہیں مگر کامیابی کے ساتھ، اسی لیے تو وہ ثالث کی معتبر حیثیت میں موجود ہے۔ یوں بلی اور اس کی ہمو ابلیاں سٹیک ہولڈرز نظر آتی ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ عوام کی تقدیر کا فیصلہ ان ہی 'چنے ہوئے' افراد کے ہاتھوں میں رہا ہے؟

اب یہاں پچھلے جنم کا تصور ہمیں کسی اور ہندو مذہب میں دھکیل دیتا ہے یعنی وہ بوڑھا بھی دوسرے جنم کے ساتھ یہاں وارد ہوا ہے۔ بلی پچھلے جنم میں مرد تھی یا عورت اس کے نشان واضح نہیں ہیں لیکن اس کا پچھلے جنم میں کسی کاروبار سے منسلک ہونا اس کے مرد ہونے کی دلیل ہے۔ ان سطور نے ایک بار پھر پوری کہانی کو deconstruct کر دیا ہے لیکن اگر میں 'کوہ اسود' اور 'سیاہ پہاڑ' کے متن کو دیکھوں تو سیاہ پہاڑ میں بلی کی علامت درست سمت میں نظر آتی ہے۔ ۱۹۹۱ء میں چھپنے والے متن میں بلی کو دیکھ کر بوڑھے کو یاد آتا ہے کہ یہ تو وہ ہی بلی ہے جسے اس نے گھر میں رکھا تھا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے کئی بار اسے دودھ پلایا تھا۔

اب بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ بلی بعد ازاں اس قبیلے سے آن ملی اور آج انہوں نے بلی کو بدلہ لینے کا موقع دیا ہے اور کہا ہے کہ تم اس کا فیصلہ مان لو اور ہم میں شامل ہو جاؤ! بلی فیصلہ کرتی ہے کہ یہ بوڑھا شخص انسان نہیں ہے باقی لمبی زبانوں والے سب انسان ہیں یوں وہ اس پر نور بوڑھے کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہیں جیسے اسے نوچ ڈالیں گے۔

پھر مصنف کا کردار دیکھتا ہے کہ وہ بزرگ سفید کبوتر بن گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں پرواز کر گئے۔

یوں خیر اور شر کی جنگ میں ایک بار پھر خیر ہار گیا۔ یا اس نے ان کو ان کے

حال پر چھوڑ دیا۔

میں ایک بار پھر اگر سارے متن کو دیکھوں تو مصنف کا کیریکٹر اور میں، ہم اپنے سوالات کے درمیان موجود ہیں، بدلتی رتوں کی مانند یہ متن ہر لحہ نئے معنی مجھ پر منکشف کرتا ہے اور کئی نئے سوالات اٹھاتا چلا جاتا ہے۔

ایسی بھیانک بستی جس کے سارے Signifiers / دال/ مشار اپنے مدلول/ Signified / مشور میں مجھے جہاں کئی طرح سوچنے پر مجبور کرتے ہیں وہاں مجھے وطن عزیز کی جانب بھی اشارے دے رہے ہیں۔ میں ایک فرد کی حیثیت سے سماجی کیڑا بھی ہوں جہاں میں تلواروں جیسی زبانوں کا گواہ ہوں میں دیکھتا ہوں سب ہنسی خوشی گلے مل رہے ہیں لیکن جدا ہوتے ہی گالی دیتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں ایسی کئی دستاریں جن کے نیچے سر نہیں ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کئی چلتی پھرتی لاشیں۔۔۔خالی دماغ دشمنی نما دوستی اور دوستی نما دشمنی۔۔۔اس علامتی متن نے جذبات کی قوت کی تہذیب کی ہے۔ اس متن نے مجھے سیاہ وادی میں اپنے وطن عزیز کی دگرگوں حالت کے جو نظارے بطور عام قاری دکھائے ہیں وہ کرب ناک ہیں۔ آمریت اور جمہوری بادشاہت جنگل کے کالے قانون کے منہ چڑاتے ہیں۔ Signified اور ہلاگو، چنگیز خان سے لے کر ہٹلر، اسٹالن، انقلاب فرانس اور برصغیر کے کالے پانی تک جاتے فسادات کے مناظر کے موہوم اشارے نظر آتے ہیں جو متن کے عقب میں کسی نہ کسی طور انسانی تاریخ پر بھی قہقہے لگا رہے ہیں اور موجودہ عہد پر بھی۔ اچھے علامتی ادب کی بڑی خوبی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ پس متن جذبات کا لاوا بہتا ہے جو واشگاف نعرہ نہیں ہوتا جیسا کہ اس متن میں کسی سوسائٹی کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ، قابو سے باہر صورت حال، جنگ وجدال، باطنی توڑ پھوڑ، ظاہری بدہیئتی اور انسانیت کی پامالی کی داستان کو اس ساخت میں بنا گیا ہے کہ معنی پرت در پرت، دائرہ در دائرہ جست بھرتے ہیں اور بیک وقت کئی دنیاؤں اور موضوعات سے جوڑتے چلے جاتے ہیں۔

غور کریں تو ہم سب اسی سیاہ وادی کے مکین ہیں جہاں ہمہ وقت خیر اور شر کی جنگ جاری ہے۔

کبوتر بن کر اڑ جانے والا وہ بزرگ کون تھا؟

ایسے کئی نورانی چہرے آئے اور انسانوں کے درمیان وقت گزار کر چلے گئے لیکن انسان اپنی دراز زبانوں اور مسخ چہروں کے ساتھ خوش ہے۔ من کے کالے ہم سب اپنی اپنی کالی دنیا میں مگن ہیں یعنی جہالت کا راج ہے۔

یہ کہانی بڑی پرانی ہے شاید انسان سے بھی پرانی!!

کتنے سفید کبوتر ہمارے سامنے اڑ گئے لیکن ہمیں تو سیاہ پہاڑ میں رہنا ہے، اس دنیا میں!!!

- بقیہ -

تخلیق بمقابلہ اظہار

اور اب تک قدرے نظرانداز شدہ خدوخال کی لہریں ہر صاحبِ نظر کو اپنی طرف متوجہ کریں گی۔ شعریت کی اساس جمالیات اور آہنگ کے ایک خاص تناسب پر استوار ہے۔ اس تناسب کی اوّلین ترین شکل گیت، گنگناہٹ اور عروض سے ناآشنا ابتدائی شاعری ہے۔ پھر ماہرینِ عروض نے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے عروضی پیمانے متعین کرتے ہوئے شاعری کو ارتقائی زینے کی اگلی سیڑھی تک پہنچانے میں مدد کی۔ شعروشاعری کا یہ دور بہت طویل ہوتا گیا لیکن حضرتِ انسان کو ورثے میں ملی خلاقیت واختراعیت بھلا کہاں اسے چین لینے دیتی ہے! سو، پابند شاعری سے یہ کہتے ہوئے:

’’اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے!‘‘

اس میں امکاناتِ تنوّع تلاش کرنے کی مہم جاری رکھّی اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد پہلے تو مغرب سے لامحالہ متاثر ہوتے ہوئے شعری موضوعات و مضامین کا دائرہ وسیع کیا اور پھر اگلی صدی میں نظم کے اسلوب کی مشاطگی پر بھی توجہ مرکوز رکھی۔ بیسویں صدی میں: میراجی، مجید امجد اور فیض سمیت چھ سات قدآور شعرا نے اردو نظم کو جدت کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے محقّقین وناقدین کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ اس طرح ایک منطقی وتوجیہی زنجیر سازی کا عمل جاری رہا اور اب تک کی تاریخِ جدت طرازی کے مطابق اس زنجیر میں ایک نیا حلقہ اس وقت نمودار ہوا جب آزاد نظم کی توسیع کے ضمن میں نثری نظم جیسی بظاہر متضاد صنف کو متعارف کرانے کی کوششوں کی ابتدا ہوئی۔ بلاشبہ اس صنف پر انگریزی شاعری میں پہلے کام شروع ہو چکا تھا اور اس کا اثر اردو سمیت ہر زبان کی شاعری پر ہونا ایک فطری تقاضا ہے کہ تعامل واختلاطِ باہمی بیشتر کامیاب تجربوں کے لیے کوکھ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی سبب سے ہمیں جمیل احمد عدیل کی نظموں میں اردو شعر کی کیاریوں میں انگریزی الفاظ کی پیوندکاری اکثر دکھائی دیتی ہے اور اس انداز پر بجائے معترض یا پریشان ہونے کے یہ دیکھنا زیادہ ضروری ہے کہ اس طرح اردو کا دامن وسیع ہوتے ہوتے کتنی رنگ برنگی تراکیب اہلِ ذوق کو دکھائے گا! اردو میں روایتی ترکیب سازی کی بابت جو مباحث ہوتے رہتے ہیں ان کی نمو بھی اسی بہانے ہو جائے گی۔ شاید نثری نظم عشّاقِ زبان وادبِ اردو کے لیے حیرت کا کافی مواد اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ وقت سدا سے طاقتور ترین منصف کے منصب پر فائز رہا ہے، سو، اسی عدالت سے فیصلے کا انتظار بہتر رہے گا!!

یُحِبُّ الجمیل

اشفاق احمد ورک

(لاہور)

جمیل احمد عدیل کون ہے؟

جمیل احمد عدیل ایک چھلاوا ہے، جو یہاں بھی ہے اور وہاں بھی، اِدھر بھی ہے اور اُدھر بھی۔

جمیل احمد عدیل کیا کرتا ہے؟

جمیل احمد عدیل قلم کے تیشے سے دودھ کی نہر کھودنے کے لیے ہمہ وقت برسرِ پیکار رہتا ہے۔

جمیل احمد عدیل کہاں رہتا ہے؟

جمیل احمد عدیل یاجوج ماجوج کے کسی فرد کی طرح کتابوں کی دیواروں میں قید ہے اور ہر روز ان دیواروں کو چاٹتے چاٹتے اس اُمید میں سو جاتا ہے کہ اگلے دن یہ سب کچھ ہڑپ کر کے باہر نکل آؤں گا مگر اگلے دن انھی دیواروں پر اخبار ورسائل اور مزید کتابوں کا ایک نیا پلستر چڑھ چکا ہوتا ہے۔

جمیل احمد عدیل کیا کچھ کرسکتا ہے؟

جمیل احمد عدیل کی ذہانت اور طراری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ حسن بن صباح کے دور میں ہوتا تو اس کی مشاورت سے فرقۂ باطنیہ اور ان کی فرودسِ ارضی کا سلسلہ مزید سو پچاس برس تک آگے جاسکتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اس کا تعارف مرحوم ممتاز مفتی سے کرایا اور ان کی آپس میں خط کتابت شروع ہوئی تو کچھ ہی عرصے بعد مفتی صاحب نے مجھے لکھا: ''تم نے مجھ بڈھے بابے کو کس طوفان کے حوالے کر دیا ہے، جو اپنے خیالات و دلائل کے جھپے سے میری تصورات وعقائد کی پسلیاں توڑنے پر مصر ہے''! ایک دن میری مفتی جی سے ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگے:

''وہ جن کہاں ہے؟''

میں نے ہنس کے کہا: ''میں نے اسے بوتل میں بند کر دیا ہے!''

کہنے لگے: ''یہ تمہاری غلط فہمی ہے''! پھر خود ہی ہنس کر بولے: ''شادی کے بعد تو بڑے بڑے جن قسم کے شوہر بھی بیوی کی بوتل میں بند ہو جاتے ہیں!''

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی! اصل میں مَیں آپ کو بتانے والا تھا کہ جمیل احمد عدیل کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں، شاید اور کوئی نہیں جانتا! اس کے گھر والے، بچپن کے دوست، پڑوسی، محلے دار، عزیز واقارب، محبوبائیں، عشاق حتیٰ کہ اس کی بیوی بھی نہیں؛ کیوں کہ بیوی اگر اس کے بارے میں وہ ساری باتیں جانتی ہوتی جو میں جانتا ہوں تو اس سے شادی کیوں کرتی؟

بیوی کا شوہر کے بارے میں سب سے بڑا دعویٰ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے انگ انگ سے واقف ہے مگر وہ بے چاری نہیں جانتی ہوتی کہ وہ اس کے انگ انگ سے تو واقف ہے مگر رنگ ڈھنگ سے بالکل نہیں کیوں کہ جسم اور مادے کی جتنی پرتیں کھلتی جاتی ہیں، روح اور باطن پر اتنے ہی پردے پڑتے چلے جاتے ہیں۔

صوفیا کے نزدیک تو حقیقت تک پہنچنے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی یہ جسم ہوتا ہے، پھر اس کی بیوی تو اس کے بارے میں زیادہ اس لیے بھی نہیں جانتی ہوگی کہ وہ اس کی محبوبہ اور یونی ورسٹی کلاس فیلو بھی رہ چکی ہے اور خدا گواہ ہے کہ ہمارے ہاں اپنے آپ کو جتنا پوز محبوبہ اور زنانہ کلاس فیلو کے سامنے کیا جاتا ہے، اتنا تو ہمارے سیاست دان خود کو اخباری بیانات یا ٹی وی خبرنامے میں بھی نہیں کرتے۔

یہ مجھے سب سے پہلے یونیورسٹی میں ملا تھا۔ اس وقت بھی اس سے دوستی کرنے یا تعلق بنانے میں سب سے زیادہ اس کا ظاہری جسم ہی حائل ہوا تھا۔ گورا چٹا، لشکارے دار بھنورا، شہری بابو، چکنا گھڑا، برائیلر مرغی کے انڈے کی طرح بے داغ! ہماری کلاس میں پانچ سات لڑکیوں کے ساتھ تقریباً پچپن ساٹھ لڑکیوں کی فوجِ ظفر موج تھی، جو جلد از جلد اس انڈے کا آملیٹ بنالینا چاہتی تھی۔

اِدھر میں شیخوپورہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے منھ اُٹھا کے یونیورسٹی چلا آیا تھا اور اس طرح کے ذہین، منھ پھٹ اور پُر اعتماد چالاک لاہوری پٹھوں کے دُکھ سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جانے کے منصوبے بناتا رہتا تھا؛ چوں کہ میری دادی اماں نے مجھے یہاں آنے سے پیش تر ہی بتا رکھا تھا کہ بیٹا! بڑے بڑے شہروں میں رنگ برنگے ٹھگ اور دھوکے باز ہوتے ہیں جو شکل سے بظاہر بڑے بھلے مانس نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اندر سے بڑے گھناؤنے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس سادہ دیہاتیوں کو دھوکا دینے کے بڑے روپ اور بے شمار طریقے ہوتے ہیں لہٰذا ان سے بچ کے رہنا! وہ تو بھلا ہو لڑکیوں کی کثیر تعداد کا، کہ جنھوں نے اس کی ٹھگ بازی کا دائرہ زنان خانے سے ایک انچ باہر نہ جانے دیا اور یہ نوسر باز ہماری جانب پرواز کرنے سے قبل ہی ایسا گرفتار ہو گیا کہ جب یہ مسلسل غائب رہنے کے بعد ہوسٹل واپس آتا تو عارف پیا کی شیڈ آشنا نظر اس کی شرٹ کے موہوم سے موہوم رنگین تغیر کو فوراً بھانپ لیتی!

جی ہاں! یار لوگ ابھی کسی روز لڑکیوں کو آنکھ بھر کے دیکھنے کی بابت سوچ رہے تھے کہ یہ اک ہری بھری ٹیار کو آنکھوں میں بھر کے چل دیا۔ مجھے اپنے اور اس کے موازنے کے بعد جی ٹی روڈ پہ چلتے چھکڑے کے پاس ''شوں'' کر کے گزرتی ہوئی نیو خان یاد آجاتی۔ ہمارے دل میں ابھی محبت کی چنگاری پوری طرح سلگنے بھی نہ پائی تھی کہ یہاں اچھا خاصا مجولگ گیا تھا۔ جس کی تپش اپنی کلاس سے نکل کر کالج بلکہ شہر کے چند ایک معروف ریستورانوں اور پارکوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ یہ آگ پتا نہیں کتنی تیز تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے جس میں سب کچھ ہی بھسم ہو گیا اور مجھے اس جی ٹی روڈ کے کسی بورڈ پہ لکھا ہوا ایک فقرہ: ''تیز چلو گے، جلد مرو گے''! یاد آ گیا۔ جب یہ چکنا گھڑا ایک دن اچانک میرے ہاسٹل کے کمرے میں آ کے ایک زوردار چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گیا! اس وقت میری اس کے ساتھ اتنی بے تکلفی یا تعلق بھی نہیں تھا کہ میں اس کے دکھ پہ اپنی پوزیشن واضح کر پاتا۔ میں تو

ابھی اس پڑوسی کا لال منہ دیکھ کے اپنا چہیڑوں سے لال کرنے والا تھا۔ابھی تو میں اس کی شان دار کامیابیوں سے اپنے اندر پیدا ہونے والے حسد اور رقابت کا روٹ بھی مقرر نہیں کر پایا تھا کہ دھما کا ہو گیا۔ پھر یہ دھما کا اتنا زبردست اور اچانک تھا کہ میں اسے اِنجوائے کرنے کی بجائے پریشان ہو کے رہ گیا۔ میں تو ابھی دیگر کلاس فیلوز کی طرح اس کی دہکائی ہوئی آگ کی حدت بھی پوری طرح محسوس نہیں کر پایا تھا کہ جل تھل ہونے لگی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ شکل وصورت، علم وآگہی، انداز واطوار اور اداکاری میں ہم سے اتنا آگے تھا کہ ہم تو اس سے پوری طرح جیلس ہونے کا رِسک بھی نہیں لے سکتے تھے۔ ہم نے تو اس کے عتاب سے بچنے کے لیے محض اتنا کیا تھا کہ اس کی طرف توجہ دینا ہی چھوڑ رکھی تھی۔ ویسے بھی پانچ درجن لڑکیوں کی موجودگی میں اسے ہماری توجہ کی ضرورت ہی کیا تھی!؟! داغؔ دہلوی نے کہا تھا:

میں اسے اوڑھوں، بچھاؤں، لپیٹوں یا کیا کروں
روکھی پھیکی، سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ بازی اتنی اچانک کیسے پلٹ گئی کہ ہم نے جس کھلاڑی کو ساری دنیا کے سامنے واک اوور دے دیا تھا، وہ آج ہمارے ہی ہوم گراؤنڈ پہ ہارے ہوئے مانجھی جیسی شکل بنائے بیٹھا تھا۔ ابھی تو اس کی محبت کا سورج سوا نیزے پر پہنچا تھا اور ابھی سے مطلع ابر آلود ہو گیا تھا۔

عام زندگی میں تو یہی ہوتا ہے کہ آپ کے حریف کو کہیں سے بھی زک پہنچے، ٹھنڈ آپ ہی کے کلیجے میں پڑتی ہے۔ بظاہر تو اپنے اس رقیبِ رُوسفید کی حالت دیکھ کے مجھے بھی لوٹ پوٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے جب دادی اماں والے سارے شکوک وشبہات کی عینک چڑھا کے اس ٹھگ پہ نظر کی تو مجھے اپنی ساری کوششوں کے باوجود اس کے چہرے پر ایکٹنگ کی کوئی رمق دکھائی نہ دی بلکہ اسی لمحے ایک عجیب سانحہ یہ ہوا کہ میں نے جب اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کی کھڑکی میں جھانک کے دیکھا تو اس راجا بھوج کے اندر بیٹھے گنگو تیلی سے ملاقات ہو گئی۔ یقین جانیں! مجھے اپنے اس ہم ذات وہم مزاج وہم عادات گنگو تیلی کو دیکھ کے بے حد خوشی ہوئی اور میں نے جھٹ اس سے دوستی کر لی۔ اس طرح اس سے تعارف کا جو سلسلہ گزشتہ کئی مہینوں میں مکمل نہ ہو پایا تھا، اس کے آنسوؤں کی برسات نے ایک ہی جست میں طے کر ڈالا۔

اس کی عیاری ملاحظہ ہو کہ اس نے آج تک اپنا سارا زور اندر کے اسی گنگو تیلی کو چھپانے میں صَرف کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ باہر سے شاہی قلعہ نظر آنے والے اس شخص کے اندر کامران کی بارہ دری چھپی بیٹھی ہے، جس کے چاروں اور محبت کا راوی ٹھاٹھیں مارتے ہوا گزرتا ہے۔ میں نے اس دن کے بعد سے آج تک اس سے ساری ملاقاتیں کامران کی اسی بارہ دری میں بیٹھ کے کی ہیں۔

مگر ایک یہ ہے کہ آج تک شاہی قلعے والی زندگی بسر کرنے پر مصر ہے۔ حالاں کہ مجھے تو اس بے چارے سچ مچ والے شاہی قلعے پہ بھی بڑا ترس آتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے، ہر دم نمود ونمائش ہی نمود ونمائش، اکڑ ہی اکڑ، دکھاوا ہی دکھاوا، بیگانہ پن ہی بیگانہ پن، طنطنہ ہی طنطنہ، کلف ہی کلف!! شاہی قلعہ بننے سے تو بہتر ہے بندہ شاہی محلّہ بن جائے! کوئی رس تو ہو، کوئی لَے تو ہو، کوئی رِدھم تو ہو، انجام تو دونوں کا عبرت ہے کہ ایک کو دیکھ دیکھ کے بندہ عبرت پکڑتا ہے جب کہ دوسرے کو دیکھ دیکھ کے عبرت بن جاتا ہے۔

لیکن یہ آج تک چہرے پر شاہی قلعے کا روغن چڑھائے ہر چیز کو فتح کرنے نکلا ہوا ہے۔ آج اردو ادب میں اس کا شاعری سے شروع ہونے والا سفر: افسانہ، تنقید، انشائیہ اور خاکے کی منازل طے کرتا ہوا خارزارِ کالم میں داخل ہو چکا ہے۔ خارزار کا لفظ میں نے روانی میں نہیں بلکہ جان بوجھ کے استعمال کیا ہے؛ کیوں کہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کبھی کبھی جنگلوں میں بھی بڑے خوش نما پھول اُگ آتے ہیں اور بعض اوقات باغات بھی خس وخاشاک کے مجموعے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔ اس سفر پہ روانہ ہوتے ہوئے بھی اس سکندر کے طوفانی تیوروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف اس جنگل کو منگل بنانے میں کامران ٹھہرے گا بلکہ اس کے قدموں سے اٹھنے والی دھول اس کے سفر کی انفرادیت کی چغلی بھی کھاتی ہے!!

زرد کفن میں نخلِ ایمان

جمیل احمد عدیل کے افسانے ہمارے عہد کے سماجی اور روحانی آشوب کی رُوداد ہیں۔ سیاسی شعور کی شمولیت نے اس رُوداد کو ایک نیا زاویہ دیا ہے۔ روحانی کرب اور حکمت ودانائی کو داستان میں سمونا اردو داستان کا پرانا فن ہے۔ جدید دور میں علامت وتجرید نے اس فن کو ایک نیا لہجہ اور انداز عطا کیا ہے لیکن روحانی کرب کو اب سماجی وسیاسی پس منظر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جمیل احمد عدیل کے یہاں روحانی کرب کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تنہائی اور اس کا احساس بہت نمایاں ہے لیکن یہ سماجی وسیاسی منظرنامے سے علیحدہ نہیں۔ البتہ حکمت ودانائی بعض اوقات زیادہ نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اس میں ان کے اسلوب کو بھی دخل ہے جو کسی حد تک ''عہد نامہ عتیق'' سے قریب ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں ان کا اسلوب اس اثر سے آزاد ہوتا ہے وہاں مصنف اپنے عہد میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔ ''زرد کفن میں نخلِ ایمن'' بھی اسی اثر کا نمارہ ہے۔ بہر حال اس مجموعہ کی کہانیاں اپنا ایک اثر رکھتی ہیں اور پڑھنے والے کو تادیر اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتیں اور یہی ایک اچھے فن پارے کی بنیادی شناخت ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد

سچا اور سجیلا قلم کار

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ
(لاہور)

جمیل احمد عدیل سے میری ذاتی شناسائی نہ ہونے کے برابر ہے، بجز اس کے، شہر لاہور میں اُنہیں ادبی حلقوں میں اکثر دیکھا ہے۔ اس لیے ان کی شخصیت کی مناسبت سے کچھ بھی کہنے سے قاصر ہوں۔ البتہ ان کی تحریریں میرے مطالعہ کا حصہ بنتی رہتی ہیں، چناں چہ مختصراً اپنی معروضی رائے کا اظہار ضرور کروں گی۔ عدیل بنیادی طور پر نثر نگار ہیں کہ شاعر کو وہ بھی تلمیذ الرحمٰن یقین کرتے ہیں۔ گویا شعر گوئی میں ''وہب'' غالب رہتا ہے اور نثر کی دین اکتساب کے تابع ہے۔ اگرچہ ہر تخلیق کا سرچشمہ غیاب ہی ہے کہ خیال کا مصدر Pure mystery ہے مگر شاعری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کسب کا دخل بہت کم ہے جب کہ دیگر فنون میں خون جگر کی شمولیت سے معجزہ فن کا ظہور ممکن ہے۔

جمیل احمد عدیل کی اساس پڑھنے کا عمل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے لکھا کم ہے، پڑھا زیادہ ہے تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اُن کی کتاب دوستی معروف حوالہ ہے۔ اسی ترجیح نے انہیں لفظ و حرف کے جہان سے وابستہ کیا ہوا ہے۔ وہ تھیالوجی سے لے کر تنقید تک بہت کچھ پڑھتے ہیں۔ اسی لیے، ان کے موضوعات میں بھی تنوع ہے اور اسالیب کی بوقلمونی بھی مشاہدے کا جزو بنتی ہے۔ وہ کسی ایک نثری صِنف کے اسیر نہیں ہیں۔ افسانہ، کالم، انشائیہ، خاکہ، سفرنامہ، تنقید، ناولٹ، طنز و مزاح، علمی مضمون سمیت متعدد اصناف انہیں مرغوب ہیں۔ تاہم ان کا، اصل تعارف افسانہ نگار ہونا ہے۔ موم کی مریم، زرد کفن میں نخل ایمن، بے خواب جزیروں کا سفر، تو جو ہمسفر ہو جائے، ہاویہ اور کانپتی شاخیں کے ٹائیٹلز سے ان کے چھ افسانوی مجموعے اب تک منظر عام پر آئے ہیں۔ عدیل نے بیانیہ طرز کی کہانی اور علامتی افسانہ یکساں مہارت سے لکھا، مگر Content سے لے کر Style تک اپنی انفرادیت کو شعوری کوشش سے قائم رکھا۔ انہیں ادراک حاصل ہے کہ ادب میں شناخت کا تقاضا مروج روش سے گریز اختیار کر کے ہی نبھا یا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہاں بڑا اہم سوال جنم لے لیتا ہے کہ دوسروں کی چھاپ سے دامن بچا کر تخلیق کار، صاحب اسلوب، کا لقب تو حاصل کر لیتا ہے، مگر یوں اپنا قیدی بن کر کہیں وہ خسارے کا سودا تو نہیں کر بیٹھتا؟ بلاشبہ عدیل کے ہاں ورائیٹی ہے، پھر بھی اُن کا جملہ اپنی خاص ڈکشن سے پہچانا جاتا ہے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ ایک درجے میں یہ وصف ہوگا لیکن اس طرح قاری یا سامع کہیں یکسانیت کے زیر اثر سانس لینے پر تو مجبور نہیں ہو جاتا؟ اس لیے میں ایک سوچی سمجھی رائے رکھتی ہوں، تخلیق کار کو سانچہ ضرور بنانا چاہیے مگر کچھ عرصے بعد اسے توڑ بھی دینا چاہیے! ہو سکتا ہے جمیل احمد عدیل کو میری یہ بات پسند نہ آئے لیکن انہیں اس پہلو سے کسی وقت غور ضرور کرنا چاہیے کہ وہ منطقہ جو اپنے جملہ امکانات بروئے کار لا چکا ہے، اُس سے ایک فاصلہ اپنا لینا بھی اپنی ایک لذت رکھتا ہے۔ چلیے! مان لیا نیا طور اور نئی برق تجلی؛ ہر لحظہ کی تیز رفتاری کے مطالبے کو آئیڈیل سٹیٹ سے منسلک کر دینے والی ہے؛ کوئی تخلیق کار اس قدر سریع الرفتار نہیں ہو سکتا مگر۔۔۔ دو چار برس کے بعد اپنے پسندیدہ موضوع اور دل کو بھانے والے اُسلوب کو خیر باد کہہ کر جہان نو کی جستجو میں عزم سفر پر آمادہ ہو جانا چاہیے! ''ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں''! کہنا صرف یہ چاہتی ہوں کہ اپنی تحریروں میں وہ کچھ اور نگارنگی کا اہتمام کریں، طرز کہن کو تقویم پارینہ کا سٹیٹس دے کر آئین نو کی طرف آئیں! نئے نقوش کی حریم میں قدرت نے ان کے لیے جانے کیا کیا کچھ چھپا رکھا ہے!

جمیل احمد عدیل کے افسانے ہوں یا دوسری تحریریں، اُن سب میں ایک مشترک قدر ہے اور وہ ہے فکر و تفحص کا عُنصر! انہیں اکہری سطح کے منظر اور مظہر میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ گہرائی گیرائی اور عمق انہیں Fascinate کرتے ہیں۔ ہر چند یوں ان کی تحریر Philosophized ہو کر عام قاری کے Interest سے قدرے دور چلی جاتی ہے لیکن قارئین کے حلقے کی وسعت پر وہ کبھی مصر نہیں ہوئے۔ جمیل احمد عدیل لفظ کے تقدس اور معنویت سے خاصا حساس رشتہ قائم کر چکے ہیں۔ وہ کب کیا پڑھتے ہیں؟ اِس باب میں میری Curiosity اپنی جگہ مگر حقیقتاً اس کے متعلق مجھے معمولی سی واقفیت بھی نہیں ہے لیکن میرا گمان ہے ان کی پسندیدہ کتاب ''ڈکشنری'' ہوگی! الفاظ کی Etymology سے مستقل ربط ان کا محبوب مشغلہ ہوگا! یہ شغل اچھا ہے، تنقیدی، تحقیقی اور علمی نوعیت کی تحریروں میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں مگر خالص تخلیقی تحریر میں اس خو، کی مداخلت روانی اور بہاؤ کو متاثر کرتی ہے۔ تخلیق کی اپنی ایک لہر ہوتی ہے اگر لکھنے والا فقرے کی ساخت، لفظوں کے چناؤ اور دروبست پر زیادہ مرکوز ہو جائے تو تو بے ساختگی کی جمالیات بعض اوقات داؤ پر لگ جاتی ہے 'حُسن بے پروا' میں اپنی ایک کشش ہے۔ مختار مسعود اور مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کے ساتھ یہی مسئلہ ہوا کہ بناؤ سنگھار صاف نظر آتا ہے۔ Cosmetics کے استعمال کی کلا یہی ہے کہ وہ دکھائی نہ دیں!

ایک عام فرد کی مانند جمیل احمد عدیل بھی سماجی گھریلو ذمہ داریوں سے عُہدہ برآ ہوتے ہوں گے، منصبی فرائض بھی ادا کرتے ہوں گے لیکن ایسا احساس ہوتا ہے کہ لکھنا پڑھنا اُن کے ہاں محور کا مقام رکھتا ہے، باقی سب ثانوی حیثیت کا حامل ہے۔ اس طرح کہیں نہ کہیں توازن سے محرومی یقیناً مقدر بنتی ہے مگر ایسی غیر معمولی وابستگی کے بغیر کوئی بڑا کام کیا بھی نہیں جا سکتا۔ جمیل احمد عدیل کے کریڈٹ پر بیس کتب کی فہرست ہے۔ یہ مقدار آسانی سے نظر انداز ہونے والی نہیں، پھر ان کے موضوعات ایسے ہیں جو مجاہدے کے متقاضی ہیں، خاص طور پر ان کی کتاب ''فتاویٰ کالم گیری'' جس کی ضخامت سات سو بیس صفحات کو محیط ہے۔

اس تصنیف میں انہوں نے کافی ادق عنوانات کے تحت لکھا ہے۔ان کی رائے بھی جمہور کے جادے سے جداراستہ تراشتی ہے۔ اسی طرح ''قیل وقال'' کے بعض مضامین میں انہوں نے بہت ہٹ کر Thesis قائم کیا ہے۔

جمیل احمد عدیلؔ کا شمار ایسے مصنفین میں نہیں ہوتا جو عوام الناس میں بہت پاپولر ہوتے ہیں۔میری نظر میں وہ Writer of readers نہیں ہیں بل کہ writer of writers ہیں۔یہ اختصاص جہاں انہیں علیحدہ پہچان کا انعام دیتا ہے وہاں محدود ہونے کا المیہ بھی عطا کرتا ہے۔اصل بات تخلیق کار کی اپنی سرخوشی اور طمانیت کی ہوتی ہے۔شوقِ تبصرہ آرائی میں قلم نے من مانی کی، اس لیے میں نے بھی رواروی میں کہہ دیا' عدیلؔ کو یوں کرنا چاہیے! یوں لکھنا چاہیے! وگرنہ اصو لی نکتہ وہی ہے جو ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اکثر بیان کیا کرتے ہیں:

''ایک ناقد تحریر کا تجزیہ کرتے ہوئے کبھی یہ نہ کہے، مصنف کو یوں لکھنا چا ہیے تھا اور یہ لکھنا چاہیے تھا! اس کی Jurisdiction بس رائیٹر کے لکھے تک محدود ہے، یعنی ایک لکھنے والے نے جو لکھا ہے وہ صرف اور صرف اس کا Analysis کرے! ''

عہدِ موجود میں 'ادب برائے زندگی' کا چلن عام ہو گیا ہے، خاص طور پر صحا فتی ادب حصول مفادات کا مضبوط ذریعہ بن گیا ہے۔لوگوں نے اپنی تحریروں کو قصیدے بنا کر اونچے اونچے منصب پا لیے ہیں، دولت اور شہرت کو منزل بنا کر دن رات لگے ہوئے ہیں! ایسے میں چند ہی بے نیاز رہ گئے ہیں جو ان علائق سے لاتعلق ہو کر اپنی دنیا میں گم ہیں، لکھنا پڑھنا ان کے لیے عبادت ایسا ہے۔کوئی اجر، عوضانہ، معاوضہ وہ ہرگز نہیں مانگتے۔ایسا لکھاریوں میں ایک نام جمیل احمد عدیلؔ بھی ہے جو ایمان رکھتا ہے کہ سرور اور سرشاری کا مرکز صرف اور صرف 'تخلیق' ہے اور کچھ نہیں!۔۔۔! آخر میں براہ راست الفاظ میں یہ اظہار ضرور کرنا چاہوں گی کہ جمیل احمد عدیلؔ اپنے نام کی طرح کام، اور کام کی طرح شخصیت میں بھی اسم با مسمّٰی ہیں!!

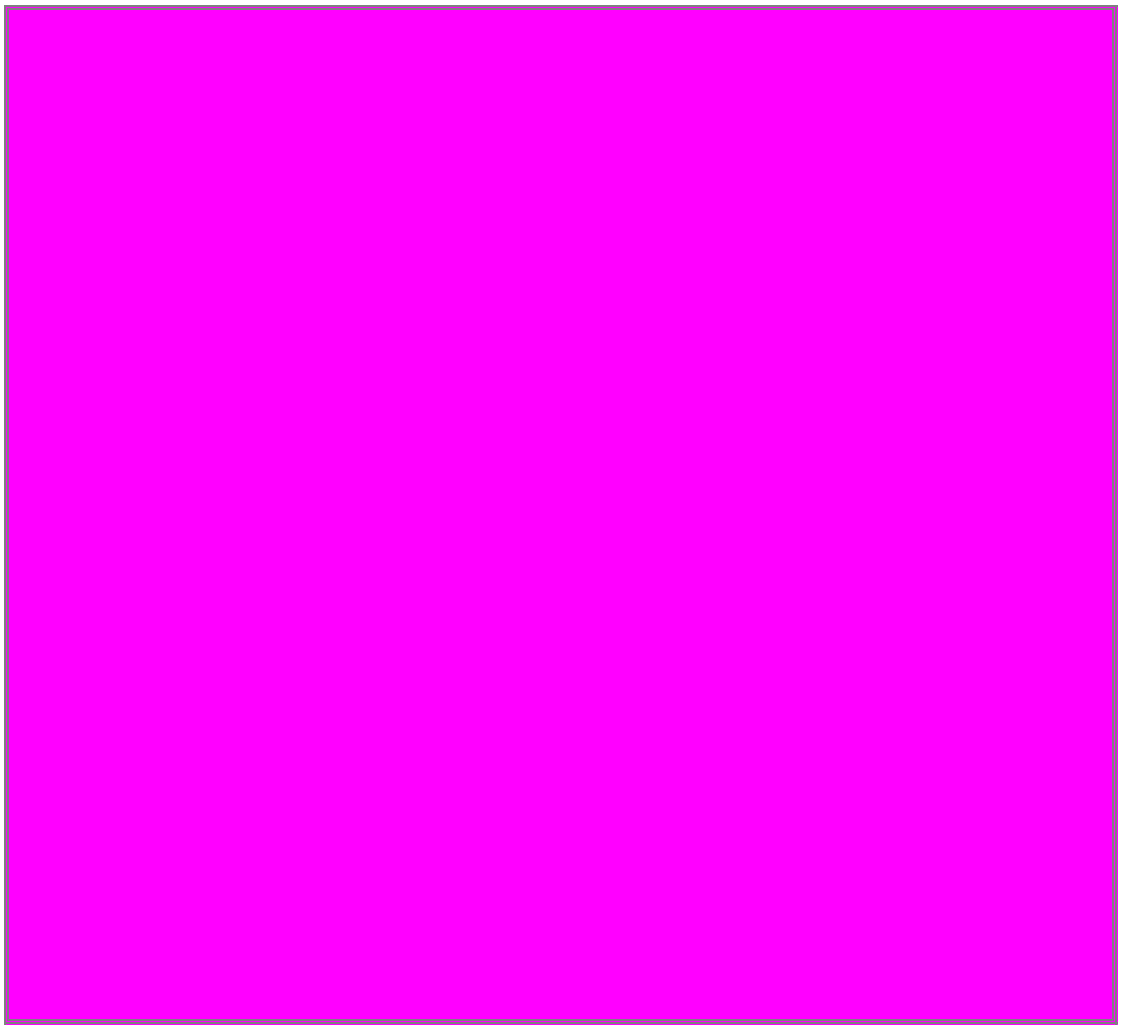

''اہانت کا ہدف''

(جناب جمیل احمد عدیل کی منتخب نثری نظمیں)

فاری شا (اسلام آباد)

کتبہ آخری متن نہیں ہے

اپنے بے جان ہونے پہ نازاں
آنکھوں کے چور نے
کسی سہولت کار روزن کو چن تو لیا
لیکن اس کم عیار کے ہاتھوں
احتیاطی تدابیر
یا
مدافعتی نظام کی تضحیک نہیں ہوئی
اس نے ان سجدوں کو شرمسار کیا ہے
جو سلامتی کے ضامنی بنے تھے
وہ بے نفسی اہانت کا ہدف ٹھیری ہے
جس کی زبان سے کبھی نہیں نکلا:
'سردی ہے'!
بلکہ اس کا اسلوب یہی رہا:
'وہ سردی کرتا ہے'!

شفاخانے میں مامور
بن بیاہی کارندہ کے لیے
اب جو چھے فٹ کی بجائے
بارہ فٹ گہرا گڑھا کھودا گیا ہے
اس زمین دوز عمیق غار کو
کیا دائمی رفیق اپنے لیے وسیع پائے گا
یا کھائیوں میں سمٹنا
اس کی تقدیر ہو چکا؟

کھدائی کے شوقینو!
خلا کی وجود پذیری
اور اس کو بھرنے کے عمل میں سے
کون سا ورژن منفی ہے
کون سا مثبت؟
حاصل تو خیر صفر ہے
اسی صفر سے
قہقہہ اور گریہ کا بیک وقت پھوٹنا
شہادت اور ہلاکت کا دو ہندسوں میں تقسیم ہونا
ہاں
سچ کا حتمی پیمانہ ایجاد ہونے تک
سب چلتا رہے گا

مکمل حفاظتی کٹس میں سرتاپا غرق
تم دونوں اجنبی
میت کو لیور کی مدد سے
مہیب لحد میں اتار کر
اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاو
اور فی الفور اس لق ودق مقام کو چھوڑ دو

کیا ہوا
اگر اس چٹیل ویرانے کے حاشیے میں
ایک تنہا مرقد بنے گی
کوئی مرکز ہو تو مرکز کی آرزو کی جائے
بالفرض قبور کے بیچوں بیچ
یہ معمول کی قبر ہوتی
تو، وجود کا متن، زیادہ سے زیادہ
کتبے کے متن میں منتقل ہو جاتا
لیکن کتبہ بھی کب آخری متن ہے!!

○

کرالنگ آرڈیننس

محض دوسو پچاس میٹر لمبی گلی میں
داخل ہونے والا وقت
ایک سوتین سال سے
منھ کے بل لیٹا
کہنیوں اور گھٹنوں کے سہارے سرک رہا ہے
ہاں! اسی بند گلی کے مکینوں نے
زخموں سے چور مارسیلا کے لیے
اپنے کواڑ بھیڑ رکھے تھے
لیکن، ایک دروا بھی ہوا تھا
پھر پناہ گاہ سے قلعہ گوبند گڑھ تک
شب کی تیرگی کو سرنگ بنایا گیا تھا
مگر، اس کے باوجود
کرالنگ آرڈنینس نافذ ہو کر رہا
شیرووڈ چرچ کی راہبہ
خداوند کی نمائندہ نے تکریم پائی
خدائی فوجدار ڈائر
گن پوائنٹ پر
فضائلِ Rituals بیان کرتا رہا
مخلوقِ خدا ننگے فرش پہ رینگ کر
اعلامدارج طے کر گئی

اے عورتو!
راتوں کی سیاہی اوڑھ کر
تم اپنے شوہروں کی بغل میں سوتی ہو
انھیں آدابِ غلامی کیوں نہیں سکھاتی ہو
چھڑیوں سے پٹنے
اور
سرِ عام مرغا بننے پر
بلبلاتی کیوں ہو
ہم تمھارے خیر خواہ ہیں، کہ
صرف تمھارے حمل چیک کرنے کے لیے ہی
تمھیں بے لباس کر رہے ہیں

مستقبل کے مسیحاؤ!
سترہ میل دھوپ میں مارچ کرنے سے
تمھاری قوتِ مدافعت میں اضافہ ہوگا
آقاؤں کو سلام نہ کرنے والے قصور وارو!
مٹی پر ناک سے لکیریں نکالو
خاکساری کی دولت پاؤ گے

اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے
مقتولین تین سو اناسی تھے
یا، اٹھارہ سو
لیکن وجود میں کہرام مچانے والے اس ڈنک کا کیا جائے
نائیٹ ہڈ، قیصرِ ہند، سر
کون رہا، کون نہیں رہا
کس نے بھگوان کے گھر میں
قاتل کی دستار بندی کی
وہ کون سخن طراز تھا
جو درباری ہو کر قصیدہ خوانی کرتا رہا
ان ستائیس قدسیوں کے اسمائے گرامی
کیا زرِجل سے درج کیے جائیں
ظلِ سبحانی کی بارگاہ میں
جنھوں نے
تملق بھرا سپاسنامہ پیش کیا تھا

اس کا کیا نام تھا
جس نے، ورق کھود کر
کتاب میں
تین قوموں کے انتقام کے لیے جگہ بنائی تھی

ان تعینات کے سرہانے آہستہ بولو
کہ اجتماعی نیند انھیں لوری سنا رہی ہے
البتہ یہ تعلیمی سچ فراموش نہ ہو جائے
اگر آج بھی
محرابِ دربار کی رگوں سے ٹپکتا رعونت کا زہر
سائل کو نیلا کر دیتا ہے
اگر آج بھی
داور کی آنکھ کا شعلہ

یا
داروغہ کی زبان کا انگارا
فریادی کو بھسم کر دیتا ہے
تو ہرگز یہ ثابت نہ ہوگا
غلام گردشوں میں جاری رقصِ بندگی
کسی جبر کا شاخسانہ ہے
یہ آزاد کبڑوں کی اپنی رضا کا صلہ ہے

○

کامک ڈسٹ چھانتے ہوئے

شنید ہے
گیارہ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار
اور تینتالیس برس سے رواں دواں
وائجر
کہیں بین النجوم ہی ڈول رہا ہے
ایلفا سینتوری، یعنی
ستاروں کے جھرمٹ تک رسائی
ستر ہزار سال کا تاوان مانگتی ہے
کہ، پینتالیس کھرب میل کی رسی
بیچ میں تنی ہوئی ہے

ہم بھی کیا کریں
وبا خود تو دفان ہو گئی، مگر
اپنی نشانی چھوڑ گئی
گردنوں کے پٹھے فطری لچک کھو بیٹھے
خیر، اسٹیل کے پائپ ڈال کر کام چلایا جا رہا ہے
گردن بسہولت گھوم تو جاتی ہے، لیکن
رخ اوپر کی جانب نہیں ہو پاتا
تاہم سب متفق ہیں
گرد و پیش اور بلندیوں میں کوئی جوہری فرق نہیں
گویا متضاد فیصلوں کو بھی سماوی توثیق حاصل ہے
جیسے ماضی میں
دھاتی راڈ کا موجد بن فرینکلن
اول اول رد ہوا تھا
اور 'جادوگروں' سے زمین پاک ہوئی تھی
کہ، اونچے میناروں پر آسمانی بجلی کا گرنا
انھی شیطانوں کی کارستانی قرار پائی تھی
ماورا سے القائی رابطوں کا شعبہ
اب بھی فعال ہے
حساس پردوں پر خفگی اور نشاط کے گراف بن رہے ہیں
تسبیح گزار پرندوں کے گلوں کو
چھری کی تیز دھار تکبیر پلا رہی ہے

کیا عجب!
یہ گفتگو ہی خارج از نصاب ٹھیرے
بسیط پہنائیوں میں رازوں کی مچھلیاں تیر رہی ہیں
یا فضائے مکانی ایک بیکراں اجاڑ ہے

○

قبر والا گھر

جمیل احمد عدیل

رات کے ساڑھے بارہ بجے وہ کینٹ کی ایک نہایت خاموش، نیم تاریک اور مکمل سنسان سڑک پر تن تنہا پیدل گزر رہا تھا کہ اچانک کیا محسوس کرتا ہے، کوئی دبی دبی چیخوں میں کسی کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ وہ لپک کر اس درخت کی اور گیا جہاں سے سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ وہاں اسے ایک ادھیڑ عمر جوڑا بے بسی کے عالم میں دکھائی دیا۔ دفعتہً ریوالور کی نالی کی ٹھنڈک نے اس کی گردن کے عقبی حصے کو چھو لیا۔ ساتھ ہی ایک کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی: ''ہاتھ اوپر اٹھالو، خبردار! جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالا، گولی ماردوں گا!'' دور دور تک کوئی بندہ بشر، کوئی گاڑی، کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اب وہ بھی اس مرد اور عورت کی طرح ناچار تھا جو اس سے قبل ڈاکو کی پکڑ میں تھے۔ اسے مزید حکم ملا: اسی طرح درخت کے تنے سے جڑ کر کھڑے رہو اور اپنی جگہ سے ذرا سی بھی جنبش نہ کرنا! سو، طوعاً و کرہاً اس نے یہی کیا۔

اب اس لٹیرے نے مرد اور عورت سے کہا: ''میں دوبارہ بکواس نہیں کروں گا، بس گولی ہی چلاؤں گا۔ اول تو یہاں گولی کی آواز سننے والا کوئی انسان نہیں ہے، پھر بھی میں نے سائلینسر فٹ کیا ہوا ہے۔ ہلکی سی ٹھس ہوگی اور تم زمین پر تڑپ رہے ہوگے۔ لہٰذا جو کچھ تمہارے پاس ہے فی الفور میرے حوالے کر دو!'' اس دوران میں رہزن نے ٹارچ کی روشنی پھینکی تو اس نے بھی پلٹ کر اچھی طرح دیکھ لیا۔ مرد عورت یہی کوئی چالیس کے پیٹے میں ہوں گے۔ چہروں مہروں، وضع قطع، تراش خراش، سج دھج، لباس، انداز۔۔۔ غرض ہر پہلو سے غیر معمولی خوشحالی ٹپکتی تھی۔ عورت کچھ زیادہ ہی خوبصورت تھی۔ ڈاکو مرد سے مخاطب ہوا: اپنی گھڑی، موبائل، نقدی، انگوٹھی۔۔۔ سب کچھ میرے سپرد کردو! یہ کہہ کر اس نے جھپاک سے پینٹ کی جیب سے نائلون کی رسی نکالی اور مرد کی کمر پر زوردار کک رسید کی۔ جیسے ہی اس نے لڑکھڑا کر درخت کے تنے کا سہارا لیا، رسی کے بل بجلی کی سی تیزی سے اسے جکڑ چکے تھے۔ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ساتھ والی دو انگلیوں کو اس نے سختی سے خم دیا اور عورت کے گریبان کو ناف سے ملا دیا۔ اسے یوں لگا، جیسے کالی قمیص سے بے قابو بجلی کا کوندا لپکا ہو۔ اس کی آنکھیں نسوانی بدن کی برہنگی سے چندھیا گئیں۔

پہلے تو جو کچھ ہو رہا تھا وہ کسی نہ کی طرح سہے جا رہا تھا۔ ڈاکو کی اس تازہ بدنیتی پر ایک دم اس کا خون کھول اٹھا، اسے خود نہیں معلوم اس کے اندر بھری ہوئی برق ایسی توانائی کہاں سے آگئی؟ وہ چیتے کی طرح پلٹا اور شیر کی طرح ڈاکو پر جھپٹا۔ گولی چل گئی لیکن درخت کے پتوں کو چیرتی ہوئی فضاؤں میں کھوگئی۔ اب ڈاکو اس کے نیچے تھا اور وہ اوپر۔ دونوں میں زور آزمائی عروج پر تھی۔ ڈاکو کا ریوالور چونکہ اس کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں آچکا تھا لہٰذا اس نازک مرحلے میں اس کے پاس آخری آپشن گولی چلانا ہی رہ گیا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ ڈاکو کی کنپٹی سے بیرل لگائی اور ٹریگر دبا دیا۔ اس کا گرم گرم بھیجا سوراخ سے ابل پڑا۔ اسے ٹھیک سے تڑپنے کا موقع بھی نہیں ملا، یکا یک ٹھنڈا ہوگیا۔ اس وقوعے کے فوراً بعد ریوالور وہیں پھینکا گیا اور وہ تینوں لرزاں و ترساں بے حد تیز تیز قدموں سے چل پڑے۔ کوئی دو کلومیٹر پر ایک رکشا ملا اور اس طرح آدمی کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئے۔ ذرا اوسان بحال ہوئے تو ان لوگوں نے بتایا کہ ہم میاں بیوی واک کرنے نکلے تھے، بس باتیں کرتے کرتے اتنی دور آگئے کہ بے دھیانی میں ویرانی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اگر آپ اچانک فرشتۂ رحمت بن کر نہ آجاتے تو دیگر چیزوں کے ساتھ سوا کروڑ روپے کی مالیت کا میری بیوی کا ہیروں کا ہار تو جاتا ہی عزت بھی تار تار ہو جاتی۔ عورت آنسو پونچھتے ہوئے بولی: ''اور شاید جان بھی چلی جاتی!''

وہ شخص میٹروپولیٹن سٹی کے امیر ترین آدمیوں میں سے ایک تھا۔ ملیں، پلازے، پیٹرول پمپ، کوٹھیاں، زمینیں، فارم ہاؤسز، ہاؤسنگ سکیمیں، جائیدادیں اتنی کہ عام آدمی اثاثوں کے اس مجموعے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ بہرحال نصف شب کے عمل میں ایک نہایت ہی آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں تینوں کے مابین معاہدہ ہوا کہ جو کچھ اس رات میں ہوا ہے کبھی بھی کوئی کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کرے گا۔ مبادا مقتول ڈاکو کے بھائی بند انتقام پر اتر آئیں اور کچھ نہیں تو پولیس ہی تھانوں کچہریوں کی گھمن گھیری میں ڈال دے۔ ویسے اس کے ضمیر پر اس قتل کا بوجھ نہیں تھا اور جب اگلے دن اخبار میں اس نے پڑھا کینٹونمنٹ ایریا سے ایک اشتہاری قاتل کی لاش ملی ہے تو اس کا من پہلے سے بھی زیادہ آسودہ ہوگیا۔

قصہ کوتاہ! اس کے برابر نہ نہ کرنے کے باوجود اس سرمایا دار اور اس کی حسین بیوی نے ایک گھر اور دو گاڑیاں انعام یا تحفے میں اسے دے دیں۔ اب کہاں کرائے کے ٹھیکرے میں کسمپرسی کا وہ عالم اور کہاں پوش علاقے میں چار کنال پر مشتمل بالکل نئی کوٹھی! جس کے وسیع و عریض گراسی لان میں متنوع رنگوں اور قسموں کے پھول کھلے ہوئے۔ بالائی منزل مہمانوں کے لیے مختص، جس میں: تین لگژری بیڈرومز، ہر ایک کے ساتھ و فل اسیسریز (اٹیچ) باتھ، اس کا، اس کی حور کا اور اس کے پانچ بچوں کے لیے الگ الگ کشادہ وال ٹو وال کارپیٹڈ کمرا۔ ہر کمرے میں دیار کی پینلنگ، ٹی وی، کمپیوٹر، اے سی، فریج، واٹر ڈسپنسر، فینسی لائیٹس سمیت ہر سہولت موجود، سٹڈی ایسی کہ جی چاہے بندہ عمر بھر بس مطالعے ہی میں محو رہے۔ ایک کمرا جدید سامانِ ورزش سے لیس۔ گھر میں جم نعمتِ عظمیٰ سے کیا کم ہے! 17 کے وی کا جنریٹر، اس کے ذاتی استعمال کے لیے زیرو میٹر ہونڈا وی ٹی آئی، اہل و عیال کے لیے نئی نکور، چم چم کرتی لینڈ کروزر، مستعد ڈرائیور، مالی، ملازم، باورچی، چوکیدار۔۔۔ سب اپنے اپنے کام میں منہمک۔۔۔ ایسا فرنیشڈ گھر اور ایسا زبردست ماحول دیکھ کر چونکہ ہر فرد مجسم استفسار بن سکتا تھا کہ آخر محکمہ آب پاشی کے ہیڈ کلرک عبدالمنان کے ساتھ کیا چمتکار ہوگیا ہے؟ کیسے ہوگیا ہے؟ کب ہوگیا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر کیوں ہوگیا ہے؟

سو، حسد کے بارود سے بھرے سوالات سے بچانے کے لیے قدرت نے

اس نوعیت کا کوئی ڈرامائی واقعہ عبدالمنان کے ساتھ نہیں ہونے دیا۔ بے چارہ عبدالمنان تھا تو ہیڈ کلرک مگر اس سے بڑا شیخ چلی بھی کوئی نہیں تھا۔ فینٹسی کا تو وہ گویا امام تھا۔ بیٹھے بٹھائے مراقبے میں چلا جاتا تھا اور پھر اس کی پرواز میں کوتاہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حشرِ خیال کو مرتکز کر کے لیزر بیم بنالینا اس پر ختم تھا۔ چشم تصور میں ایک نیا جہان آباد کر لینا اس کے بائیں دماغ کا (روٹین کا) کا کھیل تھا۔ اس تازہ بستی کی تفصیلات اور جزئیات اگر کسی کے سامنے آجائیں تو وہ آنِ واحد میں نقش حیرت بن کر رہ جائے۔ پر اس کے سارے معاملے خواب اور خیال کے بیچ ہی معلق تھے۔ آنکھ کھل جانے پر اسے کبھی سونے کی اینٹیں ملیں نہ کوئی پرائز بانڈ ہی نکلا۔ ایک عمر گھر اس کی دکھتی رگ رہا۔ وہ تو کبھی کبھی یہاں تک سوچنے لگتا، اگر 'لامکاں' کا تصور موجود نہ ہوتا اور سرجن ہارنے اپنے لیے کوئی اقامت گاہ تعمیر کرا رکھی ہوتی تو وہ کس امید پر جیتا؟

عبدالمنان نے سیاسی جلسوں میں روٹی، کپڑا اور مکان ایسے نعرے بھی بہت لگائے، لیکن کسی بھی دور میں کسی بھی حکومتی سکیم نے اسے اس حوالے سے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ اپنی لگی بندھی تنخواہ میں اتنا وہ پس انداز نہیں کر سکتا تھا کہ اس میں چھوٹا موٹا کھنڈلا بن جاتا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی رقم سے وہ گھر بناتا؛ لیکن ایک تو بچوں کی شادیوں وادیوں کی ذمہ داری اس کے سر پر ہوتی؛ دوسرے عمر کے اس پچھواڑے میں گھر بنا بھی لیتا تو مہمان کی حیثیت سے رہ پاتا کہ بالعموم ہوتا یہی ہے؛ بڑھاپے میں جب اپنی چھت نصیب ہوتی ہے؛ شہرِ خموشاں کی جانب رخصتی کے لیے چارپائی تیار ہو چکی ہوتی ہے۔

عبدالمنان عجیب شخص تھا، خیالستان میں ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہوئے بھی اخلاقیات سے دست کش نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً تصورات میں بھی اس نے خود کو کبھی مرتشی کے کردار میں نہیں دیکھا۔ اسی طرح سپنوں میں: حکمران، سیاستدان، سمگلر، جعلی پیر، بلیک میلر صحافی، منشیات فروش، بھڑوا، دلال بن کر اس نے کبھی خود کو مالک مکان کے روپ میں نہیں دیکھا۔ رہا سوال اپنی جائز کمائی سے اساری کا تو ''سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں'' کا ٹائٹل سونگ غالب کے زمانے سے برابر ان چلا آرہا ہے۔ لے دے کے اس کے پاس Imaging making faculty یعنی Fantasy تھی۔ اب محض رعنائی خیال سے گھر تو تعمیر نہیں ہوتے۔

اپنا گھر۔۔۔ اگر ہوتے ہواتے عبدالمنان کا ذہنی مسئلہ بن گیا تھا تو اس کی ٹھوس وجوہ تھیں۔ مثلاً اسے کرائے کے مکانوں سے وابستہ ناقابل برداشت ذلتیں سہنا پڑی تھیں۔ ایڈوانس، ضمانت، گھر خالی کرو! کا اچانک نوٹس، کرائے میں اضافہ، شفٹنگ، نئے سرے سے ایڈجسٹمنٹ، خانہ بدوشوں ایسی زندگی۔۔۔ ان مسائل نے اسے نیم پاگل کر دیا تھا۔ سو، وہ اٹھتے بیٹھتے ذاتی گھر بنانے کا سوچتا رہتا اور یہ مشہور شعر گنگناتا رہتا:

ایک پیسہ بھی نہیں جیب میں اپنی غزنی
زندگی ہے کہ کسی چاند پہ گھر مانگتی ہے

دوسری جانب عبدالمنان کی محرومیوں نے اسے اتنا حساس اور دراک بنا دیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کی کمی کی تلافی ہو گئی تھی۔ وہ اکثر سوچتا اگر اس موضوع پر بحث ہو کہ بہشت سے منسوب ترغیبات میں سرِ فہرست ذاتی گھر ہے یا حور وغیرہ؟ فریقین کے دلائل سن کر ثالث رجحان کے ناانصافی بھی کرے تو زیادہ سے زیادہ گھر کو دوسری ترجیح قرار دے سکتا ہے، تیسری نہیں اور اس کی تو خیر پہلی احتیاج اپنا گھر تھی۔ اپنی حور، عترت اور عسرت کے ساتھ کرائے میں رہتے ہوئے اسے زمانے بیت چکے تھے، بلکہ یوں کہیے اس کے سب بچے کرائے کے مکانوں کی 'پیداوار' تھے اور خود اس کا جنم بھی ایسے مکان میں ہوا تھا جس کا کرایہ دار اس کا باپ تھا۔

بطور کرایہ دار جس آخری مکان میں اسے رہنے کا اتفاق ہوا، وہ شہر کی سب سے نادار بستی کی تنگ ترین اور ٹیڑھی میڑھی گلی میں واقع تھا۔ اس خستہ تر مکان کا کل رقبہ ایک مرلہ دوسرسا ہی تھا۔ ڈیڑھ کمرے پر مشتمل اس گھر کے اندر گٹر کا پانی یوں اعتماد اور آزادی کے ساتھ گردش کرتا تھا جیسے حقیقی مالک مکان وہی ہو۔ سیڑھیوں کے نیچے بنے اس کے اکلوتے غسل خانے کا رقبہ 3x2 فٹ تھا۔ جس میں مری ہوئی چوڑیوں والی بالکل فری ٹونٹی تھی، جسے بند کرنے کے لیے کالے شاپر میں لپٹی ہوئی آدھی اینٹ رکھ دی جاتی تھی مگر اسے غالباً سلس البول کا عارضہ لاحق تھا کہ قطرہ قطرہ پانی پھر بھی ٹپکتا رہتا تھا۔ روشن دان کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ کسی باذوق نے ایشور یا رائے کا نیم عریاں پوسٹر لگا رکھا تھا۔ نظریۂ ضرورت کے اس فیصلے کو عبدالمنان نے بھی غلط قرار دینے کی ہمت نہیں دکھائی۔ کمرے میں نصب سوئچ بورڈ پر کسی ضعیف کے دندان کی طرح لٹکتا ہوا شو تھا، جس میں بلب کا پلگ لگایا جاتا تھا۔ جب کپڑے استری کرنے ہوتے تو روشنی سے دستبرداری کے علاوہ کوئی چوائس نہیں رہ جاتی تھی۔ برآمدہ نما صحن میں پیڈسٹل فین چلانے کے لیے ماچس کی دو عدد تیلیوں کے بغیر کام نہیں چلتا تھا کیونکہ بغیر پلگ کے تاریں سوراخوں میں ٹھہرنے کی خودکار صلاحیت سے عاری تھیں۔ اس گھر کے بنیرے اس قدر نازک مزاج تھے کہ ہوا کے ذرا سے بھی تیز جھونکے کو سہہ نہیں پاتے تھے اور قلبِ عاشق کی دیوار کی مانند آناً فاناً گر جاتے تھے۔ دیواروں اور چھتوں کو پلستر تو کیا ٹیپ بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کی انیس برس قدیم یا حادث سفیدی نے سیکڑوں بارشوں کو یوں خود پر برسایا تھا کہ ہر کیوبیکل اینٹ تجریدی آرٹ کا نمونہ پیش کرنے پر پابند ہو گئی تھی۔ اس کے فرش ایسے ناہموار تھے جیسے بورژوا اور پرولتاری طبقات سے مرتبہ سماج یا جیسے لکنت کے مریض کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ۔ اس کے ٹین کے دروازے اس زور سے بجتے تھے جیسے درشت مزاج بیوی کی نمانے شوہر کے لیے ڈانٹ ڈپٹ! مکان اتنا وسیع اور بابرکت تھا کہ اگر آدھے مکین باہر گئے ہوتے تب بھی بھرا بھرا لگتا تھا۔

آخر کار وہ وقت بھی آ ہی گیا جب عبدالمنان نے اپنی حور کو جھوٹے سچے دلائل دے کر قائل کر لیا کہ تم نے جو تینوں بیٹیوں کے لیے چھے طلائی چوڑیاں صدیوں سے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں، یہ ان کے تب کام آئیں گی جب ان کے لیے رشتے آئیں گے اور مناسب رشتے تب آئیں گے جب یہ کسی ڈھنگ کے گھر میں رہتی ہوں گی۔ یوں سونے کی ان چوڑیوں کی قیمت پانچ مرلے کے

پلاٹ کی ڈاؤن پے منٹ میں تبدیل ہوگئی۔شہر سے یہ پلاٹ جتنی دوری پر تھا، اتنے ہی فاصلے پرساٹھویں قسط تھی۔جس کی ادائیگی کے بعد رجسٹری کا خوش کن مرحلہ آناتھا۔عبدالمنان کی زندگی بلکہ تخلیقی عمل میں فرق یہ آیا کہ پہلے وہ بغیر پلاٹ کے بھی کہانیاں گھڑتا رہتا تھا، اب اس کے ذہن میں بڑی مربوط اور گتھی ہوئی کتھائیں ترتیب پاتی تھیں۔واقعی وقت سب کچھ کرالیتا ہے، حتیٰ کہ انتظار بھی۔ جس روز عبدالمنان اوراس کی حور کے نام تحصیلدار کے روبرو قانونی رجسٹری ہوئی توزوجین کو پہلی بار احساس ہوا کہ ہمیں جولاکھوں برس قبل جنت سے دھکا دے دیا گیا تھاتواب جاکے ہمارے پاؤں زمین پر ٹکے ہیں۔

ایک روز عبدالمنان سائیکل کے پیڈل مارتا ہوا جارہا تھا کہ اس کی نظر کپڑے کے ایک بینر پر پڑی جس پر درج عبارت کا مفہوم یہ تھا کہ جس نے اس پیشکش سے استفادہ نہ کیا، اس کی داستان بھی نہ ہوگی داستانوں میں! چنانچہ تقدیر کو اپنی لگام تھماکر وہ کشاں کشاں ہاؤس بلڈنگ کے دفتر جا پہنچا۔یہاں پھر قسطوں میں موت کا بڑا شاندار پیکیج تیار تھا۔خوش بیان برانچ مینیجر نے روزانہ کے لگائے ہوئے حساب کو دوبارہ کیلکولیٹر کی سان پر چڑھایا اور عبدالمنان کو مژدہ سنایا کہ تمہارے ریٹائر ہونے میں پورے اٹھارہ برس باقی ہیں۔اگر تم ہر ماہ اتنی ہی قسط نکال لو جتنی پلاٹ کے لیے پانچ سال ادا کرتے رہے ہو تو ہم تمہیں چار مرحلوں میں اتنے پیسے بسہولت دے سکتے ہیں کہ تم بقیہ حیاتی آبرو کے ساتھ اپنے گھر میں بتا سکتے ہو۔کرائے کے مکانوں میں عبدالمنان کو مسلسل جس 'ہتک' کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کے بعد خود کو ہاؤس بلڈنگ والوں کے سپرد کر دینا منٹو کی سوگندھی کی طرح بالکل فطری تھا۔یوں عبدالمنان مالکانہ حقوق والے معتبر سرکاری کاغذوں سے ڈیڑھ ہفتہ بھی دل نہ بہلا سکا اور یہ فائل گروی ہوکر ایچ بی ایف سی کے قبضے میں چلی گئی۔اگر یہ لوئر مڈل کلاسیا خود کو تسلی نہ بھی دیتا کہ میں قسط ادا نہیں کر رہا ہوں، اس گھر کا کرایہ ادا کر رہا ہوں جس کا 'بقلم خود' مالک ہوں، نیز اٹھارہ برس میں مجھے جو اصل رقم سے تین گنا زیادہ ادائیگی کرنا ہوگی وہ تب تک مکان کی سات گنا ویلیو کی صورت میں سامنے آچکی ہوگی۔۔۔تو پروفیشنل برانچ مینیجر کس مرض کا علاج تھا؟ اس کی ساحری مقروض کو شاید زیادہ بہتر انداز میں لوری دے کر سلا دیتی۔۔۔ عبدالمنان کو کچھ نہیں کرنا پڑا، بس ہاؤس بلڈنگ کے دفتر کے تیس چالیس چکر لگانے پڑے، بیس پچیس ہزار روپے پروسیسنگ فیس ادا کرنا پڑی، پانچ سات ہزار روپے بطور نذر گزارنے پڑے، مختلف دستاویزات کو پڑھے بغیر تین چار ہزار دستخط کرنا پڑے اور یوں بنیادوں اور چار دیواری کی شرط پوری کیے بغیر ہی اسے پہلا چیک مل گیا۔البتہ کسی گھاگ حرافہ کی طرح قرض خواہ محکمے نے اس کے ناتواں کندھوں پر احسان کا بھاری پتھر رکھ کر عمر بھر کے لیے اسے جھکا دیا کہ تمہاری طلب کی خاطر مجبور ہوکر ہم نے یہ مہربانی کی ہے ورنہ تو کیا اور تیری اوقات کیا!

یہ نہیں کہ عبدالمنان نے چمکتے دمکتے گھروں کی قطاریں نہیں دیکھ رکھی تھیں۔بنی اسرائیل کی رہائشیں اوران کی آرائشیں اس کے روزانہ کے مشاہدے کا حصہ تھیں۔مال روڈ اور جی او آر ز میں موتیوں کے یہ ہار وہ بلاناغہ دیکھا کرتا تھا۔ ڈیفینس بھی اس کے لیے ممنوعہ علاقہ نہیں تھا، لیکن ان مزین گھروں کے خیرہ کر دینے والے حسن و جمال کو اس نے اپنے تخیل کی غذا کے لیے محفوظ کر لیا اور ہاؤس بلڈنگ کی عطا فرمودہ چادر پر اپنے پاؤں پھیلانے کو کافی سمجھا۔یعنی چھتیں لنٹل کے بجائے گارڈر ٹی آئرن کی ڈالی گئیں۔فرش پتھر/ ماربل/ ٹائلز کے نہیں تھے۔ بجری سیمنٹ کے تھے۔بیسمنٹ، کارپورچ، انٹرنس لابی، ٹی وی لاؤنج، ڈرائنگ ڈائننگ سمیت کسی بدعت سئیہ سے گھر کو بے برکت نہیں کیا گیا۔ڈسٹمپر، ایملشن، پینٹ، کلٹن وال گلیڈنگ اور ویدر شیلڈ ایسی خباثتوں سے عبدالمنان نے مکان کو ہرگز آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ اپنے من ایسی بے داغ سفیدی سے گھر کو اجال لیا۔ دروازے لکڑی کے بجائے لوہے کے تھے۔کھڑکیوں وغیرہ کے حوالے سے ونڈو سلائیڈنگ، ورٹیکل بلینڈ، 1.3 ایم ایم یا 2 ایم ایم ایلومینیم فریمنگ کی بدتمیزی کی جگہ باعزت فولاد ہی کو زحمت دی گئی۔مرکری کوٹڈ شیشوں یا چمبیلی گلاس کی عیاشی کو ممنوع قرار دے کر سب سے سستے پلین شیشے نصب کرائے گئے۔باتھ رومز میں شاور کیبن اور چپس وپس کے چکر میں پڑنے کو فضول خرچی یقین کرتے ہوئے نہانے کے لیے ایک ٹونٹی اور تیز مسالے کے سمینٹ سے ضرورت کو پورا کیا گیا۔ فال سیلنگ، پلاسٹر آف پیرس، ڈمپا، جپسم بورڈ اور ہیٹ پروفنگ کو کفار کا شعار تسلیم کرتے ہوئے مسترد کر دیا گیا۔گھر کے ڈیزائن میں کہیں گولائی نہیں رکھی گئی اور نہ گھاس والا لان بنایا گیا کہ یہ افعال باغ ارم کے بانی شداد کی اعلانیہ پیروی کے مترادف تھے۔الماریوں میں بھی سیمنٹ ہی کے شیلف ڈال لیے گئے۔ان کے آگے پلائی وڈ کے کواڑوں کو اس لیے نہیں جوڑا گیا کہ عبدالمنان اسے حرام سمجھتا تھا۔ظاہر ہے عبدالمنان کے باطنی مدرسے میں براجمان مفتی نے یہ فتویٰ دل پر سل رکھ کر ہی دیا ہوگا کہ ایک فراخ، چابی تالے والی الماری اس کی دیرینہ آرزو تھی۔جس کے خانوں میں وہ اپنے ان نجی اثاثوں کو پورے پروٹوکول کے ساتھ رکھ سکے جنہیں برسوں سے وہ جست کے ٹوٹے ہوئے ٹرنک میں لیے لیے پھر رہا تھا۔اس کے یہ Assets دو طرح کے تھے:

1- رومانٹک

2- روزمرہ استعمال کی اشیا

پہلی قسم کی پونجی میں ایک زنبیل تھی، جس میں یقیناً چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط ہوں گے۔ان کے علاوہ جو نوادر تھے، ان کی تفصیل البتہ معلوم ہے۔مثلاً: دو عدد پیپر ویٹ، گیارہ عدد سوکھے ہوئے بال پوائنٹس، ایک چھوٹی سی ٹارچ، پیپسی کی خالی ڈسپوزایبل بوتل، پولی تھین کے دو لفافے، منی سی ڈائری، امپورٹڈ کھجوروں کے گتے کی خالی پیکنگ، دو دھلے اور استری کیے ہوئے دستی رومال، کپڑے کی ایک پوٹلی میں بندھی ہوئی پھولوں کی پتیاں، چھیالیس کاغذ کے ٹکڑے جن پر کسی محترمہ کے دستخط ہیں یا اس کے ہاتھ کی تحریر ہے، دو دعوتی رقعے، ایک نوٹ بک، اسی محترمہ کے دستخطوں سے تصدیق کی ہوئی سندیں، اسی محترمہ کی اے سی آر ز (جن کی فیس شیٹس کو اس خاتون نے اپنے ہاتھ سے فل کیا ہوا ہے، اندر آفیسر نے جانے کیوں کچھ نہیں لکھا، بالکل خالی اوراق)

دوسری نوع کی مملوکہ چیزیں شوقین مزاج عبدالمنان کے ذاتی تصرف میں رہتی تھیں۔ وہ ان کی بابت بڑا حساس تھا۔ ان کی حفاظت کا باقاعدہ بندوبست کرتا تھا۔ تفصیلات یہ ہیں:

دوٹوتھ برش، ایک ٹوتھ پیسٹ، نیل کٹر، سنی پلاسٹ کا پیکٹ، پانی سے بھری پلاسٹک کی دو بوتلیں، ایک ہیئر برش، شیونگ فوم، ہمدرد کی کیسری، قرشی کی دماغی، ایکسپورٹ کوالٹی کا موسم بہار کا شہد، ہیئر جیل، دو درجن ڈسپوزایبل ریزرز، ایک مگ، ایک ٹیبل سپون، چھلکا اسپغول، سعالین کے دو پتے، صدوری، شربت توت سیاہ، سوموجیل، برنال، برولی ڈین، پی کیم ٹیوب، شربت فولاد عرفانی، چھوٹی الائچیوں کا ڈبا، ریبی ٹیک (5۔ایم جی) کے دو پتے، بیکوزائم، سرٹیکس زیڈملٹی وٹامنز، سٹریپ سلز کمفرٹ (اورینج فلیور، لیمن فلیور)، شیونگ بوکس، زیتون کا تیل، قینچی، پرفیوم کی تین شیشیاں، باڈی سپرے، پولی فیکس، چیپ سٹک، وکس، جوارش انارین، کیونے 3 نمبر مع ڈویلپر 20 نمبر، ہینڈلوشن، سرنج (ون سی سی)، کین اوپنر، تھرمامیٹر، صابن کی ساڑھے تین سو چپریں، ٹوتھ پکس، کاٹن بڈز، لکس سوپ، ہیڈاینڈشولڈرز شیمپو (700 ایم ایل)، لوپرین اور موٹیلیم سیرپ۔

عبدالمنان ایک نارمل آدمی کی طرح اپنے مکان سے مطمئن بھی تھا اور غیر مطمئن بھی۔ یہ سچ ہے جو چیزیں انسان کی دسترس سے بہت ہی فاصلے پر ہوں، ان کا نہ ہونا نہ ملنا کوئی بے چینی پیدا نہیں کرتا۔ دنیا کے اربوں افراد واشنگٹن ڈی سی کے جھومر وائٹ ہاؤس کی قطعاً کوئی تمنا نہیں رکھتے اس لیے کہ وہ امریکی صدارت کے امیدوار ہی نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ لوگوں کا ہے۔ انسان تو صرف ان اشیا کے حصول کے تڑپتا ہے جو محض ایک آدھ قدم کی دوری پر ہوں، جن کا ملنا تھوڑا سا مشکل ضرور ہو مگر ناممکن نہ ہو۔ عبدالمنان جہاں اپنے کپڑوں جوتوں کے لیے وارڈ روب کی تمنا رکھتا تھا، وہاں اس کی یہ آرزو بھی تھی کہ ایک کمرا صرف اس کے لیے ہو، باتھ روم بھی پرسنل ہو۔ متعدد لوگ ایسے ہیں جو اپنے لیے کسی نہ کسی طرح گھر تو بنوا لیتے ہیں لیکن انہیں عمر بھر ذاتی خواب گاہ میسر نہیں آتی۔ عبدالمنان بھی لاکھوں بچوں کی طرح لڑکپن تک اپنے ماں باپ کے ساتھ سوتا رہا۔ جب خود باپ بن گیا تو اپنے بچوں کو ساتھ سلانے پر پابند تھا۔ اگر کبھی یہ قدغن اٹھ بھی جاتی تب۔۔۔ تب بھی وہ (بدقسمتی یا خوش قسمتی سے) بستر پر اکیلا نہیں ہوتا تھا۔ کمرے میں اپنی مرضی کا ٹمپریچر اس کی وہ خواہش تھی جو تیزی سے حسرت میں بدلتی جارہی تھی۔

ہاؤس بلڈنگ سے ملنے والے قرضے سے جب گراؤنڈ فلور مکمل ہو گیا تو اس کے سرد و گرم چشیدہ آفس سپرنٹنڈنٹ شہباز خان نے اسے بڑا قیمتی مشورہ بالکل مفت دے دیا کہ اگر تم لگتے ہاتھ پہلی منزل پر دو کمرے بھی بنوا لو تو کل کلاں ہر قسم کی کل کل سے بچ جاؤ گے۔ گھر میں رہ کر تعمیر کے کام سے بڑا جہنم اور کوئی نہیں۔ عبدالمنان نے ہنس کر کہا:

''اب تو میرے پاس شیونگ کریم خریدنے کے پیسے بھی نہیں رہے!''

شہباز خان بولا: Where there is will there is a way! اگر تم جی پی فنڈ ایڈوانس لے لو اور اس کے مساوی رقم بطور پیشگی کرایا میں ادا کر دو تو بتاؤ بیٹھے بٹھائے تم ڈبل سٹوری گھر کے مالک نہیں بن جاؤ گے؟

اگرچہ عبدالمنان نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ بحیثیت مالک مکان بھی وہ ایک چار دیواری میں کرایا دار سے واسطہ نہیں رکھے گا لیکن اس نے ایک ہی لمحے میں سوچ لیا، تین سال کا کیا ہے پلک جھپکتے میں بیت جائیں گے۔ بھلے ہی شہباز خان میرے اوپر رہے گا لیکن ہوگا تو میرا کرایا دار، گویا اوپر تو میں ہی رہوں گا۔ پھر یہ ارضی قربت دفتر میں بھی بہتر تعلق کی بنیاد بنے گی۔ آخر میری سالانہ اے سی آر اسی بدبخت نے تو لکھنی ہوتی ہے۔

آٹھ ماہ کا کام گیارہ ماہ پر ضرور پھیل گیا مگر مکان منہ متھے لگنے جوگا ہو گیا تھا، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ انسان جب حد سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو فطرت اس سے انتقام لیتی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ وہی ہوا؛ پتہ نہیں یہ کامک ٹریجیڈی تھی یا ٹریجک کامیڈی؟ کہ جس دن نئے گھر میں پرانا سامان شفٹ ہو رہا تھا، جانے شادی مرگ کی وجہ سے یا کسی اور کارن عبدالمنان کے بائیں بازو میں درد کی نامانوس سی لہر اٹھی اور اس نے پہلے ہی مرحلے میں موٹی سی گالی دے کر فہمائش کی، خبردار! دل کے درد جو تو نے سر اٹھایا کہ یہ امیر امرا کی بیماری ہے۔ کلرکوں کے منہ لگنا تیرے منہ پر نہیں پڑتا مگر وہ بھول گیا تھا کہ وہ صرف نادار ہی نہیں خوددار بھی ہے۔ انانیت اور حساسیت دونوں سگی بہنیں مل کر اکثر درد دل کی دولت سے مفلس و قلاش کو بھی فیض یاب کر دیا کرتی ہیں اور عبدالمنان کو اگلے ایک ماہ میں سرکاری ہسپتالوں میں تعینات ماہرین امراض قلب نے یہی اطلاع دی کہ آپ کے دو والوز بند ہیں۔ اپنی انجیوگرافی کی فلم لے کر وہ ہر اس ڈاکٹر کو دکھالایا جس تک وہ پہنچ سکتا تھا۔ سب چارہ گروں کا اجماع تھا کہ بائی پاس آپریشن ہی واحد علاج ہے۔

اس دوران میں عبدالمنان اپنے پرابلم سے پیہم اپنے دوست اور کرایادار شہباز خان کو آگاہ کرتا رہا۔ وہ اسے چونکہ کچھ بھی نہیں دے سکتا تھا اس لیے مشورے مسلسل دیتا رہا۔ دراصل عبدالمنان سرجری کے عمل سے گریز پا تھا۔ ایک حد تک اس وجہ سے بھی کہ وہ چیر پھاڑ سے ڈرتا تھا اور شہباز خان نے اسے مزید خوفزدہ کر دیا کہ اعداد و شمار کے مطابق ہارٹ سرجنز آدھے مریضوں کو آپریشن تھیٹر سے گھر واپس جانے کی اجازت دیتے ہیں، باقی آدھے کسی انڈر ہینڈ ڈیل کے تحت عزرائیل کے سپرد کر دیتے ہیں۔ دیکھو میاں! پرائیویٹ ہاسپٹل سے آپریشن کے لیے کم از کم چار لاکھ روپے درکار ہوں گے۔ گورنمنٹ سرونٹ ہونے کی رعایت سے سرکاری ہسپتال سے سوا ایک لاکھ روپے میں بیٹنگ ہارٹ سرجری ہو تو جائے گی مگر کسی سفارش سے بھی چھے سال سے پہلے کی ڈیٹ نہیں ملے گی۔ تب تک ویسے ہی دوبارہ جی اٹھنے کا مرحلہ آچکا ہوگا۔ بھائی میرے! اگر بالفرض تم گھر بار بیچ باچ کر آپریشن روم میں لمبے پے بھی جاؤ اور واپس ڈیڈ باڈی آئے تو تمہیں کتنے نفلوں کا ثواب؟ باقی یہ تو اب تک ہوا نہیں کہ سرجری کے بعد جنرل وارڈ میں شفٹ ہونے والے کو انفیکشن کا تحفہ نہ ملا ہو۔ ننانوے فیصد مریض ہیپاٹائٹس کی سوغات لے کر لوٹتے ہیں اور ایک آدھ سال میں ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر اگلے جہان

کی سیاحت پر روانہ ہوجاتے ہیں۔ اپنے بال بچوں کو بے گھر کر کے خود آخری آرام گاہ میں جا لیٹنا کہاں کی دانائی ہے؟ اس سے بہتر ہے پورے صبر و رضا اور خاموشی کے ساتھ مس موت کا انتظار کیا جائے۔ جب یہ عفیفہ آ جائے تو خوشی خوشی اس کی گداز بانہوں میں بانہیں ڈال کر عدم آباد کے سفر کو اختیار کر لیا جائے۔

یاسیت کے فلسفے کے پرچارک شہباز خان کی گفتگو سن کر عبدالمنان پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ اپنی بے وقعتی، بے بسی اور بے چارگی پر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس کی آواز بھرا گئی:

''خان صاحب! آپ سچ کہتے ہیں مگر بیوی، بچے، نیا گھر۔۔۔ یہ سب کچھ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا!''

شہباز خان چمک کر بولا:

یرا! یہ جو حیات ہے، کیا کوئی بامعنی مقام ہے؟ ایک دم لایعنی! بے معنویت پر معنویت کے نقرئی اور زریں ورق چڑھا چڑھا کر اسے پرکشش بنانے کی ناکام مساعی صدیوں سے جاری ہے۔ جناب! بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ دس برس، پندرہ برس، بیس برس، پھر بس؟ تب بھی تو قبر کے گڑھے میں اترنا ہے۔ ہم جانے کیوں اپنا مردہ خواب کرتے ہیں، بندے دے پتر بن کر موت کی حقیقت کو قبول نہیں کرتے۔ ویسے جی کر کرنا بھی کیا ہوتا ہے؟ وہی بے کار دن، وہی بے کار راتیں!

عبدالمنان کا بے طرح جی چاہا کہ کہہ ڈالے:

شہباز خان! تم نے اب تک خودکشی کیوں نہیں کی؟

لیکن ایک تو وہ پٹھان کا پوت تھا، کیا خبر اگلی گھڑی اولیا سے بھوت بن جائے؛ دوسرے یہ کہ وہ بہرحال اس کا دفتر میں امیجیٹ باس تھا، سوچ میں مصلحت سمجھی! شہباز خان نے لال بجھکڑ کی طرح مزید علمی رعب ڈالنے کے لیے عبدالمنان سے کہا: برخوردار! میں تمہیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ تم اس بھرے پرے شہر کا سروے کر کے اعداد و شمار جمع کرو اور پھر مجھے آ کر بتاؤ کتنے گھروں کے صحنوں میں قبریں ہیں؟ اگر تمہیں ایک گھر بھی ایسا مل جائے جس کے آنگن میں اس کا مالک مٹی کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو رہا ہو تو میں اپنے خیالات سے اعلانیہ دستبردار ہو جاؤں گا اور زندگی کی جمال آفرینی پر ایمان لے آؤں گا۔ کاکا خان! جس اولاد کو دنیا والے سب سے عظیم Incentive قرار دیتے نہیں تھکتے، وہی اولاد، بابے کو چارپائی پر لاد کر فی الفور قبرستان میں لے جاتی ہے اور ضرورت سے بھی زیادہ گہرا ٹویا کھود کر اسے اس اچھی طرح دبا دیتی ہے کہ اگر وہ زندہ بھی ہو جائے تو کسی طرح اس تاریک تہہ خانے سے باہر نہ نکل سکے۔ ارے! موت کی موجودگی میں حیات کو کیسے بامعنی ثابت کیا جا سکتا ہے؟ ناممکن! ناممکن! ناممکن! مجمعے میں دوائیں بیچنے والے اتائی ایسے خطیبانہ اسلوب کا جادو، سادہ خاطر عبدالمنان کے سر چڑھ کر اس طرح بولا کہ ایک بہت ہی عجیب لمحے کے حصار میں محصور ہو کر اس نے دو، دو ٹوک فیصلے کر لیے۔ ایک یہ کہ اپنی زندگی کی خاطر وہ باقیوں کو جیتے جی مارنے کی خودغرضی کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ دوسرے یہ کہ اس نے وکیل کے ذریعے باقاعدہ قانونی وصیت کر ڈالی کہ مرنے کے بعد مجھے میرے گھر کے صحن میں دفن کیا جائے!

جب عبدالمنان کی یہ وصیت مشتہر ہوگئی تو گھر میں دفعتہً پٹس پڑ گئی۔ اس کی حور تڑپ اٹھی: آپ کو میری عمر لگ جائے! ایسی منحوس بات منہ سے نکالنے کا آپ نے سوچا بھی کیسے؟ بیٹیاں بھی فرطِ غم سے نڈھال ہوگئیں، البتہ اس کے دونوں بیٹوں نے کسی خاص ردعمل کا مظاہرہ نہ کیا کہ آخر مرد تھے۔

ڈاکٹر عبدالمنان کو بالکل واضح طور پر یہ تو نہ بتا سکے اس کے والوز کب سے بند ہیں؟ تاہم اتنا انہوں نے ضرور کہا کہ ایسا ایکا ایکی نہیں ہو گیا۔ یقیناً چند سال سے یہ مسئلہ خاموشی سے آپ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ گویا یہاں بھی قصور عبدالمنان ہی کا نکلا کہ اس نے بغیر کسی علامت کے اپنا چیک اپ کیوں نہیں کرایا؟ لیکن ایک بات اس کم عقل کے پلے نہیں پڑ رہی تھی کہ جب تک اس نے اپنے ٹیسٹ نہیں کرائے تھے، اس کی صحت بہتر تھی، مگر جب سے غیر تسلی بخش رپورٹس ٹائپ ہوئی تھی، وہ مسلسل ڈاؤن ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لحیم شحیم تو وہ پہلے بھی نہیں تھا پر اب تو استخوانی ڈھانچے کو جیسے کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ خاص طور پر اس کے رخساروں کے گوشت کو جبڑوں کے ابھار نے گویا پچھاڑ دیا تھا۔ یوں وہ تیزی سے ہڈیوں کی مالا بنتا جا رہا تھا۔ ایلوپیتھک دواؤں کے سائیڈ افیکٹس، خوراک کی کمی، ذہنی دباؤ۔۔۔ سب کچھ مل ملا کر لاغر عبدالمنان کو کسی انجانی وادی کی جانب دھکیل رہا تھا۔ اب تو اس کی سائیکی ایسی متاثر ہوگئی تھی کہ ادھر دوسری چپاتی کو ہاتھ لگاتا، ادھر بائیں بازو میں درد کی ٹیس اٹھنے لگتی۔

کسی واقف کار کے کہنے پر اس نے لہسن اور ادرک کا پانی، سیب کا سرکہ اور لیموں کا رس شہد کے ہمراہ نہار منہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس محلول کی تلخی اور تیزابو اگرچہ بے حد ناگوار تھی لیکن حکیموں طبیبوں پر اعتقاد رکھنے والے بھولے بھالے مشیر بھی پیر پرستوں کی طرح غیر ضروری یقین سے چھلک رہے ہوتے ہیں! مگر کیا ہے کہ یہ مجرب اور تیر بہدف قسم کا نسخہ عبدالمنان کے لیے ذرا بھی مفید ثابت نہ ہو سکا۔ اسی مخلص کے کہنے پر شام سے پہلے نہر کنارے ایک گھنٹا برسک واک بھی اس نے معمول کا حصہ بنالی، لیکن اس کی اکتاہٹ اور یکسانیت سے عاجز آ کر وہ چلتے چلتے خود کلامی بھی کرتا جاتا: ''گریڈی ڈاگ! صرف جینے کے لیے یہ مشقت برداشت کر رہے ہو؟''

عبدالمنان نے کون سی سو پچاس تدبیریں اختیار کی تھیں جو ان کے الٹا ہونے پر وہ شاکی ہوتا؟ نیز دوائیں بھی ڈسپنسری مارکہ ہی تھیں۔ اگر انہوں نے کام چھوڑ دیا تھا تو گلہ کیسا؟ ایک رات کے پچھلے پہر لیٹے لیٹے اسے احساس ہوا کہ سامنے دیوار پر چند پر ہیبت سائے بے ربط سا رقص کر رہے ہیں۔ اس سے کچھ ٹھیک ٹھیک تعین نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟ خواب میں خواب کا خوف اسے مضطرب کر رہا ہے یا بے رحم بے داری کے اندیشے میں گھرا وہ آنکھیں موندنے کی کوشش کر رہا ہے؟ اس مخمصے سے نکلنے کے لیے اس نے اپنے بیٹے کو پکارنا چاہا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ دو لفظوں پر مشتمل صدا کو صحرا عبور کرنا پڑے گا۔ شدید پیاس اس صحرا کے رقبے میں مزید وسعتیں پیدا کرنے لگی تو وہ پوری قوت سے چیخا، مگر یہ چیخ اس کے اپنے وجود میں منجمد سناٹے کو بھی نہ توڑ سکی۔ گردن

پر نادیدہ آہنی انگلیاں اگر اپنی گرفت سخت تر کر لیں تو آنکھیں کس طرح باہر کو ابلتی ہیں اور پورا جسم کیسے تڑپتا ہے؟ یہ تجربہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ اس پر اترا۔ رینگتی ہوئی سیاہ چٹان نے اس پر مکمل وزن ڈال کر جیسے ہی فطری بے دردی سے بھینچا، ہڈیاں پسلیاں چیخ اٹھیں، ٹینٹوے میں خرخراہٹ کی گراریاں الٹی سیدھی گھومیں یعنی نرخرا بولا اور ساتھ ہی پسینے میں شرابور سریر کی مشکل آسان ہوگئی۔ بے جان ہونا بہرحال بے جان ہو جانے سے بڑی نعمت ہے اور ہر انسان کی طرح عبدالمنان کے حصے میں بھی بڑی نعمت نہیں آئی تھی۔

اگلے دن تجہیز و تکفین کے مراحل طے ہونے لگے تو یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ مرحوم کی وصیت پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ سوادِ اعظم کا فتویٰ یہی تھا کہ مرنے والے نے جانے کس جذباتی لمحے میں یہ عجیب و غریب سی وصیت کر ڈالی تھی۔ اس باب میں وہ بارگاہ خداوندی میں خود جواب دے لے گا۔ ہمارا فریضہ یہی ہے کہ اسے عام دستور کے مطابق قبرستان میں سپردِ خاک کر دیں تاکہ کسی فتنے کا دروازہ نہ کھلے۔ قریب تھا اس کی میت کو گورستان کی طرف روانہ کرنے کے انتظامات حتمی مراحل طے کرنے لگتے کہ پیدائشی سرخ سرخ آنکھوں والا اس کا سب سے بڑا اور سب سے اتھرا بیٹا بہرام اکڑ گیا:

''ابا کی وصیت پر لازماً عمل ہوگا! چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے!''

اس پر کرایا دار شہباز خان کا ردعمل نہایت شدید تھا۔ وہ مشتعل ہو کر عبدالمنان کے اس آتش مزاج بیٹے سے دست و گریباں ہونے تک گیا۔ اسے جب بیروں میں گٹھلیاں ملتی صاف نظر آئیں تو اس نے مجمعے کے سامنے اچھی خاصی تقریر جھاڑ ڈالی کہ گھر میں تدفین شرعاً، اخلاقاً، روایتاً کسی طرح جائز نہیں۔ میں مرحوم کے بارے میں کوئی نامناسب کلمہ زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا لیکن مجبوراً مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ میرا یہ دوست تھوڑا نہیں کافی کھسکا ہوا تھا۔ میرے دھمکی آمیز اصرار کے باوجود وہ اپنے علاج معالجے پر رضامند نہیں ہوا۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس نے آتما ہتھیا کی ہے، جان بوجھ کر اپنی جان گنوائی ہے۔ باقی آپ کی تشفی مولوی صاحب کرا دیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے آنکھ کے اشارے سے اپنے بلائے ہوئے ملاجی کو خطاب کی دعوت دے دی۔ انہوں نے بھی نہایت متانت کے ساتھ، بڑے ہی نستعلیق لہجے میں، غایت درجہ ذمہ داری سے یہی فقہی مشورہ دیا کہ گھر میں مدفن بنانا کسی طرح عقلی، نقلی جواز نہیں رکھتا۔ اس اثنا میں وکیل صاحب بھی کہیں سے آن ٹپکے۔ انہوں نے اخلاق، شرع، فقہ، عقل، نقل، معاشرہ، رواج، روایت، رسم وغیرہ کے بیچ میں سے بڑی صفائی سے قانون کی بالادستی نکال لی۔ اس کے باوجود عین ممکن تھا کہ وکیل صاحب کے ساتھ مک مکا کر کے مرحوم اور اس کی وصیت کو ایک ساتھ قبرستان میں دفن کر دیا جاتا، اگر عبدالمنان کا جوشیلا بیٹا بہرام اپنے کسی دوست سے رائفل لے کر نمودار نہ ہو جاتا۔

اس غیر متوقع صورت حال پر سب دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈے پڑ گئے، کہیں ایک جنازہ پڑھتے پڑھتے دو چار اور نہ پڑھنے پڑ جائیں! ویسے بھی شام کے مردے کو کب تک روتے؟ خیر اس کے بعد بڑا ہی دلچسپ منظر نامہ سامنے آیا، عبدالمنان کا جنازہ اٹھا، سو گز کے فاصلے پر واقع ہائی سکول کی گراؤنڈ میں لے جایا گیا۔ نماز جنازہ ہوئی اور میت کو اسی راستے سے دوبارہ گھر میں لے آیا گیا۔ جیسے ایک ہی گھر میں رہنے والی فسٹ کزن سے شادی ہو تو دولھا اپنی برات کے ساتھ محلے کا چکر لگا کر بدھو کی طرح لوٹ کر اپنے ہی گھر میں آ جاتا ہے، جہاں دلھن پہلے سے اس کی منتظر ہوتی ہے۔

اس اثنا میں گھر کے صحن میں قبر کھد چکی تھی جس میں عبدالمنان کی مٹی کو گڑھے سے برآمد ہونے والی مٹی سے رلا ملا کر اسپیڈ بریکر ٹائپ مروج ابھار پیدا کر دیا گیا۔ لیجیے جو نظیر جیتے جی عبدالمنان تین دن گھوم پھر کر بھی شاید تلاش نہیں کر سکتا تھا وہ اس نے مر کر پیش کر دی۔۔۔ اگلے چند ہفتوں میں عبدالمنان کا مکان ''قبر والا گھر'' کے نام سے مثالی شہرت حاصل کر چکا تھا۔۔۔ ابھی عبدالمنان کی بیوہ حور نے عدت کی مدت بھی مکمل نہیں کی تھی کہ شہباز خان کی کولمبسانہ سوچ نے ایک اور امریکا دریافت کر لیا۔ بس اس فرق کے ساتھ کہ اصل کرسٹوفر کولمبس بے وقوف تھا جو ہندوستان پہنچنے کے لیے گھر سے نکلا اور سمندر کی سطح پر ناچتی بے حد چمکدار روشنی پر ریجھ گیا۔ اس Luminous water کے سراب میں وہ کسی اور ہی دنیا کے ساحل سے جا لگا، یوں اس سے اتفاقاً امریکا دریافت ہو گیا، جبکہ طرار شہباز خان نے کافی پہلے سے کرایا دار سے مالک مکان بننے کے لیے ہوم ورک شروع کر رکھا تھا۔ سرکاری دفاتر کی سیاہی اور سیاحی میں اس کی عمر گزری تھی، اس لیے اسے خوب خبر تھی کہ ہاؤس بلڈنگ کا مقروض چونکہ انشورڈ ہوتا ہے، لہٰذا اگر وہ مرنے کی ہمت کر لے تو سارا قرضہ رائیٹ آف ہو جاتا ہے۔ اس پر مستزاد حاضر سروس سرکاری ملازم مر کر سوا لاکھ کا ہاتھی ہو جاتا ہے۔ یہ جملہ تناظرات ہمہ وقت شہباز خان کے مدنظر رہتے تھے مگر سلسلہ جنباں کے لیے اس نے نقطۂ ماسکہ حور کو بنا رکھا تھا۔ پھر دو بیویوں کا خاوند ہونا کون سا انوکھا واقعہ ہوتا؟ بلکہ پانچ بچوں کی ماں سے عقد کر کے اسے نیلوکاروں سے آشیر باد ہی ملنا تھی۔

اس راہ میں عبدالمنان کی اولاد رکاوٹ بن سکتی تھی مگر حور کے راضی ہونے کی صورت میں شہباز اسے کیوں خاطر میں لاتا؟ ہاں بیوی کو نکاح ثانی کے بعد پہلے شوہر کی پنشن سے دستبردار ہونا پڑتا تھا اور شہباز خان یہ نقصان برداشت کرنے کے لیے ابھی پوری طرح ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ تاہم یہ دونوں قابل ذکر رکاوٹیں نہیں تھیں۔ اصل رکاوٹ خود عبدالمنان تھا جو گھر کے صحن میں آ کڑ کر پڑا ہوا تھا۔ کوئی چھے ماہ کے بعد شہباز خان نے جب حور سے اس موضوع پر بڑے حساب سے گفتگو کی تو وہ جیسے پہلے سے منتظر بیٹھی تھی۔ دونوں نے سب سے پہلے اس پہلو کا معروضی بنیادوں پر جائزہ لیا کہ مبلغ ساڑھے نو ہزار روپے کی ماہانہ پنشن سے ہاتھ اٹھا لینا کہیں جذباتی فیصلہ تو نہیں ہوگا؟ شہباز دل سے چاہتا تھا کہ وہ حور سے نکاح پڑھا لے لیکن دماغ سے چاہتا تھا کہ کسی طرح مرحوم کی ذات سے وابستہ صدقہ جاریہ یعنی پنشن بھی موقوف نہ ہو۔ سرکاریں بھی کٹھور ہوتی ہیں، آنکھوں پر پٹی باندھ کر فیصلے کرتی ہیں۔ تاہم اس دوران میں بن پھیرے ہم تیرے، کے مطابق حور کی رضامندی ہوگئی۔ یعنی نکاح کی رسم بوجوہ ادا نہ ہو سکی۔ شہباز خان کی بیوی ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ہیڈ نرس تھی، اس کے تینوں بچے سارا دن

سکولوں اور ٹیوشن سنٹروں میں گزارتے تھے، عبدالمنان کے بچے بھی سکولوں کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ شہباز خان کو شارٹ لیو کی عادت سی ہوگئی تھی۔ اس طرح حور اور شہباز نے اس گھر میں 'راز و نیاز' کے لیے تنہائی تلاش کر لی تھی، جو پوری نفری کی حالت میں نکونک بھرا ہوتا تھا۔

لیکن دونوں کے لیے اصل مسئلہ پھر وہی عبدالمنان تھا جو صحن میں صرف اس نیت سے لیٹا ہوا تھا کہ رنگ میں بھنگ ڈالنی ہے! شہباز اور حور اس ایک سوا سال میں ایک دوسرے کی اس درجہ ضرورت بن گئے کہ انہوں نے بہرحال طے کر لیا کہ نکاح ناگزیر ہے۔ بھلے ہی حور کو پنشن سے اور خود شہباز خان کو پہلی بیوی سے دستبردار ہونا پڑے۔ دونوں جذباتی ہو گئے تھے، اسی لیے گھاٹے کا سودا کر رہے تھے، وگرنہ شہباز کی نرس بیوی نے تین چوتھائی گھر اپنی آمدن سے اٹھا رکھا تھا۔ باقی شہباز خان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ دوسری شادی پر پہلی بیوی واویلا کرتی ہے؛ رو رو کر جی ہلکان کر لیتی ہے؛ رشتہ داروں کو اکٹھا کر لیتی ہے؛ پلوتے اور بددعائیں دیتی ہے لیکن چند ہفتوں میں رو دھو کر صبر کر لیتی ہے اور اول تو گھر چھوڑ کر سوکن کو واک اوور اور فری ہینڈ نہیں دیتی۔ اگر طنطنے میں میکے جا بھی بیٹھے تو جلد ہی واپس آ کر آدھی سلطنت کا چارج لے لیتی ہے، لیکن نکاح سے پہلے ضروری تھا کہ کسی طرح اس عبدالمنان سے جان چھڑائی جائے۔ بھلا جس ہٹ دھرم اور ڈھیٹ کو گھر کے صحن میں دفن ہونے سے نہ روکا جا سکا تھا۔ اس گڑھے مردے کو اب اکھاڑنا کیا ایسا سہل عمل تھا کہ وقت کی گزران اس کی جڑوں کو کافی مضبوطی عطا کر چکی تھی۔ سو، اس چار دیواری میں اسے 'زندہ پیر' کا مرتبہ حاصل تھا۔

باہمی مشاورت سے ایک یہ حل بھی زیرِغور آیا کہ یہ گھر ہی فروخت کر دیا جائے تاکہ عبدالمنان اپنی پسندیدہ جگہ سے ہی قیامت کو کفن جھاڑ کر کھڑا ہو اور خود زندگی کو آگے بڑھائیں۔ پر عشق کی طرح یہ مرحلہ بھی ایسا آسان نہیں تھا۔ ایک تو یہ کہ شہباز گھر کو بیچنے کا مجاز نہیں تھا، اگر حور کو ڈھال بنا کر وہ ایسا کر بھی گزرتا تو سدِ سکندری ایسی عبدالمنان کی اولاد کو کیسے پرے ہٹاتا؟ ایسا گھر جس میں ان بچوں کا باپ دفن تھا، اسے فروخت کرنا باپ کو بیچ ڈالنے کے مترادف تھا۔ کم از کم اس استخوان فروشی کی بابت سنتے ہی شہباز کا بڑا بیٹا وہی ہٹیلا، غصیل اور ناری صفت بہرام جو بندوق اٹھا کر آ گیا تھا، اب مغضوب الغضب ہو کے کیا کچھ نہیں کر گزرے گا؟

پھر بھی شہباز خان اور حور نے اندر واندری مکان فروخت کرنے کی منصوبہ بندی جاری رکھی کہ مکان کے مالکانہ حقوق چونکہ بیوہ کو ٹرانسفر ہو چکے ہیں لہٰذا جب لکھت پڑھت ہو جائے گی تو نیا مالک اپنے آپ قبضہ بھی لے لے گا۔ علاوہ ازیں اس بڑے رپھڑی یعنی بہرام کو چھوڑ کر باقیوں کو جب پانچ کی بجائے پندرہ مرلے پر مشتمل بہتر گھر کی کشش دکھائی دے گی تو ان کے ذہن بھی بدل جائیں گے۔

شہباز خان کے کہنے سننے پر گاہک براہ راست اور پراپرٹی ڈیلرز کی وساطت سے مکان دیکھنے آتے رہے۔ اکثر تو گھر میں قبر دیکھ کر ہی توبہ توبہ کرا اٹھتے اور کانوں کو ہاتھ لگا کر یوں بھاگتے کہ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھتے۔ جیسے یہ کوئی آسیب زدہ کھنڈر ہو اور جو مضبوط اعصاب کے کاروباری تھے، وہ ''قبر والا گھر'' ہونے کی وجہ سے آدھی سے بھی کم قیمت لگاتے۔ حور کو تاؤ پر تاؤ آتا کہ تیلی خصم کیا، پھر بھی روکھا ہی کھایا! شہباز خان اپنی دانست میں جھک بالکل نہیں مار رہا تھا۔ ایک تو عبدالمنان کی بیوہ کو سرکار نے مبلغ ساڑھے سترہ لاکھ روپے کی خطیر رقم دے کر غریبنی نمانی سے سرفراز اقبال کر دیا تھا۔ جس پانچ مرلے کے گھر کی وہ مالکن تھی، اگر اصل مالک کی قبر سے پاک ہوتا تو کسی طرح بیس لاکھ سے کم کا نہیں تھا۔ پھر حور ایسی اسم بامسمیٰ تھی کہ کسی بھی پہلو سے وہ بیوہ لگتی تھی نہ پانچ بچوں کی ماں۔ اس قدر موہنی صورت لے کر آئی تھی کہ کسی کلرک کی بیوی ہونے کا کوئی منقول و معقول جواز کار گر نہیں ہو سکتا تھا بجز اس کے وہ چٹی ان پڑھ تھی اور اس کا باپ نائب قاصد تھا۔

جب شہباز اور حور کو گھر میں خلوت میسر آتی تو حور کو کھویا کھویا محسوس کر کے شہباز اچانک برافروختہ ہو جاتا اور عبدالمنان کی قبر کی طرف منہ کر کے گالیاں بکنے لگ جاتا: سالا مرغی نچاؤنی کا! ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے لیے چوڑا ہو کر پڑا ہوا ہے۔ مردود! جا کہیں دور قبرستان میں مر! عجیب بے ہودہ اور گھٹیا شخص ہو؛ کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے، کی کمینگی پر ڈٹے ہوئے ہو۔ بے حیا! صرف میری وجہ سے تو جان بوجھ کر یہاں دفن ہوا تھا۔ پر تو نے کیا اکھاڑ لیا میرا؟ بے غیرت! تیرا وہ بندوبست کروں گا کہ فرشتے بھی تجھے ڈھونڈتے پھریں گے۔

اور پھر اپنی کشادہ کھوپڑی میں موبائل شیطانی ورکشاپ رکھنے والے شہباز خان نے وہ لرزہ خیز بندوبست کر ہی لیا، جس کی بابت سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جائیں! حور اور شہباز کے مابین چند ماہ کی گٹ مٹ کے بعد طے پا گیا کہ سردیوں کی کسی مناسب دھند آلود رات کو سب گھر والے جب نشہ آور چائے کے زیر اثر گہری نیند سو رہے ہوں تو اس نحس کی قبر کھودی جائے اور گورکن کی مدد سے عبدالمنان کی ڈیڈ باڈی کو قبرستان میں تیار شدہ قبر میں دفن کر دیا جائے۔ یوں سانپ بھی مر جائے گا، لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی، یعنی قبر اپنی ظاہری صورت میں موجود بھی رہے گی اور اس کم بخت کی واہیات اور بے جا مداخلت سے جو چھین ہمارا مسلسل مقدر بنی ہوئی ہے، اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات بھی مل جائے گی۔

شہباز خان نے عجلت کا قطعاً مظاہرہ نہیں کیا کہ اس عیار کو معلوم تھا، ٹوٹی کمان میں دونوں کو ڈر ہوتا ہے۔ نہایت حزم و احتیاط سے اس نے دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھائے تھے۔ آخر جنوری کے وسط میں اسے کہر میں لپٹی راتیں ملیں تو سب سے پہلے اس نے قبرستان کے ویران ترین حصے میں قبر کھدوائی، نیا کفن خریدا، دو گورکنوں کی خدمات کا بھاری معاوضہ ادا کیا، بغیر ڈرائیور کے ایمبولینس کرائے پر حاصل کی۔ غرض سارے انتظامات اس نے خود کیے۔

جب سب اہل خانہ انتہائی غفیل، بے غل و غش نیند کی پراسرار وادیوں میں گم تھے تو نصف شب کو وقت مقررہ کی کھدائی کا کام شروع ہو گیا۔ گورکن ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے کہ انہیں اندر سے بھربھری، پھرولی ہوئی تازہ مٹی مل رہی تھی جبکہ قبر سوا دو سال پرانی تھی۔ ان کے خیال میں مٹی کی تہوں کو سخت ہونا چاہیے تھا۔ جب ساری مٹی ہٹائی جا چکی اور کنکریٹ کی چاروں سلیبز

بالکل صاف نظر آنے لگیں تو شہباز کا دل اس بری طرح دھڑکا کہ بے اختیار اس کا جی چاہا گورکنوں سے کہہ ڈالے:

''بس! رہنے دو— خدا کے لیے اپنے ہاتھ روک لو—!''

مگر وہ ایک لمحہ تھا، آیا اور چلا گیا۔ متوقع بدبو سے بچنے کے لیے شہباز خان نے ناک سمیت اپنا منھ سفید صافے سے اچھی طرح لپیٹ لیا۔ گورکنوں نے اسے تسلی دی: باؤجی! فکر نہ کریں زیادہ بُو شُو نہیں آئے گی۔ بس پہلے تین چار مہینے ہی زیادہ اوکھے ہوتے ہیں۔ اس وقت تک چمڑا گل سڑ رہا ہوتا ہے اور پیٹ تو پہلے دن ہی پھٹ جاتا ہے۔ بھیجا، انتڑیاں، ماس، منھ سے نکلنے والی جھاگ، کلیجا، دل، گردے، پھیپھڑے، مسوڑھے، زبان، اوجھڑی، کھال، شال۔۔۔ سارا گوشت پوست کیڑے مکوڑے ایک ڈیڑھ سال میں مکا مکو دیتے ہیں۔ پوشش اتر جائے تو باقی انجر پنجر ہی رہ جاتا ہے اور ہڈیوں کے ڈھانچے میں خاص سڑانڈ نہیں ہوتی۔

شہباز خان نے اس دوران میں محسوس کیا جیسے کسی گلے سے رندھی رندھی سی آواز نکل رہی ہے۔ وہ معاً گھبرا گیا، پھر دوڑ کر سامنے کمرے میں گیا تو کھڑکی کی جالی سے لگی حور ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ اس نے دوپٹے سے اپنا منھ چھپا رکھا تھا اور وہ بید کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس نے شہباز خان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے: ''رب کے واسطے! یہ کام نہ کرو، انہیں یہیں روک دو— ہم یہ گھر چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں گے— عبدالمنان کو قبر کی آغوش سے جدا نہ کرو!—!'' شہباز خان نے سختی سے اپنا کھردرا ہاتھ حور کے منھ پر رکھ دیا: ''او کمزور مخلوق! خدا کے لیے چپ کر جا، اب کام بالکل آخری مرحلے میں ہے؛ ہمت کر، تو ابھی جوان ہے، سوہنی ہے، جینے کے لیے لمبی حیاتی پڑی ہے۔۔۔'' یہ کہتے کہتے اس نے حور کا گال چوما تو آنسوؤں کی نمکینی سے اس کا دہن بھر گیا۔ وہ صافے کے کونے سے اپنے ہونٹ پونچھتا ہوا صحن میں آ گیا۔

مٹی کے کافی بڑے ڈھیر کے ساتھ ایک چارپائی رکھی گئی تھی جس پر کفن کی چادر بچھی ہوئی تھی تاکہ میت کو پہلے یہاں رکھ کر نئے سرے سے لپیٹا جائے اور پھر لکڑی کے تابوت میں ڈال کر بقیہ کارروائی کی جائے۔ ایک گورکن نے زور لگا کر پاؤں کی طرف والی سلیب ہٹائی تو دوسرا گورکن آہستہ سے لحد میں اتر گیا تاکہ اپنے سینے کے برابر آنے والی سلیبوں کو ایک ایک کر کے اٹھا لے، لیکن اس کے پاؤں نے کسی ڈھانچے کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا۔ خیر اس نے دوسری سلیب اٹھا کر اوپر کھڑے گورکن کے سپرد کر دی جس نے ہولے سے اسے پاس پڑی مٹی کی ڈھیری پر ٹکا دیا۔ اب وہ ایک قدم بڑھا اور تیسری سلیب بھی اٹھا دی جسے خود شہباز خان نے آگے بڑھ کر وصول کیا۔ اس گھڑی بھی اس کے ننگے پاؤں نے کنج لحد میں کسی وجود کو موجود نہ پایا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ٹارچ طلب کی اور جب اس نے پوری طرح جھک کر 'بلیک ہول' کا اچھی طرح جائزہ لیا تو اسے عبدالمنان تو کیا! کسی انسان نام کی کوئی چیز وہاں سے نہیں ملی۔ ہڈیوں کا ڈھانچا تو کیا ادھر کفن تک نہیں تھا۔

وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ عبدالمنان غیر مرئی طریقے سے نقل مکانی کر کے کہاں چلا گیا؟ لیکن چند دن بعد حور نے شہباز خان سے پوچھا:

''یہ مواسکیلی ٹن' (Skeleton) کیا ہوتا ہے؟''

تو وہ پانی پیتے پیتے یوں اچھلا جیسے کالی بھڑ نے اپنا ڈنک اس کے تالو میں گاڑ دیا ہو! کسی ماہر تفتیشی کی طرح بائیں آنکھ بھینچ کر بڑی بے صبری سے بولا:

''تم نے یہ لفظ کہاں سے سنا؟''

''یہی کوئی تین ہفتے پہلے بہرام نے فون پر اپنے کسی دوست سے بات کرتے ہوئے یہ لفظ دو تین بار ادا کیا تھا۔''

شہباز خان کی زبان نے تیزی سے حرکت کی: بول بول! اور کیا کہا تھا اس نے؟

''اسی سے ملتے جلتے لفظ کے ساتھ اس نے 'گرافی' کر کے بھی کچھ بولا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ پرائیویٹ میڈیکل کالج والے اسی صورت میں تین سے چار لاکھ روپے ادا کرتے ہیں اگر اس کا ہر جوڑ موڑ چول مول موجود ہو ایک بھی 'جانٹ' کم نہ ہو۔''

شہباز خان نے حور کی وضاحت پر طویل سانس لی اور بڑی معنی خیز ہنسی ہنسا:

اللہ کی بندی! ''جانٹ'' نہیں ''جوائنٹ!'' پھر وہ کافی دیر اپنے آپ میں محو مسکراتا رہا اور نیم مترنم آواز میں بولا نہیں باقاعدہ گنگنایا:

''اگر پدر نتواند پسر تمام کند!''

لیکن افسوس! سادہ لوح حور کو انگریزی کی طرح فارسی بھی نہیں آتی تھی، سو وہ کچھ نہ سمجھی!!

بقیہ : دھوپ عہد کے افسانے

بیوی کے بستر پر لے جاتا ہے، وہ بظاہر کوئی مزاحمت ظاہر نہیں کرتی لیکن:

''اس کا بدن برف باری کے بعد، شفاف آسمان سے اترنے والی اوس کے سبب، جمنے والی کہرے کی سخت اور موٹی تہہ کے مانند، ٹھنڈا یخ تھا___ اس کے بدن کا لمس پاتے ہی میری رگوں میں دوڑتا خون جم کر رہ گیا!!'' (ص:۹۳)

اگر اپنے مرد کے لیے کسی نوع کی Reservation عورت کے حساس ذہن میں Clot بن گئی تو اس کا نتیجہ Frigidity کی صورت سامنے آئے گا، جو فریق ثانی کو بھی منجمد کر سکتا ہے۔۔۔ بلاشبہ برٹرینڈ رسل ایک اعلا آدرش کا ترجمان ہے جو 'محبت' کی رفعت کو دو اشخاص کے بیچ محدود کرنے کا قائل نہیں۔ اس کا خواب ہے کہ محبت کی مقصدیت کو دو افراد کے باہمی روابط سے ماورا ہونا چاہیے تاکہ لامتناہیت (Infinity) کے ساتھ جڑ کر یہ بیرونی دنیا پر بھی اثرات مرتب کرے۔۔۔ لیکن یہ سپنا اسی شکل میں آگے بڑھے گا جب حال کی گھڑی میں دو لوگ محبت کے تکمیلی عمل سے خود سرشار ہوں۔ اگر وہی تشنہ کام رہے تو الفت مستقبل کے ساتھ یہ کوئی رشتہ قائم نہیں کر پائے گی!!

"محبوب کی اُمت"

حمد

لفظوں میں کیسے پروؤں تری عظمت اللہ
کس طرح سے کروں آخر تری مدحت اللہ

اپنے محبوب کی امت میں کیا ہے پیدا
مجھ پہ یہ ہے تری سب سے بڑی رحمت اللہ

ہونی کر دینا زمانے کی ہر انہونی کو
صرف اور صرف یہ ہے آپ میں قدرت اللہ

زندگی اور اسے جینے کے تمامی اسباب
تیری ہی تو ہیں عطا اور عنایت اللہ

کیا کرشمہ ہے ترا ایک مرض نے میرے
بخش دی ہے مرے دل کو تری الفت اللہ

باپ ماں بھائی بہن سے بھی نہیں ہوسکتی
اپنے بندوں سے جو تجھ کو ہے محبت اللہ

پھر رہا ہوتا ہر اک در پہ جھکاتا سر کو
جو نہ ملتا ترا در بہرِ عبادت اللہ

لے کے میں نام ترا کرتا ہوں جو کام شروع
اس میں کس درجہ سمو جاتی ہے برکت اللہ

ذکی طارق (بارہ بنکوی)

نعتِ رسول مقبولؐ

محبّت ہو جس کو، حضور ، آپؐ سے
وہ کیسے رہے اتنا دُور آپؐ سے؟

مرے حال سے آپ آگاہ ہیں
کہوں کیا مَیں بین السّطور آپؐ سے

کہاں وُہ کہیں اَور سے مل سکا ؟
جو دُنیا نے پایا شعور آپؐ سے

مُجھے بارِ دیگر طلب کیجئے
مری عرض ہے یہ حضور، آپؐ سے !

عنایت کے طالب ہیں یا مصطفیٰ
مرے حل طَلَب سب اُمور آپؐ سے

بہر لحہ ہیں لَو لگائے ہوئے
شعور آپؐ سے، لاشعور آپؐ سے

سبھی اہلِ دانش کی درخواست ہے
ملے آگہی و شعور آپؐ سے

خدا کی بھی پہچان اُسی سے ہوئی
جو پھیلا ہے دنیا میں نُور آپؐ سے

حضور آپ پر ہے عیاں حالِ دل
کہے کیا دلِ نا صبور آپ سے

جو ہوتا نسیم آپؐ کے عہد میں !
جو ہوتی عطا اِک کھجور آپؐ سے

نسیم سحر (راولپنڈی)

زمین گول ہے

آغا گل
(کوئٹہ)

بہت دنوں بعد اسے مینا کا فون آیا۔

''کیسے ہو؟ ذرا اپنا ویٹ سیپ نمبر کھولو''

اتفاقاً وہ دفتر میں اکیلا ہی تھا۔ سرکاری دفاتر وہ چڑیا گھر ہیں جہاں دفتر میں پھدکتے غراتے کاٹتے افسر اپنی بہار دکھاتے ھیں۔ لوگ اس سے ملنے خیریت دریافت کرنے آتے، شادی کے موقعہ پر دولہا سے زیادہ اہمیت افسروں کو ملتی۔ کیونکہ افسر ہی سرکار ہیں۔ فون کی بگینگ عام تھی اور آقا کے پاس تمام زبانیں جاننے والے ملازم تھے جو فوراً ہی بات کا مطلب بیان کر کے رکھ دیتے۔ ویٹ سیپ پر مینا آ گئی۔

''ایک کنیز فروخت کرنا چاہتی ہوں، اگر اچھی بولی لگاؤ۔ بہت کم عمر ہے، نا تجربہ کار زیرو میٹر کمپنی پیکنگ'' امجد کو تاؤ چڑھا۔

''تم جانتی ہو کہ کنیزوں کا پہلے تو گاہک معائینہ کرتے، تسلی کرتے اور اس کے بعد بولی شروع ہوتی۔ کبھی موبائیل پر بھی بولی لگی؟ چڑھار کھی ہے کیا؟''

مینا بھی خوشگوار موڈ میں تھی۔

''وہ زمانے لد گئے کب کے، اب میں کیا میزان چوک میں نمائش لگاؤں۔ اس بار قیمت پہلی والی سے ڈبل ہوگی''

امجد بھاؤ تاؤ کرنے لگا۔

''تم جانتی ہو کہ بجٹ میں بھی کٹ لگ گیا ھے۔ وہ حسین زمانے بھول جاؤ اب تو پورا ملک ہی کشکول بدست پھرتا ھے، کبھی ان کے در کبھی در بدر''

مینا نے آنکھیں بدل لیں۔

''اچھا کوئی اور در تلاش کرتی ہوں۔۔۔''

امجد بے تاب ہو گیا۔

''کتنی بے مروت ہو، بھاؤ تاؤ تو کرنے دو''

مینا آسمان پہ تھی۔

''مال اچھا ہو تو قیمت نہیں دیکھی جاتی قدر دانوں کا شہر ہے۔۔۔ یہ کوئی سینٹ کا ٹکٹ یا دوبئی مارکیٹ کا کوٹ نہیں۔۔۔ میرا کیسے گزارا ہوتا ہے، جانتے ہو؟''

امجد جانتا تھا کہ مول تول کا وقت نہیں ہے۔

''کب آ رہی ہو؟''

مینا نے فیصلہ سنا دیا۔

''تمہارے گھر، پانچ بجے کچھ کھانے پینے کے لیے بھی رکھنا''

امجد کے گھر پہ اکثر فریادی آیا کرتے۔ نوکری کے متلاشی بھی کسی سفارشی کے ہمراہ سی۔ وی لیئے پہنچ جاتے۔ اسکول اور کالج کی بے معنی اور بیکار تعلیم کے بعد نوجوان میرکاغم، سندھ کی فتح، علاؤالدین خلجی کی مارکیٹ پالیسی۔ اکبر کی مذہبی پالیسی۔ دوقومی نظریئہ اور مسلم لیگ کے علاوہ اور کچھ نہ جانتے۔

چونکہ پرائیویٹ سیکٹر اور کاروبار کے لیے وہ ناموزوں ہوا کرتے اس لیے سبھی سرکاری نوکری کی پنکچر بس پہ چڑھنے کی کوشش کرتے۔ دفتر میں بھی رجسٹر میں حاضری لگانے کے علاوہ کوئی کام نہ ہوتا۔ اس پہ مستزاد کہ سال میں چالیس روز تنخواہ کے ساتھ حقی چھٹی (Leave Earned) بھی ملتی۔ جس کے باعث وہ چلہ لگانے خدا کی راہ میں چل دیتے۔ تنخواہ حسب سابق ملتی رہتی اور جب بال سفید ہونے لگتے تو پنشن ملنے لگتی اور فوت ہو جاتے تو پھر ان کی بیوہ کو پنشن ملتی۔ یہی سبب تھا کہ بوڑھے افسروں سے کوہ قاف کی پریاں بھی شادی کے لئے پر تولنے لگتیں کہ چند ہی روز میں واصل جنت ہوگا تو ان کی تنخواہ لگ جائے گی، جس کے باعث بے روزگار ہیرو بیوہ پر ریجھ جاتے اور شادی کر لیتے۔

مینا کے کام دھندے میں رازداری اور پابندئ وقت کی اہمت تھی۔ وہ وقت پر چلی آئی، غریب غرباء کو مہمان خانے میں بٹھایا جاتا تھا۔ جبکہ ہم رتبہ یا روساء کو ڈرائینگ روم میں احترام سے لایا جاتا۔ وہ ڈرائینگ روم ہی دولت مندی کا مظہر تھا، جس میں گھوڑے کی اصل کھال کے صوفے اور قیمتی فرنیچر کے علاوہ بخارائی اور تبریز بچھے تھے۔

مینا کے ساتھ ایک سہمی ہوئی خوفزدہ لڑکی تھی، جس کے ہاتھ میں اسکی سی وی کا لفافہ تھا۔ اسکا خوف دور کرنا بھی ضروری تھا، وہی بے معنی تعلیم والا بی اے کر کے آئی تھی۔ جس کا زمانے اور عصر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ امجد نے چائے منگوائی کچھ دلاسہ دیا تو لڑکی کے ماتھے کے بل کھلے وہ سخت پریشان تھی۔ باتوں ہی باتوں میں پتہ چلا کہ اس کی دو اور بہنیں بھی ھیں۔ اچھی بھلی خوشگوار زندگی تھی کہ اچانک ہی اسکے باپ کی کسی سے آنکھیں چار ہوئیں نازنین کا تقاضہ تھا کہ وہ عمر کو بھی نظر انداز کر دے گی مگر شرط یہ ھے کہ پہلی بیوی کو طلاق دے، اور اس گھرانے سے قطع تعلق کر لے۔ بیکل ابا نے شرط مان لی اور بیوی کو طلاق کا ایک کاغذ تھما کر نکل لیا۔ اسکی بیٹیاں قدموں سے لپٹ گئیں۔ رونے بلبلانے سے محلّہ جمع ہو گیا۔ سبھی نے روکنا چاہا۔ چار شادیوں کی سہولت یاد دلائی، مگر وہ پکا عاشق تھا مارتا کاٹتا نکل گیا۔ دنیا کا کوئی قانون اسے روک نہ سکتا تھا۔ اور مقدمہ بازی جیسا شوق ایک مطلقہ کے بس سے باہر ہوا کرتا ھے۔ اسے خدشہ تھا کہ انصاف مانگنے کی کوشش میں عدالتوں میں اسکی بیٹیوں کی بلی چڑھ جائے گی۔

اسے خالدہ پر بڑا ترس آیا وہ بہانے سے مینا کو کمرے میں لے گیا۔

''مجھے تو اس پر بڑا ترس آ رہا ہے۔ کمینگی میں اس کے باپ اور مجھ میں بھلا کیا فرق ہوگا؟ ویسے ہی اسے کچھ رقم دے دیا کروں''

مینا نے بہت سے موسم دیکھے تھے۔

''تم ہو تو پاپی، مگر تمہارے دل میں کچھ انسانیت باقی ہے۔ تبھی تو تمہارے پاس لائی ہوں''

امجد تذبذب کا شکار تھا، پتہ نہیں کس گھونسلے سے بوٹ اچک لائی تھی۔

''تم اسے کچھ کام دے دو، اس کا خرچ چلے۔ ورنہ پتہ نہیں اسکا کیا حشر ہو''۔ مینا کے چہرے پر پریشانی تھی۔

امجد نے دوبارہ نشست سنبھالی۔

''دفتر میں تو فی الحال جگہ نہیں ہے۔۔۔''

خالدہ کے چہرے پر سیاہ ابر آلود رات اتر آئی۔ وہ بیحد سہم گئی۔

''اس لیے تم میرے ساتھ، میرے گھر پہ کام کرو''

خالدہ کی آنکھوں میں زندگی کی رمق لوٹ آئی۔ اس نے شاخ تھام لی۔

''میں ہر کام کرنے کیلئے تیار ہوں، کبھی شکائیت کا موقعہ نہ دوں گی''

وہ التجاؤں پر اتر آئی تھی خوف اسکے حسن کو گہنا رہا تھا۔

امجد ایک فکشن رائٹر تھا اس نے سوچا کہ اگر خالدہ کمپوزنگ کرے تو اس کا کام آسان ہو جائے گا، ورنہ تو کمپوزر اتنی غلطیاں کرتے ہیں کہ انکا سر اتارنے کو جی چاہتا ہے۔ اسے وہ لطیفہ بھی یاد تھا کہ پکاسو کو کمپوزر نے پوری کتاب میں پکاسور کر دیا۔ اور کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آ گئی۔

کمپوزنگ کے بہانے یوں روز ملنا بھی آسان ہوگا، ساتھ رہنے ہی کا نام تو محبت ہے۔ تنخواہ کے لیے اس نے خالدہ سے پوچھا، وہ اس قدر معصوم اور انیلی تھی کہ اس نے ڈرتے ڈرتے نو ہزار بتائے۔ امجد نے قہقہہ لگایا۔

''تمہیں شائد اندازہ نہیں کہ زندگی کس قدر مہنگی ہے۔ اور ہاں تم اچھا کام کرو تو میں تنخواہ بڑھا بھی دوں گا فی الحال میں بیس ہزار دیا کروں گا''

اتنی بڑی تنخواہ کا سن کر خالدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ اتنا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

امجد نے ڈانٹا۔

''بہادر بنو! مجھے بہادر لوگ اچھے لگتے ہیں''

امجد نے ٹشو پیپر بڑھایا۔

''یہ تمہارے آخری آنسو ہیں، آنسو دکھوں کا مداوا نہیں''

امجد والٹ نہیں رکھتا تھا ربڑ بینڈ لگا کر نوٹ رکھتا۔ جو اکثر ادھر ادھر گر جایا کرتے۔ یا پھر موبائیل جیب سے نکالتے ہوئے باہر جا گرتے۔ وہ اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا - امیروں کے نوٹ بینکوں کے لاکروں میں عمر قید کے سزا بھگتتے ہیں اور اسکے نوٹ زندہ مینڈکوں کی طرح اچھل کود کرتے ہیں۔

''یہ آدھے ماہ کی پیشگی تنخواہ، اور یہ رہا رکشے کا کرایہ''

خالدہ کو یوں لگا کہ جیسے وہ کوئی حسین سپنا دیکھ رہی ہو، مینا کو وہ ساتھ کے کمرے میں لے آیا۔

''یہ تمہاری پہلی قسط ہے، ایک دو روز میں باقی بھی ادا کر دوں گا'' مینا نے نوٹ گنے اور گلے کے اندر انڈیل لیے۔

''یہ قیمت اسکی ایک آنکھ کی تو ہو سکتی ہے، پوری خالدہ کی نہیں۔ تم اتنے کنجوس کیوں ہو گئے ہو''

مینا سے جھوٹ بولنا کچھ سہل بھی نہ تھا۔

''تم جانتی ہو بجٹ پر کٹ لگ گیا، میں کچھ غریب ہو گیا ہوں''۔ مینا تڑ سے بولی۔

''یہ غریبوں کے شوق نہیں، تم کچھ اور ھابی رکھ لو، مرغیاں پالو، کبوتر اڑاؤ یہ لونڈیاں کنیزیں رکھنا امیروں کے شوق ہوتے ہیں''

امجد نے کچھ نوٹ نکال کر اس کے کھلے گلے کے تکلو میں ڈال دیئے۔

''غصہ کیوں کرتی ہو مینا کچھ پرانے تعلقات کا تو لحاظ کرو''

مینا نے سگریٹ سلگائی۔

''تمہیں ڈھیلی کمانی والی جیپیں اچھی نہیں لگتیں۔ تمہاری محبت میں سب کچھ کرتی پھرتی ہوں۔ ورنہ مارکیٹ بہت اوپر جا رہی ہے''

خالدہ بہت سہمی سہمی سی تھی، اور فکشن کمپوز کرنے لگی۔ کوئٹہ میں سہ پہر سے مغرب تک ایک ایسی روشنی پھیلی رہتی ہے جو دکھائی تو نہیں دیتی۔ مگر شہریوں میں Anixiety اور Depression پیدا کرتی ہے، مغرب کے بعد وہ خود ہی سدھر جاتے ہیں۔ اب ان تکلیف دہ اوقات میں وہ خالدہ کے پہلو میں آ بیٹھتا اسے مشکل لفظوں کی وضاحت کے علاوہ اپنی لاپرواہی سے لکھے گئے الفاظ کی وضاحت بھی کرنا ہوتی۔ امجد کے بے حد اصرار پہ وہ آپ سے تم پر اتر آئی تھی۔

امجد چاہتا تھا کہ عمر کا فاصلہ طرز گفتگو سے ہی پاٹ دیا جائے۔ خالدہ روائیت کی پابند تھی۔ اس لیے ایک حد تک بے تکلفی کے بعد وہ ٹھٹھر گئی۔

''تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہوگی''

وہ بارہا یہ کسیلی دوائی نگل چکا تھا۔

''ٹھیک ہے، مجھے کچھ وقت چاہیے، مگر میری زندگی حسین کر دو۔ بہت ہی Drab life ہے''

خالدہ کو اس پہ بھروسہ تھا۔

''ٹھیک ہے میں چند ماہ انتظار کر لوں گی، مگر تم کو حلف اٹھانا ہوگا کہ پھر تم شادی کر لو گے''

امجد نے اگلے ہی روز مشہدی رومال منگوایا۔ فسانہ آزاد کی صحت مند جلد چہارم کو رومال میں باندھ کر گرہ لگا دی، امجد کے دونوں ملازم چیلو کے تھے، اپنے کام سے کام رکھتے، وہ خالدہ کو کمرے میں پہنچا کر چائے کوفی کا اہتمام کرتے۔ اس روز بھی خالدہ سیٹ پہ بیٹھی تو امجد نے فسانہ آزاد پہ ہاتھ رکھا۔

''میں قسم کھاتا ہوں اس کتاب کی تم سے ضرور شادی کروں گا، تین ماہ کے اندر'' پنڈت رتن ناتھ سرشار کی روح تڑپ اٹھی ہوگی۔ مگر خالدہ نے رومال کھولنے کا تردد نہ کیا۔ عمر کے اس فرق کے باوجود وہ شادی کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ ماں انتہائی ڈپریشن کے باعث جو ایک آدھ گولی حلق سے اتار لیا کرتی وہ اسکی خوراک ہی بنتی چلی گئی۔ زیادہ وقت وہ مدہوش رہتی۔ دونوں چھوٹی بہنیں پڑھ رہی تھیں، گھر کا نظام امجد نے سنبھال لیا تھا، وہ کبھی ان کے گھر نہ جاتا اور نہ ہی ان تعلقات کی تشہیر ہونے دیتا۔

امجد کی بیوی امریکہ اپنی بہن سے ملنے گئی تھی، اور پھر وہیں کی ہو رہی۔ اس کی بہن نے بھی اکسایا کہ ایک مرد کی غلامی کی بجائے وہ اپنی پسند کی زندگی گزارے، اپنے جسم پر ریاست کا قبضہ نہ ہونے دے۔

'' تمہارے ہاں عورت بستر میں جائے تو ریاست اور طاقتور ادارے بھی گھس پڑتے ہیں۔ یہ Moral adultry نہیں تو اور کیا ہے؟''

امجد اس کی طویل غیر حاضری سے خوش تھا، سارا دن جاسوسی کرتی، سوالوں کی بارش کرتی کبھی موبائیل میں نئے نمبر تصویریں تلاش کرتی۔ اب زندگی میں سکھ آ گیا تھا۔ بیوی ایک ناقابل علاج بلڈ پریشر ہے ٹانسلائیٹس ہے۔ ابھی قسم کے تین ماہ پورے ہونے کو تھے کہ خالدہ کا میسج آیا۔

''بہت بہت شکریہ میری مدد کی، یہ احسان یاد رکھوں گی، شائد مشہدی رومال والی کتاب چھپانا بھول گئے تھے۔ وہ فسانہ آزاد نکلی۔ مجھے ڈبل تنخواہ پہ کام مل گیا ہے۔ کل سے نہیں آؤں گی''

امجد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ زندگی کول پور بن گئی تھی، جیسے تربت کی سیاہ رات، وہ گاڑی دوڑاتا مینا کے گھر پہنچا۔ مینا سرِ شام رہ حافظ و خیام پہ چل نکلنے کی عادی تھی۔ عشاق رفتہ رفتہ مجمل سے کھسکتے شہر کے ہجوم میں شامل ہوتے رہے تھے۔ ماہ وسال نے مزید دھکیلا تو وہ Catch Siding میں کھڑی پرانی مسافر بوگیوں کی طرح اکیلی رہ گئی۔ چند تھکے ہوئے شاعر اچھی وہسکی تلاشتے اس کے گھر چلے آتے۔ اس نے ملازم کے طور پر ایک خواجہ سرا رکھ چھوڑا تھا، اس وقت وہ اکیلی تھی۔ پہلا پیگ چل رہا تھا۔

امجد آندھی اور طوفان کی طرح اندر داخل ہوا۔ بجائے اسکی بات سننے کے خالدہ نے اپنا پیگ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ امجد کے سلگنے سے مسرور ہو رہی تھی۔

''زیادہ تڑپنے بلکنے کی بات مت کرو، اس دھندے میں سب چلتا ہے''

امجد نے مینا کو سب کچھ بتا دیا۔

''اسے واپس لاؤ مینا، بڑی رقم دوں گا''

مینا کو وہسکی چڑھ چکی تھی پرانے میخوار کی طرح وہ دوسرے پیگ پر ہی ڈگمگانے لگی۔

''عوام پر پھینکا آنسو گیس شیل اور بانہوں سے نکلی عورت کبھی واپس نہیں آتی، اسے بھول جاؤ، میں کوئی اور لے آؤں گی''

امجد کو سخت تاؤ چڑھا۔

''لے آؤں گی؟ کیوں جمعہ بازار لگا ہے کیا؟''

مینا اب قابو سے نکل چکی تھی۔

''جب سماج کے اندر صرف دو ہی قومیں امیر اور غریب رہ جائیں تو صرف Glamour بکتا ہے، عورت بکتی ہے، جنگوں میں بھی عورت ہی بکتی آئی ہے۔ تم اسی دوقومی نظریے والے ملک میں رہتے ہو۔ وہ تمہارے منسٹر کے پاس کام کرنے لگی ہے''

امجد کے ہاتھ سے گلاس چھوٹنے کو تھا۔

''وہاں کیا کام کرتی ہے؟''

مینا نے قہقہہ لگایا۔

''ہائے میرے سادے بلم! وہاں بھی کمپوزنگ کرتی ہے اسے صرف کمپوزنگ ہی آتی ہے''

وہسکی نے امجد کو بہادر بنا دیا تھا اس نے پستول تان لیا۔

''یہ تمہاری کمینگی ہے۔ ابھی تمہاری کھوپڑی اڑاتا ہوں''

مینا نے لاپرواہی سے پیگ بنایا۔

''یہ ذلت آمیز اکیلی زندگی ختم کر دو، مہربانی، کرم ہوگا، چلاؤ گولی''

امجد کچھ دیر مینا کو دیکھتا رہا پھر پستول اندر کی جیب میں ڈال لیا، منا سا گلوک 26 جیبوں کے لیے ہی بنا تھا۔ جس سے میناؤں نے بھی کب کا ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ للجا کے رہ گیا۔

''تم کس قدر کمینی ہو، مینا دھوکے باز''

وہ دشنام طرازی پر اتر آیا۔ مینا نے اپنا نیا پیگ اسکے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''ہمارے دھندے میں سب چلتا ہے''

امجد میں طاقت نہ تھی کہ منسٹر سے الجھتا وہ ایک طاقتور سردار اور متعدد قتل کے واقعات کا ذمہ دار سمجھا جاتا، رات بہت ہی تکلیف دہ اور طویل ہوگئی تھی۔ اگلے ہی روز اسے او ایس ڈی بنا دیا گیا۔ ساتھ ہی اسے خالدہ کا میسج موبائیل پر آیا۔ وہ ایک دو روز میں ہی معصوم سی لڑکی کی بجائے سلومی بن چکی تھی۔ اسے لگا خالدہ کے اندر سلومی جھلک رہی ہے سلومی، جس نے ہیرودیس بادشاہ کو ایک رقص سے مسحور کر کے انعام میں یوحنا نبی کا سر انعام میں مانگا تھا اور یوحنا اطباغی کا سر بطور انعام سلومی کو تھال میں مل بھی گیا تھا۔

''دھوکے باز فراڈی، میری جانب سے یہ short warning سمجھو نوکری بھی جا سکتی ہے۔ مجھ سے معافی مانگنے کا یہ آخری موقعہ ہے''

وہ بہت دیر تلملاتا رہا۔ او ایس ڈی کا مطلب ہے کلاشنکوف کی فائر پن جواب دے جائے، یا ejector کام چھوڑ دے۔ جیسے رانجھے کے تیر نکلے بن جائیں۔ خالی افسری بے اختیار!! وہ بہت پریشان رہا۔ جنگل کی آگ کی طرح بات پھیل چکی تھی کہ صاحب سرکس کے بورڈ کا شیر بن چکا ہے۔

اس شام نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مینا کے ہاں جا نکلا۔

''میں جانتی تھی کہ تم آؤ گے''

امجد بہت حیران ہوا

''وہ کیسے؟''

مینا نے پیگ تھما دیا آج وہ وڈکا پی رہی تھی۔

''تمہیں خالدہ سے محبت نہیں ہے۔ اپنی تنہائی سے ڈرتے ہو، تم تنہا نہیں ہونا چاہتے، ایک لڑکی سے اکیلے میں معافی مانگنے میں کیا رسوائی ہے۔ ویسے بھی Male Shauvinism ہے اس کی بات پر کون یقین کرے گا۔ خالدہ سے معافی مانگ لو، وہ تم سے محبت کرتی ہے تم اسے اچھے لگتے ہو''

امجد اب مینا کو تحقیر بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم نے خالدہ کو دوبارہ فروخت کیا، سوچتا ہوں تمہیں کیا سزا دوں محبت تھی تو چھوڑ کیوں گئی؟''

مینا نے حسب سابق کوئی اثر نہ لیا جیسے امجد لکڑی کی تلوار چلاتے پینترے بدل رہا ہو۔

مینا ہنسی ''اپنے پروڈکٹ کو بار بار فروخت کرنا ہی مارکیٹنگ کا کمال ھے۔ اوران کی شخصیت میں بناتی ہوں تمہیں بچپن کا کوئی Complex ہے، وہی چاہتے ہو، معصوم بھولی بھالی تمہاری ہر بات پر یقین کرنے والی۔ میں grooming کر کے لاتی ہوں۔ اسٹیج کی Prompter ہوں"

امجد نے موبائیل تھما دیا۔

''مینا بول رہی ہوں، کل پانچ بجے امجد کے گھر آنا''

جانے خالدہ نے کیا جواب دیا کہ مینا ہنس دی اور سرزنش کی۔

''تم مینا سے بات کر رہی ہو دوبارہ کشکول پکڑا دوں گی۔ کوئی اور خالدہ لے آؤں گی۔ ورنہ پانچ بجے''

امجد وقت کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔ گھڑی ٹک ٹک کر کے چلتی رہی جیسے شہر کے چوک میں Inquisition Court نے لکڑیوں کے ڈھیر پر باندھ کے بٹھا رکھا ہو اور پورا شہر ہی آگ بھڑکنے کے انتظار میں اپنی چتا میں جل رہا ہو امجد موت اور زیست کے درمیان کلاک پینڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔ وہ دن کو نہیں پیتا تھا۔ مگر نارمل ہونے کے لیے اس نے عمر خیام کا اتباع کیا۔ خالدہ دو ہی روز میں بیس برس بڑی ہو گئی تھی۔ کھڑکھڑاتے ہوئے رکشہ کی بجائے لیموزین نما لمبی سرکاری کار میں آئی، جیسے ایک بڑا سا کمرہ ٹائروں پہ چل رہا ہو۔ امجد اپنی انا کے اندھے غار سے تڑپ کر نکلا اور خالدہ کو گلے سے لگا لیا۔ وہ بالکل بونی سی تھی اسے پنجوں پر اٹھ کر اپنا قد بڑھانا پڑا تھا۔

''مجھے معاف کر دو خالدہ''

اس نے نہایت ہی سچائی سے اقرار کیا۔

''اس جھوٹے معاشرے نے مجھے بھی جھوٹ سکھا دیا۔ اب ہمیشہ سچ بولوں گا۔ صرف تم سے! ورنہ تو کب کا مارا جاتا۔ تمہارا دل جیتنے کے لیے جھوٹ بولا مجھے معاف کر دو''

خالدہ نے اسے حیرت زدہ کر دیا کہ اسے ایڈوائیزر لگایا جا رہا ہے۔ وہ خالدہ کے تعلقات پہ حیران نہ ہوا ویسے بھی چوبیس سے چھبیس سالہ لڑکی ہی سرکار کی ایڈوائیزر لگائی جاتی ھے۔ خالدہ ہی سہی! خالدہ نے الماری کھول کے پیگ بنائے وہ مینا بنی ہوئی تھی۔

''تمہارے پاس آنے سے پہلے مینا نے کئی جاب دلوا دیئے تھے۔ پھر میں اوور ٹائم بھی لگانے لگی''

امجد کا چہرہ دہک اٹھا دل چاہا کہ ایک دو چانٹے لگا کر خالدہ کو چلتا کرے، مگر گھر کے کونوں کھدروں میں چھپے تنہائی کے بھوت غرّانے لگے۔

اس نے گھبرا کر غیرت کی چادر اتار دی۔

''تم عورت کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذاتی ملکیت کیوں سمجھتے ہو؟ کہاں ھے ٹیپ ریکارڈر کیسٹ فلموں والا؟ کیمرہ، فیکس مشین؟ سب کچھ بدلا تو سماج بھی بدل گیا۔ یاد ہے کبھی Matriarchy ہوا کرتی تھی۔ ایک عورت کئی مردوں سے شادی کرتی، وہی قبیلے کی سردار بھی ہوتی، یہی نظام کب کا لوٹ آیا ہے، تم لوگ سوئے ہوئے ہو''

امجد نے گھبرا کر پورا پیگ حلق میں انڈیل لیا۔ ''خالدہ شائد سچ کہہ رہی ہے''

وہ من ہی من میں کانپ اٹھا۔

خالدہ نے اپنا قیمتی فون نکالا۔ نئی شخصیت کے ساتھ وہ نویں نکور تھی۔

''سردار کیا حال ھے؟ کیسے ہو؟''

دوسری جانب کی آواز سنانے کے لیے خالدہ نے مائیک آن کر دیا۔

''میں نے کہا تھا امجد کو کھڈے لین لگا، اب اسے۔۔۔''

سردار بہت خوش ہوا۔

''حکم کرو کیا اسے گولی مارنا ہے؟ صبح ہی اخبار میں خبر لگ جائے گی''

خالدہ نے قہقہہ لگایا۔

''تمہاری وفا کی عزت کرتی ہوں، اسے دوبارہ اچھی جگہ پر لگا دو''

سردار بھی ہنس دیا۔

''اتنے چھوٹے چھوٹے کام بولتی ہو۔ کوئی بڑا حکم دو''

خالدہ حسب سابق خوشگوار موڈ میں تھی۔

''کل میں آرڈر لینے آؤں گی، مگر صبح زبانی حکم پر اسے سیٹ پر بٹھا دینا''

امجد کا دماغ معطل ہو چکا تھا ''اتنے بڑے اجڑ میں تم کیوں مجھ پہ مرتی ہو؟''

خالدہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تمہارے ہاتھ میرے ابو جیسے ہیں، جب میں پہلی بار ملی تو مجھے لگا تم ہی مجھے تحفظ دو گے، اسی لیے میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس گھر کو جوڑنا چاہتی ہوں۔ جو میرے ابو نے توڑ دیا۔ مجھے مرد کا تحفظ چاہیے''

وہ بھولی بھالی کب کی چلتر بن چکی تھی۔ اس کی شخصیت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ شائد اسے مرد ہونا چاہیے تھا۔

امجد نے فون کر کے مینا کو بھی بلا لیا۔

''آج تم ہماری مہمان ہو ادھر آ جاؤ''

مینا انہیں اکٹھا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

''کوئی کنویں میں گرے تو اسے باہر نکالنا چاہیے خالدہ حالات کا شکار ہوئی ہے، تم اس کا ہاتھ تھام لو''

اس شام ان کا سخت Catharsis ہوا۔ جو جی چاہا بولا، خوفزدہ ہوئے بغیر باتیں کیں۔ وہ باتیں جن پر سر اتار دیتے ہیں۔ امجد سمجھ گیا کہ خالدہ کے ذہن

میں دبے اور چھپے صنوبر کی جڑوں کی طرح گہرے Complex Electra کے باعث وہ اسے پسند کرتی ھے۔ شائد اسکی عمر یا مشفقانہ انداز تھا۔ یا شائد کچھ Atypicalinterest جبکہ خود اسکی اپنی شخصیت بھی بچپن کے تجربات کے باعث Paedophilia کا شکار تھی۔ خالدہ نے اپنے گھر فون کر دیا تھا۔ کہ وہ اگلے روز آئے گی، اور مینا کا تو کوئی پرسان حال تھا ہی نہیں۔ انہوں نے صدیوں میں رجعت کی اور دوبارہ شکاری دور کی زندگی میں چلے آئے۔ جب انسان کا صرف شکار پہ ہی گزارہ تھا۔ نہ کوئی دولت تھی نہ ہی جاگیر اور نہ ہی کسی قانونی وارث کی ضرورت پڑتی زندگی آزاد اور خودمختار تھی۔ پھر کسی گدھے کی طرح انسان خود پہ بوجھ ڈالتا چلا گیا۔ اور بالکل ہی بچک گیا۔ صبح انہوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ گھر میں رونق آ گئی تھی۔ اب وہ ریسٹ ہاؤس کی بجائے گھر لگ رہا تھا، سارا گھر جیسے ہنس پڑا ہو۔ عید آن بسی ہو۔

''مجھے آج پتہ چلا کہ بزدلی کی قیمت اکیلا پن ھے، پہلے ہی تمہیں ساتھ رکھ لیتا تو زندگی اتنی بے معنی اور اداس نہ ہوتی''

خالدہ بھی بہت خوش تھی۔

''اپنی کونسی شخصیت کے ساتھ تمہارے ساتھ رہوں؟ ایک کامیاب عورت یا وہی چنی منی''

امجد نے مینا کو دیکھا، جیسے اس سے جواب چاہتا ہو۔

مینا نے وضاحت سے کہا۔

''وہی خوفزدہ اکیلی جیسے میں لائی تھی۔ یہی اس کی آئیڈیل ہے''

امجد نے مداخلت کی۔

''رکو! کبھی کبھی یہ چلتری بھی بن جایا کرو، مگر ہمیشہ چنی منی رہا کرو''

چونکہ یہ دوسری شادی تھی، وہ چند ایک دوستوں اور نکاح خواں کو ہی بلانا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے صادق سے رابطہ کیا، دفتر میں دوبارہ امجد کے سر پر تاج سج چکا تھا۔ بارہ بجے ہی نکل پڑا۔ صادق حسب معمول دفتر میں دنیا بھر کے اخبار پڑھتا اور ٹیلی ویژن کی خبری سنتا۔ اس کے منسٹر نے ہاتھ پاؤں کاٹ کے رکھ دیئے تھے۔ بہت سے انسپکٹر شولڈر پر دموشن سے ایس پی تھے۔ جبکہ ایس پی اپنے دفاتر میں کھیاں مارتے جمائیاں لیتے۔ وہ دوستوں سے کچھ چھپانے کا عادی نہ تھا۔ اس نے صادق سے سب کچھ کہہ ڈالا۔ صادق طلسم ہوش ربا سی داستان سنتا رہا پھر پھٹ پڑا۔

''وہ بیچاری تمہاری بیوی امریکہ میں پڑی ھے کہ تمہارا بچہ امریکہ میں پیدا ہوا اور وہاں کا نیچرل سٹی زن ہو اور تم ایک بدنام زمانہ سے شادی کر رہے ہو، نوے برس میں بھی تمہارا دادا، والد اور خود تم بلوچستان کے نان لوکل ڈومی سائل ہو چلو تمہارا بیٹا تو کسی ملک کا شہری ہوگا، ایسی بیوی سے ایسی غداری؟''

امجد جیسے جاگ اٹھا ہو، واقعی وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اور پھر اسی معاشرے میں کیسے سر اٹھا کر جیئے گا، لوگ اسے کیسے دیکھیں گے اس نے صادق کا شکریہ ادا کیا، اور لنچ سے انکار کر کے واپس چلا آیا۔

پہلے اس نے مینا کو فون کیا۔

''میں اپنے فیصلے پر پچھتا گیا ہوں! میں تمہارا نمبر بلاک کر رہا ہوں''

مینا نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے فون بند کر دیا پھر اس نے خالدہ کو فون کر کے بے نقط سنائیں اور اسکا نمبر بھی بلاک کر دیا۔ اسے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ ایک غیرت مند مرد ھے۔ گھر میں خپلو کے دونوں دین دار ملازم موجود تھ۔ اپنے علاقے سے دور بچوں کے لیے روزی کمانے والے کیسا سکون ان کے چہروں پہ تھا، جیسے کھڈ کوچہ کے تاکستان۔

امجد نے خود کو مصروف کر دیا۔ گھر میں کم رہنے لگا اور سر شام اپنا مضمون لٹریچر پڑھنے لگتا۔ شکر کہ اسکروائیڈ کی طرح بدنامی مول نہ لی۔ پنجے سے نکل گیا۔ ایک روز سیرینا ہوٹل کے چائنیز ریستورینٹ میں کھانا کھانے گیا تو ششدر رہ گیا کہ خالدہ اور صادق ڈنر کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا، اور خواب میں چلتا ان کے پاس آ بیٹھا۔

''سلام بھائی جان"

خالدہ نے ادب سے سلام کیا۔ صادق خوشگوار موڈ میں تھا۔

''یار میں نے سوچا کہ ایک بے سہارا لڑکی سے شادی کرنا بہت بڑا ثواب ہے۔ میں نے خالدہ سے شادی کر لی، بس جلدی میں تمہیں اطلاع نہ دے سکا، کیا کھاؤ گے؟''

امجد کی جیب میں گلاک 26 کلبلاتا، وہ خاموشی سے باہر نکل گیا اور بے مقصد ڈرائیو کرتا رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ خنائی کے علاقے میں تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ پنجاب جانے والے ٹرک ریں ریں کر کے گزر رہے تھے، وہ ایک ڈھابے میں جا بیٹھا اور ہانک لگائی۔

''چائے راوڑہ دودھ پتی" لڑکا اس کے سامنے چائے پٹخ گیا۔

چائے پی کر اس کے ہوش بحال ہوئے۔ اس نے مینا کا نمبر ان بلاک کیا اور اسے کال دی۔ مینا حسب معمول خوشگوار موڈ میں ٹن سی تھی۔

''کہاں رہے مہربان تمہیں اب پتہ چلا زمین گول ہے۔ کیا حکم ہے نئی کنیز لاؤں؟''

امجد کی گرفت موبائیل پر مضبوط ہوگئی۔

''ہاں!''

اس نے فون بند کر دیا اور جیپ شہر کی جانب موڑ لی۔

کوپرنیکس، برونو، گلیلیو گیلیلی ء'زمین گول ھے' کہنے کے جرم میں مارے گئے، اسی گول زمین کے باعث انسان لاکھوں برس سے گول گول گھوم کر وہیں کا وہیں ہے، Reincarnation سے دوبارہ وہیں آ جاتا ہے، جیسے سانپ اپنی دم منہ میں پکڑ کر ھندو دانشوروں کا زیرو بن جاتا ہے۔ nullify ھو کر جیسے بیج گھوم کے جی اٹھتا ہے، ساری کائنات انسان سمیت گول گول گھومی جا رہی ہے جیسے گیان میں گھومتا zygote۔

اس کے بائیں پہلو میں تکو ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ مگر سرے غنڈی وہیں ساکت و جامد امجد کو دیکھ رہے تھے، جنہیں بابا خرواری نے مزید ساتھ چلے آنے سے روک دیا تھا۔

جبینِ نیاز

رینو بہل
(چنڈی گڑھ)

بڑی مشکل سے گُل کو باتوں میں لگا کر سلایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دُھند میں لپٹی رات میں اس وقت کون ہوسکتا ہے شاید کوئی پڑوس سے ہو یہ سوچ کر میں نے دروازہ کھولا تو سامنے رنجن کو کھڑا پایا۔ اس وقت اچانک اُسے سامنے دیکھ کر ایک پل کے لیے آنکھوں میں خوشی کے لہر کوندی، دل کی دھڑکن تیز ہوئی مگر دوسرے ہی پل آنکھیں سپاٹ و ویران ہوگئیں دھڑکنیں رکتی محسوس ہوئیں۔ چہرے پر غم کے بادل اور گہرے ہوگئے۔

''تم اس وقت؟''

''اندر تو آنے دو۔ سب باتیں دروازے پر ہی کروگی؟'' میں خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔

بیگ کو صوفے پر رکھ کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''اماں اور گُل نظر نہیں آرہیں؟''

''اماں دوائی کھا کر سو رہی ہیں اور گُل کو بڑی مشکل سے ابھی سلایا ہے۔''

''کیسی ہے وہ؟ مجھے یاد کرتی ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیتے ہوئے اُلٹے سوال کر دیا۔

''کیسے آنا ہوا؟ آنے سے پہلے اطلاع بھی نہیں دی؟''

''نہ تم فون اٹھاتی ہو نہ کسی میسج کا جواب دیتی ہو، بتا کر کیسے آتا؟''

''کھانا؟''

''میں نے راستے میں کھالیا تھا۔ ہوسکے تو چائے بنادو۔ باہر بہت سردی ہے۔''

میں خاموشی سے رسوئی میں چلی گئی۔ یہ کیا حال بنا رکھا ہے رنجن نے۔ پہلے سے کمزور لگ رہا ہے۔ چہرہ اترا ہوا، شیو بڑھی ہوئی، کپڑے بھی مٹ میلے۔ آج تقریباً چالیس دنوں بعد اُسے سامنے دیکھ کر سمجھ نہیں پائی کہ دل کی دھڑکنیں تیز کیوں ہوگئیں تھیں بالکل اُسی طرح جب میں نے پہلی بار اُسے دیکھا تھا۔

نہ تو میں اُس سے بات کرنا چاہتی ہوں، نہ صورت دیکھنا چاہتی ہوں اور نہ ہی کوئی رابطہ رکھنا چاہتی ہوں پھر اسے دیکھتے ہی دھڑکنیں کیوں بے ربط ہوگئیں؟ اسے گھر کی دہلیز سے لوٹا کیوں نہیں دیا؟ اتنے دنوں سے جو غصہ اور نفرت اندر ہی اندر سُلگ کر مجھے کھوکھلا کیے جارہی ہے اُسے دیکھتے ہی اُس کی آنچ مدھم کیوں پڑ گئی؟

چائے اُبل کر گیس پر گر گئی تو میں نے خود کو سنبھالا۔ ایک کپ میں چائے ڈالی اور ساتھ میں بسکٹ رکھ کر ٹرے میں لے گئی۔ مجھے معلوم ہے خالی چائے اس کے حلق سے نیچے نہیں اُترتی۔ چائے اُس کے سامنے رکھ کر میں صوفے کے پاس کھڑی ہوگئی۔

''تم نہیں پیوگی؟''

''میں رات کو چائے کہاں پیتی ہوں؟''

ایک چسکی گرم گرم چائے کی لیتے ہی بولا:

''بہت دنوں بعد تمہارے ہاتھ کی ذائقے دار چائے نصیب ہوئی ہے۔''

''کیسے آنا ہوا؟'' میں نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

''تم جانتی ہو۔''

''میرا جواب بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔''

''انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ کبھی کبھی ہوجاتی ہے۔ مان بھی رہا ہوں اور اسی لیے معافی بھی مانگ رہا ہوں۔ یقین بھی دلا رہا ہوں کہ ایسا دوبارہ کبھی نہیں ہوگا۔''

''تُم اسے غلطی کہتے ہو؟ کیا تم میری ایسی غلطی معاف کرنے کا ظرف رکھتے ہو؟ کہنا آسان ہے کرنا مشکل۔ قبر کا حال صرف مردہ ہی جانتا ہے۔'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔ رنجن جواب دینے کے لیے منہ کھولنے ہی لگا تھا کہ میں نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''رات کافی ہوگئی ہے چائے پی کر گُل کے ساتھ سوجانا۔ اماں کی نیند کہیں ٹوٹ نہ جائے۔''

جواب کا انتظار کیے بنا میں پلٹ کر گُل کے کمرے میں اپنے لیے رضائی لینے چلی گئی۔ رنجن بھی چائے ختم کر کے میرے پیچھے ہی کمرے میں آ گیا۔ رضائی لے کر میں کمرے سے نکلنے لگی کہ اس نے میرے ہاتھ سے رضائی پکڑ کر بستر پر رکھ دی:

''تھوک دو اب غصّہ ادھر ہی سوجاؤ۔''

مرد شاید سوچتا ہے کہ عورت موم کی ہوتی ہے دو بول محبت کے سنتے ہی پگھل جائے گی۔

''میرا راستہ چھوڑ دو۔ مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''کیا سب پہلے جیسا نہیں ہوسکتا؟''

''نہیں۔'' میں نے غصے میں کہا۔

''تم چاہو تو سب ممکن ہے۔ تم جو کہوگی میں وہ ہی کروں گا۔ ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔'' وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

''سزا میں تمہیں نہیں خود کو دے رہی ہوں اور وہ بھی اس گناہ کی جو میں نے کیا ہی نہیں۔ میرا راستہ چھوڑ دو اور چپ چاپ سوجاؤ۔ بڑی مشکل سے گُل کو سلایا ہے۔''

اُس کا ہاتھ جھٹک کر رضائی بستر سے اٹھا کر میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ اماں کے کمرے میں اس وقت جانا نہیں چاہتی تھی۔ دو بیڈ روم والا چھوٹا سا یہ

فلیٹ ہم ماں بیٹی کے لیے کافی تھا۔ لہٰذا ڈرائنگ روم میں دیوان پر رضائی ڈال کر لیٹ گئی۔

نیند تو ایک عرصے سے میری دشمن ہوگئی تھی اور آج تو ویسے بھی نیند نہیں آئے گی۔ دو قدم کے فاصلے پر میری پہلی محبت، میری کُل کائنات کی موجودگی مجھے اضطراب کی اوس میں قطرہ قطرہ بھگو رہی تھی۔ جو درد زہ بن کر میری رگوں میں اتر رہا تھا۔ رنجن کی محبت نے جتنی مسرت، شوخی، مٹھاس، سرور سے میرے دل و جان میرے وجود کو لبریز کیا تھا اس سے کہیں زیادہ وصولی میری روح کو چھلنی کر کے درد، تکلیف، ٹیس سے بھر کر کر لی تھی۔ میرا روم روم درد کی شدت سے کراہ رہا ہے۔ یہ تکلیف جسمانی نہیں روحانی ہے جس نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ فریدہ کی کہی بات میرے کانوں میں گونجنے لگی:

''مرد پر آنکھ موند کر کبھی یقین مت کرنا۔ ساتھ سوئے ہوئے سانپ کی طرح ہوتا ہے جانے کس وقت ڈس لے۔''

اُس وقت میں نے اس کی بات ہنسی میں اُڑا دی تھی مگر اب سوچتی ہوں تو سمجھ نہیں پاتی کہ زندگی نے مجھے کس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ پیچھے جانے کے راستے بند ہیں اور آگے اندھیرا ہی اندھیرا۔ کہتے ہیں رات کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو، ہر رات کے بعد صبح ضرور آتی ہے مگر مجھے تو دُور دُور تک اندھیرا چھٹتا نظر نہیں آتا۔ ایک طرف امّاں کی آنکھوں سے جھلکتا خوف اور بے بسی اور دوسری طرف گُل کے معصوم سوالات میری پریشانی میں اضافہ کیے جا رہے ہیں۔

رنجن نے مجھے سوالوں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ سوال تو بار بار میں خود سے بھی کرتی ہوں کہ میں کہاں غلط تھی؟ میری محبت، میری وفاؤں، میری خدمت میں کہاں کمی رہ گئی کہ اُس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ ایک ساتھ چلتے چلتے وہ ہاتھ چھڑا کر آگے نکل گیا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ میری ناک کے نیچے کھیل ہوتا رہا اور میں آنکھیں موندے اعتبار کی راہوں پر چلتی رہی۔ میں تو سوچتی تھی:

وہ ہمارے سوا کسی کا نہیں
ہم بھی کیا کیا گمان رکھتے تھے

امّاں کہتی ہیں گھر گرہستی چلانے کے لیے عورتوں کو بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ مرد کی فطرت ہے گھر کے باہر جا کر اپنی آنکھیں ہری کرنا، ذائقہ بدلنا مگر پرندہ دن بھر جتنا مرضی اُڑ لے، شام کو لوٹ کر اپنے آشیانے میں ہی آتا ہے۔ ماں تو بس نصیحتیں ہی دے سکتی ہے:

جس تن لاگے سو تن جانے

یقین ایک چھوٹا سا لفظ ہے اور نازک اتنا کہ ذرا سی ٹھیس لگے تو کرچی کرچی ہو کر بکھر جائے۔ اُسے اپنا وجود دوبارہ قائم کرنے میں کبھی کبھی زندگی گزر جاتی ہے۔ رنجن نے بھی میرے یقین میرے اعتماد کو روندا ہے اس پر دوبارہ بھروسہ کرنا میرے اختیار میں نہیں۔ میں نے اس سے خدائی تو نہیں مانگی تھی۔ صرف اس کی محبت، وفا اور عمر بھر کا ساتھ ہی مانگا تھا۔ امانت میں خیانت کر کے چاہتا ہے کہ میں سب بھول جاؤں پھر سے اس کی بے لوث محبت کا دم بھروں۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے خود کو رنگین خوابوں کے سحر سے بچاتے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا۔ نہ آنکھوں کو بھٹکنے کی اجازت دی، نہ دل کو بہکنے دیا اور نہ ہی قدموں کو لڑکھڑانے دیا۔ رنجن میرا شوہر میری پہلی محبت اور میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد جس نے میرے دل کے تاروں کا چھوا۔ میرے ان چھوئے بدن کی راگنیوں کو چھیڑا۔ سرتاپاؤں میں نے خود کو اس پر نچھاور کر دیا اور منہ دکھائی کے تحفے میں اس سے وعدہ لیا تھا کہ اس کی محبت، اُس کی وفاؤں پر صرف میرا حق ہوگا۔ پھر وہ اپنے وعدے سے کیسے مُکر سکتا ہے؟

کچھ عرصہ پہلے میری کُل کائنات میرا گھر، میرا شوہر اور میری چاندسی بچی گُل ہی ہوا کرتے تھے۔ میرے دن رات گھر کو سنوارنے اور اُن دونوں کی چھوٹی چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتے ہی گزرتے تھے۔ ان کے چہرے کی مسکراہٹ اُن کی خوشیاں میری سارے دن کی تھکن پل بھر میں دور کر دیتی۔ شادی کے آٹھ سال کیسے ہنستے کھیلتے گزر گئے پتا ہی نہیں چلا۔ میں یہ بھول گئی کہ انسان بھی موسموں کی طرح بدل جاتا ہے۔ زندگی بھی زمین اور آسمان کی طرح کروٹیں بدلتی ہے۔

کیسی نادان تھی میں بھی سمجھ ہی نہیں پائی جب ارشد نے اشاروں اشاروں میں مجھے بتانا چاہا تھا ''بھابی سنبھال لو رنجن کو، بہت شرارتی ہو رہا ہے آج کل۔'' میں تو تب بھی نہ سمجھ سکی جب کپڑے دھوتے رنجن کی پتلون سے خط ملا تھا۔ لکھنے والے نے اپنا نام لکھا تھا اور نہ ہی نام لکھ کر مخاطب کیا تھا مگر خط محبت اور شکووں شکایتوں میں ڈوبا ہوا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ آگ دونوں طرف ہے برابر لگی ہوئی۔ خط پڑھنے کے بعد طرح طرح کے سوالات دل و دماغ کو پریشان کرتے رہے۔ وہ سارا دن رنجن کے لوٹنے تک انگاروں پر لوٹتے گزرا۔ خط جب رنجن کے سامنے رکھ کر جواب طلبی کی تو وہ قہقہہ لگا کر بولا:

''پاگل لڑکی تم نے کیا سوچا؟ یہ خط میرے لیے لکھا گیا ہے؟ میری جان یہ تو داس صاحب کی محبوبہ نے ان کے لیے لکھا ہے جو انہوں نے مجھے پڑھنے کو دیا اور نہ جانے کیسے میرے پاس رہ گیا۔ دیکھو اس پر میرا نام لکھا ہے کہیں؟ اپنے رنجن پر شک کر رہی ہو؟ تمہیں پا لینے کے بعد کبھی کسی کو دیکھنے کی تمنا ہی نہیں رہی۔'' کھینچ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور بوسوں کی برسات سے میرا منہ تر کر دیا۔ اپنی ہی نظروں میں میں شرمندہ ہوگئی۔ میں نے رنجن پر شک کر کے اپنی ہی محبت پر شک کیا تھا۔

شک کا کیڑا جانے انجانے اگر کسی رشتے میں گھُس جائے تو آسانی سے نکلتا نہیں۔ اس وقت تو میں رنجن کی باتوں سے مطمئن ہوگئی تھی، خود کو کوسا بھی بہت تھا مگر دل کے کسی کونے میں چھپے اُس کیڑے نے پھر سے کلبلانا شروع کر دیا تھا۔ رنجن کے جسم سے مجھے انجانی خوشبو کا احساس ہوتا۔ وہم سمجھ کر میں اسے جھٹلا دیتی۔ پھر ایک روز وہ ہی مخصوص خوشبو مجھے اپنے بستر پر بھی محسوس ہوئی۔ دیر تک وسوسوں میں گھری خود سے الجھتی رہی۔ صبح ہوئی تو میں نے رنجن کے جانے کے بعد چادر بدلی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آج لنچ کے لیے گُل کو لے کے میں شیلا کے گھر گئی

تھی۔ رنجن کے دفتر سے آنے سے پہلے لوٹ آئی تھی مگر جب میں گھر پہنچی تو رنجن گھر پر موجود تھا۔

''کیا ہوا آج آپ جلدی آ گئے؟''

''طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے جلدی چھٹی کر لی۔''

''طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو آتے وقت مجھے شیلا کے گھر سے لیتے آتے۔''

شکایت کرتے میں نے رنجن کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھنا چاہا۔

''میں نے سوچا کبھی کبھی تو تم نکلتی ہو گھر سے اور میں پیچھے پیچھے چلا آؤں۔ گھر آ کر آرام کر لیا اب طبیعت کافی بہتر ہے۔ تم سناؤ تمہاری ملاقات کیسی رہی؟''

رات بستر پر لیٹتے پھر وہ ہی خوشبو بے چین کرنے لگی تو میں نے رنجن سے پوچھا:

''کوئی آیا تھا آج؟''

''کب؟''

''میرے آنے سے پہلے؟''

''نہیں تو۔ میں تو دوائی لے کر سو گیا، معلوم نہیں اگر کسی نے بیل بجائی ہو؟''

اچھا۔۔۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''نہیں۔ میں ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔'' بتی بجھاتے میں نے جواب دیا۔

بستر پر لیٹتے ہی رنجن نے مجھے خود سے لپٹا لیا۔ وہی انجانی خوشبو بستر اور رنجن کے وجود سے لپک لپک کر اٹھنے لگی اور میرے نتھنوں سے ہوتی ہوئی دماغ میں کھلبلی مچانے لگی۔۔۔!

دو دن بعد ہی اس خوشبو کا راز مجھ پر افشاں ہو گیا۔ دفتر کی ایک تقریب میں رنجن کے ہمراہ وہاں پہنچی تو جانے پہچانے لوگوں کے ساتھ کچھ نئے چہرے بھی نظر آئے۔ ان میں سے ایک لڑکی جس کا تعارف ارینا کہہ کر کرایا تھا بڑے تپاک سے آ کر گلے ملی جیسے بہت پرانی جان پہچان ہو۔ ارینا سے گلے ملتے ہی وہ ہی مخصوص خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ میں نے چونک کر اسے سر تا پاؤں دیکھا۔ درمیانہ قد، گندمی رنگ، تیکھے نین نقش، کالے گھنگھریالے بال اور گہری کالی غزالی آنکھیں۔ پارٹی کے دوران میرے نگاہیں اسی کا تعاقب کرتی رہیں۔ رنجن کا وقفے وقفے سے اس کے قریب جانا، ارینا کا شرمانا، مسکرانا اور نظریں جھکا لینا۔ چوری چھپے رنجن کو دیکھنا اور یہ بھی دیکھنا کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ اس رات کافی حد تک الجھنوں کی گتھی سلجھانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

واپسی پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا:

''پیاری لڑکی ہے۔ نئی آئی ہے کیا؟''

''تقریباً آٹھ دس مہینے ہو گئے اسے جوائن کیے۔''

''مجھے تو ایسے اپنایت سے ملی جیسے برسوں پُرانی جان پہچان ہو۔''

''ہاں وہ ہے ہی ایسی پُرخلوص، خوش مزاج، چنچل''

یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر میٹھی سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جو میرے دل پر تیزاب کی طرح گری۔ دل تو چاہا کھُل کر دل کی بات کہہ دوں مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اپنے شک کے فتور کو بنا ثبوت ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب میرا وہم ہی ہو۔

اکثر رنجن کو مہینے میں ایک دو روز کے لیے شہر سے باہر دورے پر جانا ہوتا۔ اگر زیادہ دن لگتے تو وہ ہمیں بھی ساتھ لے جاتا۔ اگر میں جانے سے آنا کانی کرتی تو پیار سے منا ہی لیتا۔ اس بار تین دن کے دورے پر جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ بھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ پیکنگ کرتے وقت میں نے پوچھ لیا:

''ہم بھی ساتھ چلیں؟''

''نہیں۔ شرما جی جا رہے ہیں۔ میرے پیچھے تم اپنے ادھورے کام مکمل کر لینا۔ فون کرتا رہوں گا۔''

رنجن جب بھی اکیلے شہر سے باہر جاتا تو لگتا پورا گھر، پورا شہر ویران ہو گیا ہے۔ میں بالکل فارغ ہو کر بیٹھ جاتی جیسے سارے کام ساری رونق اُسی کے دم سے ہو۔ دن ویران اور راتیں لمبی لگنے لگتیں۔ صبح شام باقاعدگی سے رنجن فون کر کے حال پوچھتا رہا۔ گل نے تو ایک لمبی فہرست فرمائش کی فون پر پاپا کو بتا دی۔ تیسرے روز صبح سے ہی گل دروازے پر ٹکٹکی لگائے بیٹھی رہی۔ ہر آہٹ پر بھاگ کر باہر جاتی اور پاپا کو نہ پا کر منہ لٹکا کر لوٹ آتی اور جب شام ڈھلے رنجن گھر میں داخل ہوا تو دیوانہ وار بھاگ کر باپ سے لپٹ گئی۔ باپ نے گود میں اٹھایا تو گلے میں بانہیں ڈال کر زار و قطار رونے لگی۔

''ماں نے مارا کیا؟'' اس نے پچکارتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں''

'پھر رو کیوں رہی ہو؟''

''آپ مجھے چھوڑ کر کیوں گئے؟''

''کام کرنا ہے بیٹا''

وہ اور زور سے لپٹ گئی۔

''اچھا بھئی آگے سے نہیں جاؤں گا۔ اب خوش۔ چلو آؤ تمہیں تمہارے کھلونے دوں۔''

کھلونے لیتے ہی اُداس چہرہ تازہ پھول کی طرح کِھل اٹھا اور وہ سب بھول کر ان میں کھو گئی۔

صبح بیگ سے کپڑے نکالتے ہوئے اچانک میرے ہاتھ میں ریشمی لنگی کرتا آ گئے۔ یہ تو میں نے پیک نہیں کی تھی پھر یہ رنجن کیوں ساتھ لے کر گیا؟ یہ لنگی کرتا تو خاص جگہ اور خاص موقع پر ہی استعمال کرتا ہے، دورے میں اس کا کیا کام؟ میں نے لنگی کُرتا اٹھایا اور سیدھے رنجن کے پاس پہنچ گئی جو دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

''یہ کب پیک کیا؟''

''ویسے ہی رکھ لی تھی'' نظریں چراتے جواب ملا۔

''کوئی خاص وجہ؟''

''خاص وجہ کیا ہونی ہے؟ بس رکھ لیا۔ چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو۔ بال کی کھال ادھیڑنا کوئی تم سے سیکھے۔''

''یہ چھوٹی سی بات ہے؟ مجھے تو دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''میرا مطلب تم خوب سمجھ رہے ہو''

''تین دن بعد گھر لوٹ کر آیا ہوں اور تم اس طرح کی فضول باتیں کر کے دماغ خراب کرو گی؟'' غصے سے وہ چلایا اُس کی آواز سن کر گُل دوسرے کمرے سے بھاگی بھاگی آئی۔ اُسے سہما دیکھ کر خاموشی سے میں پیر پٹختی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اُس کے کپڑوں سے وہ ہی مخصوص خوشبو آج بھی آ رہی تھی میرا سر چکرانے لگا۔ میرے گھر کی دیواریں ہلتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ بے ساختہ میری آنکھیں برسنے لگیں۔ کمرے کی زمین پر گھٹنوں میں سر دے کر دیر تک بیٹھی روتی رہی۔ مجھے نہیں معلوم کب وہ بنا کھائے پیے بنا کچھ کہے دفتر کے لیے نکل گیا۔ مجھے تو تب ہوش آیا جب گُل روتا دیکھ کر مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ جلدی سے خود کو میں نے سنبھالا اور گُل کو چُپ کرانے لگی۔

میں جانتی تھی اُسے شکوے شکایتیں، لڑائی جھگڑا پسند نہیں مگر چُپ چاپ اندر ہی اندر سلگنا اور لب سی لینا، مجھے منظور نہیں تھا۔ جیسے ہی میں نے منہ کھولنا چاہا، اس نے اونچی آواز میں چلا کر میری آواز دبا دی۔ آٹھ سال کی خوش حال زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اس کا یہ روپ دیکھا تھا۔ نہ جانے کتنے پردوں میں اس نے اپنی اصل شخصیت کو چھپا رکھا جو دھیرے دھیرے بے نقاب ہو رہی ہے۔ گلے شکوے، شکایتیں رشتوں کو ٹوٹنے سے بچا لیتے ہیں اور خاموشی دھیرے دھیرے لاتعلقی پیدا کر کے رشتوں کو کھا جاتی ہے۔ بولنے کی جب مجھے اجازت نہ ملی تو میں نے بھی چپ کی چادر اوڑھ لی۔ رنجن نے میری سرد مہری اور لاتعلقی کو محسوس کر کے بھی نظر انداز کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ بظاہر پُرسکون خاموشی تھی مگر اندر ہی اندر لاوا سُلگ رہا تھا۔

ایک شام دفتر سے آ کر رنجن نے تیار ہو کر ساتھ چلنے کا حکم صادر کر دیا۔ طبیعت ناساز ہونے کا بہانہ بنایا مگر اُس نے ایک نہ سُنی۔

''دو منٹ میں تیار ہو کر آ جاؤ ضروری جانا ہے کسی کی عیادت کے لیے۔ میں گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔'' گُل کا ہاتھ تھامے وہ باہر نکل گیا۔

راستے میں اُس نے بتایا کہ ارینا کے والد کو دل کا دورہ پڑا تھا انہیں کے یہاں جا رہے ہیں۔ مجھے سُن کر دھکا لگا۔ روز بہ روز رنجن کے حوصلے بڑھتے جا رہے ہیں اور میں پہلے سے زیادہ خود کو بے بس اور لاچار محسوس کرنے لگی ہوں۔

ارینا کو ہمارے آنے کی خبر پہلے سے ہی تھی شاید۔ حال احوال اور چائے کے بعد میں نے ارینا کی والدہ سے کہا:

''گھر تو آپ کا بہت خوبصورت ہے۔ کتنے کمرے ہیں؟''

آیئے میں آپ کو گھر دکھاتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی تو رنجن اور ارینا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ بات ہوئی اور ارینا جھٹ سے کھڑی ہو گئی۔

''ماں آپ بیٹھیں میں دکھا کر لاتی ہوں۔''

میں ارینا کے پیچھے چل دی۔ ارینا باتیں بھی کرتی رہی گھر بھی دکھاتی رہی۔ گھر کی چھت پر میں نے اچانک پوچھ لیا۔

''تم رنجن کے ساتھ ٹور پر گئی تھی؟''

اس سوال کے لیے شاید وہ تیار نہیں تھی۔ ایک دم سٹپٹا گئی۔ اُس کے جواب کا انتظار کیے بنا میں نے کہا:

''دیکھو ارینا۔ تم خوبصورت پڑھی لکھی سمجھدار اور اچھے خاندان کی لڑکی ہو۔ اپنی اور میری زندگی برباد مت کرو۔ تمہیں کوئی بھی اچھا لڑکا مل جائے گا مگر میں گُل کو لے کر کہاں جاؤں گی؟ بیوہ ماں کے علاوہ میرا تو اور کوئی نہیں۔''

ارینا کا اترا چہرہ جھکی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ شرم ابھی باقی ہے۔ جھکی آنکھوں سے بہتے آنسو اس کے گالوں کو بھگونے لگے۔

''میں نہیں چاہتی تھی ایسا ہو مگر نہ جانے کیسے اور کب مجھے ان سے محبت ہو گئی۔ میرا نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دل پر اختیار نہیں رہا۔''

اس کی زبان سے محبت کا اعتراف سن کر میرے پاؤں شل ہو گئے۔ سانسیں سینے کے اندر دفن ہوتیں محسوس ہوئیں۔ سر چکرانے لگا۔ اگر وہ مجھے تھام نہ لیتی تو یقیناً میں زمین پر اوندھے منہ گر جاتی۔ گر تو میں گئی تھی اپنی ہی نظروں میں یقین کی اُس بلندی سے جس پر مجھے بڑا ناز تھا۔ خود کو بہ مشکل سنبھالتے میں صرف اتنا ہی کہہ سکی:

''یاد رکھنا تمہارا ہر بڑھتا قدم ہم ماں بیٹی کی زندگی کی تباہی کی طرف بڑھے گا۔'' اتنا کہہ کر میں سیڑھیاں اتر آئی۔ ارینا بھی میرے پیچھے پیچھے اتر آئی۔ رنجن کی تیز نگاہوں نے ہم دونوں کے چہرے پڑھ لیے۔ جلد ہی ان لوگوں سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آئے۔ راستے میں رنجن پوچھتا رہا کیا بات ہوئی مگر میں گُم سُم بیٹھی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اُس رات بستر پر رنجن کے ساتھ سوتے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کو بچھو کاٹ رہے ہوں۔ میں ایک اِچھادھاری ناگ کے ساتھ سو رہی ہوں جس نے میرے پیار میرے اعتبار کو ڈس لیا ہے۔ آٹھ سالوں کا ایک ایک لمحہ مجھے جھوٹ اور فریب میں لپٹا زہریلا محسوس ہونے لگا۔ اس کی بے وفائی نے میری یادوں کے سرمائے کو مجھ سے چھین لیا۔ محبت میں ڈوبی راتیں، چاندنی میں بھیگی ملن کی یادیں، بارش میں بھیگے لمحوں کی سرشاری کے رنگ ایک پل میں بے رنگ ہو گئے۔ وہ رات میں نے انگاروں پر کاٹی۔ آنے والی صبح میرے لیے کیا پیغام لاتی ہے اس کا مجھے بے قراری سے انتظار تھا۔

''چہار سُو''

صبح اٹھ کر معمول کے مطابق خود کو گھر کے کاموں میں مصروف کر لیا۔ باہر سے پُرسکون مگر اندر خیالوں، پریشانیوں، وسوسوں کا سیلاب اُمڈتا رہا۔ آنے والے طوفان کے لیے خود کو تیار کرتی رہی۔ جو جنگ میں کل چھیڑ کر آئی تھی، اُس کا ردِعمل یقیناً سامنے آئے گا۔ اگر ارینا اس واقعہ کا ذکر نہ کرے تو طوفان خاموشی سے گزر جائے گا اور اگر کر دیا تو۔۔۔؟

شام ڈھل گئی، رات نے اپنی چادر پسار دی مگر رنجن دفتر سے نہیں لوٹا۔ گُل اپنے پاپا کے انتظار میں اندر باہر پھرتی رہی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اسے سب پتا چل چُکا ہے اور اب وہ گھر لوٹے گا تو درست حالت میں نہیں ہوگا۔ رات کے تقریباً گیارہ بجے جب گُل تھک کر سو چکی تھی تو لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوا۔ آتے ہی مجھ پر برس پڑا:

''تم ہوتی کون ہو میری بے عزتی کرنے والی؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی ارینا سے اس طرح بات کرنے کی؟''

''بیوی ہوں تمہاری۔''

''بیوی ہو تو بیوی بن کر رہو۔ اس سے کیا پوچھتی ہو جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو؟''

''پوچھا تو تھا تم سے''

''پوچھا تھا تو سن لو، کان کھول کر۔ ہاں وہ میرے ساتھ گئی تھی۔ تین دن ہم نے ایک ساتھ ایک بستر پر گزارے۔ اور کچھ پوچھنا ہے ؟''

''شرم نہیں آتی یہ سب کہتے ہوئے؟''

''شرم کیسی؟ پیار کرتے ہیں ہم ایک دوسرے سے''

''پیار؟ اسے تم پیار کہتے ہو؟ تم بھول گئے ہو کہ تمہاری ایک بیوی ایک بیٹی بھی ہے۔''

''تو کیا میں جینا چھوڑ دوں؟ میرا خوشیوں پر کوئی حق نہیں؟''

''کل تک، تمہاری خوشیاں تمہاری بیوی بچے تھے؟''

''اب نہیں ہیں''

''تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ کل تو میں نے اس آوارہ بدذات سے بات کی تھی اب میں اُس کے ماں باپ سے بات کروں گی پوچھوں گی ان سے یہ تربیت کی ہے اپنی اولاد کی؟'' غصے سے، میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

''خبردار جو دوبارہ ایسی حرکت کی'' میری چوٹی کو زور سے پکڑ کر ایسے گھمایا کہ میرا سر چکرا گیا۔

''کیا کر لو گے؟ مار دو گے مجھے؟''

''کیا کر لوں گا؟ ابھی دکھاتا ہوں'' اتنا کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ دوبارہ گھر میں داخل ہوا تو ہاتھ میں پٹرول کی بوتل تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے خود پر پٹرول چھڑک لیا۔ میرا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز اٹھا۔ رسوئی سے ماچس لینے کو مڑا تو میں نے لپک کر راستہ روک لیا۔ رو رو کر معافی مانگی اُس کے پاؤں پڑ گئی۔

''تم جو چاہو گے میں وہ ہی کروں گی مگر یہ انتھ مت کرو تمہیں گُل کی قسم۔''

کمرے میں شور سُن کر گُل بھی اُٹھ گئی۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی رونے لگی۔ روتے روتے باپ کی طرف لپکی مگر رنجن نے اسے دور سے روک دیا۔

''پکڑو اسے۔ میرے قریب مت آنے دو۔'' اتنا کہہ کر وہ تیز قدموں سے باتھ روم میں گھس گیا۔

وہ رات میری زندگی کی سب سے سیاہ رات تھی۔ گُل کو سینے سے لگائے دیر تک بہلاتی رہی۔ نہا دھو کر کپڑے بدل کر رنجن جب تک نہیں آیا گُل سوئی نہیں۔ باپ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی گلے میں بانہیں ڈال کر سکون سے سو گئی۔

رات بھر خود کو سوالوں کے کٹہرے میں کھڑا پایا۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد اب یہاں رُکنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ صبح پو پھٹتے ہی اپنا اور گُل کا سامان لیا اور رنجن کے اٹھنے سے پہلے گھر سے نکل پڑی۔

آج چالیس دنوں بعد منہ لٹکائے معافی مانگنے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے دنوں میں ایک بار بھی پلٹ کر ہماری طرف نہیں دیکھا۔ یہ طویل جدائی اور اُمید کا عرصہ میں نے کس عذاب کی طرح گزارا یہ میں ہی جانتی ہوں یا میرا رب۔ ایک رشتے کو قائم رکھنے کے لیے محبت سے بھی زیادہ ضروری اعتبار ہے۔ جو شخص اتنے سالوں کی قربت کے بعد بھی میرا درد، میری خاموشی میری آنکھوں میں چھپی نمی، میری زبان کی تلخی نہ سمجھ سکا اس سے فاصلہ رکھنا ہی مناسب ہے۔

ساری رات کروٹیں بدلتے خود کو نئے محاذ کے لیے تیار کرتے گزری۔ صبح جب آنکھ کھُلی تو لمّاں اور رنجن کو ساتھ بیٹھے چائے پیتے دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ وہ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ گُل اپنے پاپا کے آگے پیچھے بلبل کی طرح پھدکتی چہک رہی تھی۔ خوشی سے اس کا انگ انگ تھرک رہا تھا۔ ایسے خوش تھی جیسے کسی کو اس کی کھوئی ہوئی دولت اچانک مل جائے۔ انہیں دیکھ کر میں دوبارہ کمرے میں پلٹنے لگی تو لمّاں نے آواز دے کر بلایا۔ سنی اَن سنی کر کے میں کمرے میں آ گئی۔

دو منٹ بعد لمّاں میرے کمرے میں تھی۔

''وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔۔۔''

''لمّاں کسی کا قتل کر دو اور پھر کہہ دو میں شرمند ہوں۔ کیا اتنا کہہ دینے سے وہ بے قصور ہو جائے گا؟''

''مگر بیٹا۔۔۔''

''آپ پلیز اس بارے کچھ نہ کہیں'' لمّاں کو وہیں چھوڑ کر میں کمرے سے باہر نکل آئی۔

گُل اپنے پاپا کے کاندھے پر چڑھ کر اُس کے بالوں کو سلجھا رہی تھی ایسے مستی کر رہے تھے دونوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ باپ کی شفقت سے محروم ہونا کیا ہوتا ہے یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ آج جو بیٹی پر اتنا پیار آ رہا ہے اُس وقت کہاں گیا تھا یہ پیار جب اُس نے ایک پرائی عورت کے لیے مجھے اور گُل کو گھر

باقی صفحے ملاحظہ کیجیے

نادر تحفہ

ارم نعیم
(رام پور)

''کل شام بائک سوار دولڑکوں نے ٹھاکر گنج علاقے میں کوچنگ سے گھر لوٹتی لڑکی پر تیزاب پھینک دیا لڑکی کا آدھا چہرہ اسکی زد میں آ گیا اسکے رونے کا شور سن کر بھیڑ جمع ہوگئی اور کچھ راہگیروں نے اسے سول ہاسپٹل میں بھرتی کروایا جہاں وہ زیرِ علاج ہے'' ہمارے رپورٹر نے لڑکی کے گھر والوں سے بات کی تو خلاصہ ہوا کہ پچھلے دنوں کوچنگ میں ہوئے انعامی امتحان میں اس نے پانچ ہزار کے ساتھ پہلی پوزیشن حاصل کی تھی، سچن کو دوسری پوزیشن ملنے پر بہت ملال تھا وہ ہمیشہ سے پوزیشن ہولڈر رہا تھا، دو روز قبل اسکی لڑکی سے کچھ بحث ہوئی تھی، اور موقع ملتے ہی اس نے انتقام لے لیا، حادثے کے بعد سے دونوں لڑکے فرار ہیں، پولیس نے FIR درج کرانکی تلاش شروع کردی ہے۔

''ابا۔۔۔ابا یہ تیزاب کیا ہے؟'' سات برس کی اقراء نے خبریں سماعت فرمارہے معین صاحب سے سوال کیا، یہ انکا روز کا معمول تھا کہ دفتر سے واپسی کے بعد شام کی چائے کے ساتھ دن بھر کی نیوز سنتے، اسکی آواز پر انہوں نے ٹی.وی سے نظریں ہٹائی اور اسکی جانب متوجہ ہوئے، جو پہلے سے انہیں تکتی ہوئی جواب کی منتظر تھی۔ابا، نیوز اور اسکے سوالات کا سلسلہ ایک ساتھ جڑا تھا، جنکے سامنے وہ اپنے عجیب سوالوں کا پٹارا کھول دیتی، گھر میں امی، دادی،، بہن، بھائی سب تھے مگر اسکے سوال کا تسلی بخش جواب صرف وہی دیتے، کیونکہ وہ سوال ہی ایسے پوچھتی مثلاً ''ہم تتلی یا چڑیا کی طرح اُڑ کیوں نہیں پاتے؟ یا چاکلیٹ کا محل کہاں ہے، ہمیں بھی وہاں جانا ہے؟ تاکہ دوستوں کے لئے خوب ساری چاکلیٹ لے آئے، اسے تحفہ دینا اور لینا بہت پسند تھا، اکثر گھر کے قریب نیاز انکل کے کرانہ اسٹور سے کچھ سامان لیتی اور باہر کسی غریب بچے کو للچائی نظروں سے تکتا پاتی تو اپنی چیزیں ان سے ضرور بانٹتی، ایسی تھی ننھی اقراء۔

لیکن اسکے آج کے سوال پر ابّا نے اسے اپنے قریب کیا پیار بھرا ہاتھ سر پہ رکھتے ہوئے دونوں موٹے گال محبت سے بھینچے اور بولے ''بیٹا تیزاب بہت خراب چیز ہوتی ہے لوگ اس سے جل جاتے ہیں'' اپنے ذہن پر زور ڈال کر کچھ یاد کیا اور بولی ''مگر ابّا جلتے تو دودھ سے ہیں تبھی تو اس دن امّی ہمارے لئے گرم کر رہی تھی اور جل گئی، اور ابّا انکے ہاتھ میں دانہ بھی بن گیا تھا، بیچاری امی کتنا روئی تھی''

اسکے معصومانہ جواب پر ابّا نے کہا۔۔۔'' ہاں میری رانی! لوگ دودھ سے بھی جلتے ہیں پر اچھے ہو جاتے ہیں، مگر تیزاب کا جلا کبھی اچھا نہیں ہوتا، یہ انسان کو ہمیشہ کے لئے داغدار کر جاتا ہے اس لئے میری گُڑیا آپ کبھی بھی اس کے قریب نہ جانا'' اقراء ابّا کی بات پورے انہماک سے سن رہی تھی، اور انکے آخری لفظوں نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا کہ کہیں اگر وہ بھی اس لڑکی کی طرح جل گئی تو پھر ٹھیک نہ ہوگی، ''میری بات سمجھ آئی'' ابّا کی آواز پر چونک اٹھی پھر بولی ''جی ابّا ہم کبھی اس کے پاس نہ جائینگے''۔

دن گزرتے گئے اور اسکول جانے والی اقراء کالج جانے لگی، B.Sc (BIOLOGY) میں داخلہ لیا، بایو میں تو اسکا دل خوب لگتا پر کیمسٹری میں اسکی توجہ کم ہی رہتی اور خاص کر تب جب پریکٹیکل کرنا ہوتا کیونکہ CHEMICALS کے ملنے پر ہونے والا دھواں اور مہک اسے سخت ناگوار گزرتی۔ایک دن ساری لڑکیاں لیب میں کھڑی سر کی منتظر تھی کیونکہ انہی کی گزارش پر کچھ نئی MACHINESاور CHEMICALS آئے تھے کہ طلباء ذیادہ سیکھ سکیں۔وہ، رانو، پونم اور وندنا، آپس میں کچھ گپ شپ کر رہی تھیں، دراصل پونم کو سر ریحان بہت پسند تھے لہٰذا محترمہ سر کی ایک بھی کلاس نہ چھوڑتی، لیکن انہوں نے کیا پڑھایا یہ بھی اسے کم ہی یاد رہتا کیونکہ ساری توجہ سر کے چہرے پر جمی ہوتی، بس یہ سہیلیاں اسی موضوع پر اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی، تبھی اقراء کی نظر سلیب پر رکھی ایک بوتل پر پڑی جس کا رنگ اسے بہت عجیب لگا، اس سے قبل یہ بوتل لیب میں نہ تھی یا شاید اس نے پہلی دفعہ دیکھی، اس نے رانو کو کہنی سے ٹہوکا مارا، جو اسکی سب سے پکّی دوست تھی، میٹرک سے دونوں ایک ساتھ تھی، ساتھ پڑھتی، ٹفن کرتی، نوٹس بناتی، بہنوں جیسی محبت تھی ان میں، تو وہ بھی اقراء کی نظروں کے تعاقب میں ادھر متوجہ ہوئی، ''رانو یہ کون سا کیمیکل ہے؟ کچھ عجیب لگتا ہے نہ؟'' وہ بولی۔۔۔'ارے پگلی یہ تو ACID ہے''۔۔۔''کیسا برا رنگ ہے نہ''۔۔۔''ہاں! جیسے اسکے کام ویسی اسکی صورت''۔۔۔''کیا مطلب؟''۔۔۔''ارے میری بھولی اقراء جسے چہروں پر پھینک کر نہ جانے کتنی لڑکیوں کا رنگ روپ چھین کر انکی زندگیاں برباد کی گئی ہیں، لگتا ہے تم نے سنڈے کے اخبار کا EDITORIAL PAGE نہیں پڑھا اس میں اس زہر کا شکار ہوئی چند لڑکیوں کی کہانی انکی زبانی شامل تھی، اگر تم پڑھتی تو انکی تکلیفوں پر روئے بنا نہ رہ پاتی''۔۔۔''یعنی یہ تیزاب ہے''۔۔۔''ہاں یہ وہی ہے''۔

بس اتنا سننا تھا کہ اسے بچپن کی وہ شام اپنے تمام مناظر کے ساتھ یاد آ گئی جب ابا نے تیزاب کے متعلق چند حقائق بتانے کے ساتھ کچھ نصیحت بھی کی تھی، بچپن کی کچھ باتیں تاعمر بچے کی نفسیات پر اثر انداز رہتی ہیں، اور خصوصاً وہ جو کسی حادثے سے منسوب ہوں، وہ رانو سے کچھ کہہ پاتی کہ تبھی سر آ گئے اور موجودہ نئی چیزوں سے متعارف کراتے ہوئے اسکے DETAILS AND USES بتانے لگے، لڑکیاں جلدی جلدی نوٹ بک پر نوٹس لیتی رہیں مگر آج اقراء کا ذہن بھی پونم کی طرح کلاس کے بجائے کہیں اور تھا، ACID کی بوتل مکمل طور سے اسکے اعصاب پر سوار تھی، کالج سے گھر لوٹی تو بھی اداس تھی اسے یہی فکر ستاتی رہی کہ کبھی

اس پر وہ شیشی گر گئی تو اسکا کیا ہوگا؟۔

''ارے کب سے مسلسل چھت دیکھ رہی ہو، سونا نہیں ہے کیا؟ شام چائے پر بھی چُپ تھی، سب ٹھیک تو ہے نہ؟'' یہ آواز اس سے دو سال بڑی منّو آپا یعنی مہناز کی تھی، جو ہر رات اس سے دن بھر کی باتیں کئے بغیر نہ سوتی، اس دفعہ انگریزی اور اردو سے B.A FINAL تھا، دورانِ مطالعہ سبق آموز قصے یا باتیں اسے بھی سناتی، دونوں ایک دوسرے پر جان نثار کرتی تھی، اب ان میں پڑھائی کے ساتھ اکثر شادی بیاہ کے موضوع پر چند باتیں ہو جاتی، ایک دن اقراء نے کہا.. ''آپا ہم تو اس سے شادی کرینگے جو ہمیں انڈیا ٹور پر لے جائے اور خوب پڑھنے دے'' منّو بولی.. ''ہم تو اس سے کرینگے جو جہیز نہ لے تاکہ امی ابا پریشان نہ ہوں''۔۔۔اسکی یہ تجویز چھوٹی بہن کو خوب راس آئی کہنے لگی.. ''آپا یہ تم نے بلکل صحیح بات کی، ہمیں یاد ہے صبیحہ باجی کی شادی پر شمیم خالہ نے اپنے زیور بیچ دئے تھے اور نانی کے پاس آکر خوب روئی تھی''۔۔۔''ہاں اسی لئے ہم یہی دعا کرتے ہیں''۔۔۔''ٹھیک ہے آپا اب ہم بھی یہی دعا کرینگے''۔

امتحان قریب تھے اس لئے دونوں کے مکالمے آپس میں کم اور کتابوں اور نوٹس سے زیادہ ہونے لگے، بڑے بھائی صادق نے ننہیال میں ماموں کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتے، چھوٹے بھائی عارف کو بھی امّی انکی پڑھائی میں خلل کے سبب کمرے میں نہ بھیجتی، انہی دنوں مہناز کے لئے ایک رشتہ آیا، امّی نے اسے کمرے میں بلایا، وہ لوگ اس سے چند سوالات کر رہیں تھے تبھی اقراء، رانو کے گھر سے نوٹس لے کر واپس آئی، اور ان لوگوں نے منّو کے بجائے اقراء کا رشتہ مانگ لیا، لیکن ابا نے انکار کر دیا کیونکہ اصولاً منّو کا رشتہ پہلے ہونا تھا، اس درمیان گھر میں کئی رشتے آئے پر سب اقراء کو پسند کرتے۔ گریجویشن کا آخری سال ہونے کی وجہ سے وہ پڑھائی میں خوب من لگانا چاہتی پر اسکی وجہ سے آپا کی زندگی میں آنے والے متواتر طوفان تھمنے کا نام نہیں لے رہیں تھے، اسکا ذہن بری طرح منتشر تھا اسکی پیاری آپا پہلے کی طرح بولنا، چہکنا، مسکرانا بھول گئی تھی، مستقل ہونے والے انکار اسے ہر شئے سے بیزار کرتے جا رہیں تھے۔

اقراء اسکے لئے کچھ کرنے سے قاصر تھی اب وہ نماز میں اللہ سے گھنٹوں سوال کرتی، ''ائے اللہ میرا کیا قصور ہے اس سب میں؟ ہم دونوں بہنوں کی تخلیق آپ ہی نے کی، پھر ہم میں یہ تفریق کیوں؟ کیوں سب کو ساری غرض صورتوں سے ہے؟ کیوں کوئی سیرت، دینداری، سادگی اور سلیقہ شعاری کا طالب نہیں؟'' اسے علم تھا کہ وہ بے گناہ ہے پھر بھی آپا کا مغموم چہرہ دیکھتے ہی خود کو قصوروار سمجھتی۔ راتیں اب تکیوں کی نمی میں گزرنے لگی، نہ جانے کب خوابوں کی پری اسے تھپکی دے کر سلا جاتی مگر عرصے کی خاموشی آج اس نے توڑ ہی ڈالی۔۔۔''آپا اب تم ہم سے ناراض رہتی ہو نہ، ہمارے سبب تمہیں انکار سننا پڑتا ہے، اچھا ہو کہ ہم مر ہی جائے''۔۔۔''اسکی باتیں سن کر منّو بیتاب ہو کر بولی، نہیں اس میں تمہارا کیا قصور؟ ہم ہیں ہی ایسے نا قابلِ قبول، ہماری قسمت نے ہی تم سب کو پریشان کر رکھا ہے''..۔۔۔''نہیں میری آپا ایسا نہ کہو، تمہارے نصیب بہت بلند ہونگے، امی ابا، دادی کی دعائیں ضرور رنگ لائینگی، دیکھنا تم بہت کامیاب ہوگی، کسی کے انکار کرنے سے زندگی ختم نہیں ہوتی'' اتنا کہنا تھا کہ دونوں گلے مل کر رونے لگی، آج رونے سے غم کا غبّار کچھ ہلکا ہوا تھا۔

دو دن بعد اقراء کالج کے کسی PROJECT PRESENTATION کے لئے ابا کی اجازت سے مع ٹیچرس وطلباء الہ آباد چلی گئی، اگلے دن گھر میں ایک نئے رشتے کی آمد ہوئی ان لوگوں کو منّو پسند بھی آ گئی اور معین صاحب لڑکے کو پہلے ہی کہیں دیکھ چکے تھے سرّافہ بازار میں اسکی کپڑوں کی دُکان تھی، اس لئے ان لوگوں نے کچھ تفتیش کرنے کے بعد تیسرے روز بات پکّی کر دی، دو مہینے بعد شادی طئے ہوگئی کام زیادہ وقت کم تھا، جب اقراء واپس لوٹی تو یہ خبر سنتے ہی اسکا دل باغ باغ ہو گیا، سب لوگ تیاریوں میں لگ گئے اسی بیچ امتحان ختم ہوئے آٹھ روز کے بعد نکاح تھا اس لئے لڑکے کی بڑی بہن ممبئی سے آ گئی تھی، کیونکہ اس عرصے میں لڑکے والوں کی طرف سے کسی کا آنا جانا نہ ہوا تھا فون پر باتیں ہو جاتی مگر ہونے والی نند چند تحفوں کے ساتھ مہناز سے ملنے آئی اقراء نے امی کے ساتھ کچن کے کام سنبھالے منّو شرمائی لجائی ان کے پاس بیٹھی تھی رات کو انہیں پُر تکلف دسترخوان کے بعد رخصت کیا گیا پر اگلی صبح کا آفتاب منّو کو روشنی کے بجائے تاریکی کی سوغات دے گیا لڑکے والوں نے صبح فون کر کے ان پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے ابھی تک اپنی ایک بیٹی ان سے چھپا کر رکھی اور اب انہیں بہو کی صورت میں صرف اقراء قبول ہے، نہیں تو رشتہ ختم۔۔۔..

گھر میں اس خبر سے سکوت طاری ہو گیا تیاریاں ہو چکی تھی، جہیز، کھانا، شادی ہال سب کے لئے پیسے دئے جا چکے تھے، معین صاحب نے چند بزرگوں کے ہمراہ جا کر سمدھیوں سے منت وسماجت کی پر سب کچھ بے سود رہا وہ مایوسی دامن میں سمیٹے گھر لوٹ آئے منّو کے خواب ایک بار پھر سے مسمار ہو گئے اقراء کسی کے سامنے نظریں اٹھانے کے قابل نہ رہی حالانکہ والدین کو اس سے کوئی شکوہ نہ تھا انکے لئے دونوں اولایں یکساں تھی، کیا ایک کی خوشی کے لئے دوسرے کو زندہ در گور کر دیتے؟ سارے گھر میں افسردگی وخاموشی نے ڈیرا ڈال لیا تھا جیسے کسی شہر خموشاں کا منظر ہو، جہاں شہنائیاں بجنے کو تھی وہاں اب سسکیاں سارے سکوت کو توڑ رہی تھی، دادی اپنی بہو اور پوتیوں کو آغوش میں بھر کے تسلّی و تشفّی دینے لگی، دو دن سے کسی نے ڈھنگ سے نہ کچھ کھایا، نہ کسی کو نیند آئی۔

اقراء سے سب کی تکلیفیں نہ دیکھی جاتی، وہ مسلسل اپنی جانب سے ان مسئلوں کا حل پیش کرنا چاہتی تھی اگلی صبح وہ یونیورسٹی گئی وہاں پہنچ کر خلافِ معمول کلاس روم کے بجائے کیمسٹری لیب گئی ابھی کوئی نہ آیا تھا.. ''کا بھوا بٹیا، ابھی تو کونوں پُرپھیسر نئے آئے، آپ اتنے سبیرے کاہے آئی، کونوں کام بھا تو کا''، پیچھے سے صفائی والے مدن بابا کی آواز سن کر وہ چونکی پھر کچھ سنبھل کر جواب دیا۔۔۔''جی نہیں بابا، بس جلدی آ گئے آپ اپنے کام کیجیے''، کچھ دیر بعد وہ

اس شیلف کے سامنے کھڑی تھی جہاں سے اسے گزرنا بھی ناگوار تھا، بابا اپنے کاموں میں لگے تھے، تبھی اس نے شیلف سے ایک شیشی نکال کر بیگ میں رکھی اور باہر نکل گئی، راہداری میں کچھ سہیلیاں اسے کئی دنوں بعد دیکھ کر خوش ہوگئی، مگر رانو کو اسکی مسکراہٹ مصنوعی لگی وہ کسی بہانے اسے لان کی جانب لے گئی اور سارا حال دریافت کیا، وہ جذبات سے بے قابو ہوکر رونے لگی اور سب کچھ بتا گئی، رانو نے کچھ تامّل کے بعد اسے مشورہ دیا، ۔۔۔''تم اتنی سمجھدار ہو رونے سے کیا حاصل، بہتر ہے کہ تم ایک بار اپنے جی جاجی سے بات کرو، کیا پتہ اس سب میں انکی غلطی نہ ہو، شاید وہ تمہاری بات سمجھے اور اپنے گھر والوں کو سمجھائے''۔۔۔ ''نہیں رانو گھر پر کوئی یہ پسند نہیں کریگا کہ ہم لڑکے سے ملنے گئے تھے پہلے ہی ہماری وجہ سے سب برباد ہوگیا ہے اب تکلیف اور غم میں اضافہ نہیں چاہتے، اور یہ سارے معاملات جب بڑوں کے بات کرنے پر نہ سنبھلے تو ہم سے کیا ہوگا'' اتنا کہہ کر رانو سے گلے لگ کر یوں رونے لگی جیسے دوبارہ اس سے نہ مل سکے گی۔۔۔ پر رانو نے ہار نہیں مانی اور اسے سمجھاتی رہی۔

گھر لوٹتے وقت اس نے غیر ارادی طور پر لڑکے کی دکان کا رکشہ لیا، پتہ معلوم کرتے ہوئے وہاں پہنچی، پھر بہت سارے وسوسوں، اندیشوں اور خوف کو درکنار کرکے اندر داخل ہوئی، عاطف کو قطعی علم نہ تھا کہ سامنے کھڑی لڑکی کون ہے وہ اسے خریدار سمجھ کر آگے بڑھے، اقراء نے ماحول کو بھانپتے ہوئے سلام کے بعد اپنا تعارف دیا، اور پھر گھر کی ساری باتیں کہہ سنائی، کلائی پر نگاہ ڈالی تو گھر جانے کے لئے اٹھنے لگی، اس پورے عرصے میں عاطف نے اس سے پانی و چائے پوچھنے کے سوا کچھ نہ کہا، سامنے والے کی خاموشی اسے بہت کچھ بتا گئی تھی آخر وہ بھی تو انہی والدین کی اولاد تھا، وہ راسطے بھر اپنے جانے پر کفِ افسوس ملتی اور روتی رہی، گھر پہنچ کر سب کے ساتھ بادل نخواستہ کھانے پر بیٹھی، دوپہر میں سب اپنے کمروں میں تھے، اسکے پہلو میں لیٹی منّو نہ جانے کب روتے روتے سو گئی تھی، وہ بھی اپنی جگہ بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی، تھوڑی دیر بعد اقراء نے اپنے بیگ سے شیشی نکالی اور چھت کی جانب بڑھ گئی، شام کو وہ کہیں نظر نہ آئی تو امی نے عارف کو چھت پر بھیجا، وہاں کا منظر دیکھتے ہی اسکی دلدوز چیخ پر سارا گھر اوپر آ گیا۔۔۔

رات کے تقریباً دو بجے اسے ہوش آیا، آنکھوں کے علاوہ پورے چہرے اور ہاتھ پر پٹی بندھی تھی، ہسپتال میں سبھی اسکے گرد کھڑے تھے، امی اسے دیکھتے ہی زاروقطار رونے لگی ''ہائے میری بچی یہ سب کیا ہوگیا، ہم تو لُٹ گئے جیتے جی مر گئے، صادق کے ابا دیکھئے میری بیٹیوں کی زندگی برباد ہوگئی''۔۔۔ اس نے اشارے سے منّو کو اپنے قریب بلایا جو مصلّے پر دعائیں مانگ رہی تھی، منّو قریب آئی تو اس نے کہا: ''آپا ہم تمہارے لیے بس اتنا ہی کر سکے، اب کوئی اس تیزاب والے چہرے کو تم پر ترجیح نہ دے گا، یہی ہے وہ نادر تحفہ'' اسکی بات سن کر، سب کے آنسوؤں کی رفتار اور تیز ہوگئی، ایک بہن کے لئے دوسری نے خود کو قربان کر دیا تھا، اسکی شادمانی کے لئے خود کو اجاڑ لیا تھا، اور ادھر چھت پر پڑی تیزاب کی ٹوٹی ہوئی شیشی زمین کے اس حصے کو ہمیشہ کے لئے داغدار کر گئی تھی، وہ سب یاد کرکے بیہوش ہونے لگی تھی۔

اقراء ۔۔۔اقراء۔۔۔کسی نے زور سے اسکا نام پکارا تھا۔۔۔اقراء ادھر دیکھو۔۔۔، اس نے آواز پہچاننے کی کوشش کی۔۔۔اقراءءءء۔۔۔، اور یہ امی تھی جو لگا تار اسے پکارے جا رہی تھی، شور بڑھتا ہی جا رہا تھا، ہر طرف سے سب اسے ہی بلا رہیں تھے، تبھی وہ چونک کر اُٹھ گئی، آنکھ کھلتے ہی اس نے اپنے اردگرد دیکھا، یہ ہسپتال نہیں اسکا گھر تھا، وہ اپنے بستر پہ لیٹی تھی، اسکے چہرے اور ہاتھوں پر کوئی پٹی نہیں تھی، وہ صحیح سلامت تھی، ایک خوفناک خواب ابھی ابھی ٹوٹ کر اسے بکھرنے سے بچا گیا تھا، اس نے ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا کہ خواب پورے نہیں ہوتے، تبھی امی دروازے پر آ کھڑی ہوئی ''کب سے آوازیں لگا رہیں ہیں اور تم ہو کہ سنتی ہی نہیں، ارے جلدی کرو بیٹا اللہ نے ہم سب پر ابرِ رحمت کی بارش کر دی ہے، باہر عاطف اپنے والدین اور مولوی کے ساتھ آئیں ہیں اور وہ لوگ ابھی نکاح کرنا چاہتے ہیں، اس لئے جلدی سے منّو کو تیار کر کے باہر لے آؤ، وہ اس خوشی کے موقع پر احساسات کا اظہار کرنے سے قاصر تھی، اقراء ششدر بیٹھی انکی ساری باتیں سنتی جا رہی تھی، لمحے بھر پہلے وہ اپنی زندگی کا خاتمہ دیکھ رہی تھی اور اب امی اسے زندگی کی کتنی بڑی خوشخبری دے رہی تھی، وہ دوڑ کر امی کے گلے لگی اور زاروقطار رونے لگی، ''ارے پگلی اب کیوں روتی ہے یہ تو خوشیاں منانے کا وقت ہے، چلو آنسو پوچھ کر بہن کی مدد کرو''۔۔۔ امّی اسکے بے حساب رونے کی وجہ نہ سمجھ سکی تھی اور اقراء وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ وہ کس بات پر خوشی کے آنسو بہائے جا رہی ہے منّو کی خوشیاں لوٹنے پر، عاطف کے رضامند ہونے پر یا پھر اپنی زندگی برباد ہونے سے بچ جانے پر۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ مہناز کو عروسی لباس میں آراستہ کر کے باہر لے آئی تھی جہاں چند گواہوں کی موجودگی میں عاطف اور مہناز نکاح کے پاکیزہ رشتے میں بندھ گئے تھے۔ آپس میں مبارک سلامت کا شور ہونے لگا، معین صاحب نے داماد کو دعائیں دیتے ہوئے اس تبدیلی کے اسباب پوچھے، تو عطف نے اقراء کی آمد سے اسکے سمجھانے تک کی ساری باتیں بتا دی اور بولے ''میں آپا کی مرضی کے آگے خاموش ہو گیا تھا، لیکن اقراء کی باتوں نے میری سوئی روح کو بیدار کر کے مجھے گناہِ عظیم سے بچا لیا، میں ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہونگا سالی صاحبہ کہ آپ کی وجہ سے میں نے اپنے دل کی سنی، اور آج مجھے یہ حقیقت قبول کرنے میں بھی تامّل نہیں ہے کہ ہمیشہ بڑوں کی باتیں اور فیصلے صحیح ہو یہ ضروری نہیں بلکہ چھوٹوں کو بھی سننا چاہئے کیونکہ بعض دفعہ ان میں بڑوں سے زیادہ سمجھداریاں در آتی ہے اور وہ ہمیں بڑے بڑے خساروں سے بچا لیتے ہیں'' عاطف کی بات پر انکے والدین بھی خاموش ہو گئے۔۔۔ سب کی نظریں اب اقراء کے چہرے پر مرکوز تھی، دادی اور

باقی صفحہ ۷۵ پر ملاحظہ کیجیے

مراجعت

حمید قیصر
(اسلام آباد)

تلاش بسیار کے باوجود جب اسے بڑے شہر میں مناسب ملازمت نہ مل سکی تو اس نے اپنے برطانیہ میں کامیابی سے آزمائے گئے آئیڈیا پر کام شروع کر دیا۔ سوشل میڈیا پر اشتہار شائع ہوتے ہی لوگوں نے فون اور دیگر ذرائع سے رابطے شروع کر دیئے۔ ابھی ہفتہ ہی گزرا ہوگا کہ لوگوں کے فون سن سن کر اس کی مت ماری گئی۔

" بہت زبردست سروس شروع کی ہے، کلینک کہاں ہے آپکا؟ کتنا سٹاف رکھا ہے؟ کلینک کے ٹائمنگ کیا ہیں؟ یقیناً ہوم سروس بھی شروع کی ہوگی۔ کیا مجھے جاب مل سکتی ہے؟ فزیوتھراپی کا ایک سیشن کتنی دیر کا ہوتا ہے؟ اور ایک سیشن کے چارجز کیا ہیں؟" وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

ہوم سروس کیلئے تگڑی فیس کے باوجود دن میں اوپر نیچے کئی کئی بکنگز ملنے لگیں۔ رات گئے تھک ہار کر جان چھوٹتی۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر جے ڈی نے قیمتی امپورٹڈ فزیوتھراپی کٹ، انواع و اقسام کے لوشنز اور پرفیومز بھی منگوا لیے۔ اپنے لئے پیشہ ورانہ یونیفارم کے کئی جوڑے بھی لے لیے، جنہیں پہن کر وہ گوروں کو پیچھے چھوڑنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب کی محنت و ریاضت سے فزیوتھراپی کا کام خوب چل نکلا۔ اب وہ ملازمت بھول کر خود کسی کو ملازم رکھنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔

اب تک ڈاکٹر صاحب نے جتنے بھی مریضوں کو وزٹ کیا تھا ان میں معمر مرد اور دو تین بزرگ خواتین بھی شامل تھیں جن کے اکثر ہڈیوں، جوڑوں اور مسلز کے درد کے مسائل تھے۔ تاہم ڈاکٹر جے ڈی نے بڑی جانفشانی سے فزیوتھراپی کے ذریعے ان مریضوں کو راحت و آرام پہنچایا تھا۔ خواتین مریضوں کے آرام و اطمینان کیلئے ڈاکٹر صاحب نے ایک نرس کو فزیوتھراپی کی تربیت دے کر آن کال رکھ لیا اور ابتدائی طور پر گھر کے ڈرائنگ روم میں ہی عارضی کلینک قائم کر لیا۔ محلے میں پتہ چلا تو بوڑھی اور جوان عورتیں سٹاف نرس سے مساج کروانے لگیں۔ یوں دھیرے دھیرے انکا کام چل نکلا۔۔۔

پھر ایک اتوار کی صبح ابھی چائے کا کپ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب سے خاتون کی آواز آئی۔۔۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کیسے ہیں؟"

"جی الحمدللہ۔۔۔ فرمایئے؟"

ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے کو ایک حادثے میں ٹانگ ٹوٹنے کے بعد اب فزیوتھراپی کی ضرورت ہے۔ پلستر کھل چکا ہے مگر ابھی اسے چلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ کیا آپ گھر آ کر علاج کرتے ہیں؟"

"جی ہاں کیوں نہیں، اس کیلئے چار جز الگ ہوتے ہیں۔ مریض کی حالت اور کوائف دیکھ کر بتا سکوں گا کہ مریض کو کتنے سیشنز کی ضرورت ہوگی"۔

"ٹھیک ہے آپ کب تک آسکیں گے؟"

"جی میڈم آپ گھر کا ایڈریس وٹس ایپ کر دیں میں آدھے گھنٹے میں پہنچ جاتا ہوں۔ اتفاق سے آج آپکی ہی پہلی کال ہے"

ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے فزیوتھراپی کی یونیفارم پہنی اور اپنا بیگ تیار کر کے بیگم کو یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ اگر بینش کا فون آئے تو بتا دیں کہ ڈاکٹر صاحب ایک مردانہ مریض کو وزٹ کرنے نکلے ہیں اس لئے آپ اپنے معمول سے کلینک آجائیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کال پر ایک ٹیکسی کار مین گیٹ پر آ کر رکی۔ انہوں نے ڈرائیور کو منزل کا پتہ سمجھایا اور روانہ ہوگئے۔ خاتون خانہ کو وٹس ایپ پر لکھ دیا کہ میں راستے میں ہوں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چلتے ہوئے گانے کی گردن دبوچ لی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے دوستانہ انداز سے استاد غلام علی خاں کو غزل جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

"ہم تیرے شہر میں آئے ہیں
مسافر کی طرح
صرف اک رات ملاقات کا موقع دے دے۔۔۔ ہم تیرے شہر میں۔۔۔"

"دوست، آپ کا ذوق موسیقی بہت عمدہ ہے" ڈاکٹر صاحب بولے

"بس سر جی کیا پوچھتے ہیں۔۔۔"

ڈرائیور نے بیک مرر میں ڈاکٹر صاحب کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر نظریں سڑک پر ٹکا دیں۔ غزل کا تغزل اور شاعری نے عجب کیفیت طاری کر دی۔ ڈاکٹر صاحب دس سال پہلے اسی بڑے شہر میں ایک بڑے گھر کی دوشیزہ کے عشق میں مبتلا تھے مگر دونوں کے درمیان سوشل سٹیٹس کا واضح فرق شادی کی راہ میں حائل ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب برطانیہ جانے سے پہلے سحرش سے آخری ملاقات کیلئے جا رہے تھے تب بھی سردیوں کے ایسے ہی دن تھے۔ چاروں اور ہلکی ہلکی دھند پھیلی تھی اور ریکارڈر پر کوئی غزل سرا تھا۔ آج خاں صاحب گا رہے تھے۔۔۔

''میری منزل ہے کہاں، میرا ٹھکانہ ہے کہاں
صبح تک تجھ سے بچھڑ کر مجھے جانا ہے کہاں
صرف اک رات ملاقات کا موقع دے دے۔۔۔ ہم تیرے شہر میں۔۔۔''

اس وقت انکی دلی کیفیت ہارے ہوئے اس جواری کی مانند تھی جو اپنی کل کائنات کے ملکیت نامے سے دستبرداری پر دستخط کرنے جا رہے ہوں۔۔۔

"اپنی آنکھوں میں چھپا رکھے ہیں جگنو میں نے،
اپنی آنکھوں پہ سجا رکھے ہیں آنسو میں نے،
میری آنکھوں کو بھی برسات کا موقع دے دے،
ہم تیرے شہر میں۔۔۔"

ڈاکٹر صاحب نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا تو دھند میں ڈوبا سرسبز و شاداب پہاڑ اپنا دامن پھیلائے گویا آغوش میں بھر لینے کو تیار کھڑا تھا۔۔۔

"سر جی، بس ہم پہنچنے والے ہیں"

خاں صاحب کی غزل جاری تھی۔۔۔

آج کی رات میرا دردِ محبت سن لے
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی شکایت سن لے
آج اظہار خیالات کا موقع دے دے، ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح۔۔۔

لیجئے سر، یہ رہی کوٹھی نمبر 7

ڈاکٹر صاحب کے گمان میں بہتی خیالات کی رو جیسے تھم گئی اور وہ حقیقی دنیا میں لوٹ آئے۔۔

"شکریہ دوست پیاری سی غزل سنانے کیلئے۔۔۔" اور انہوں نے بغیر کچھ پوچھے ہزار کا نوٹ ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا۔۔۔

"میرا دل کہتا ہے کہ ہم اس اجنبی ستمگر شہر میں ملتے رہیں گے" ٹیکسی ڈرائیور مسکرا کے آگے بڑھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے آہستگی سے گیٹ کی دائیں جانب لگی گھنٹی بجائی۔ نیچے لکڑی کی تختی پر لکھا تھا۔۔۔ "کنج تنہائی"

ڈاکٹر صاحب نے ساگوان کے قد آدم گیٹ سے پار دیکھا تو کنالوں پہ محیط کوٹھی کے چاروں اور سبزہ و گل کہر و شبنم میں نہائے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک بزرگ مالی نے گیٹ کھول کر سلام کیا اور انہیں اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ کشادہ کھردری ٹائلوں پر چلتے ہوئے سامنے دروازے کی اور بڑھے۔

گل داؤدی کی سبھی رنگ روش روش جیسے آنکھوں آنکھوں میں انہی کا استقبال کر رہے ہوں۔ قریب پہنچے تو ایک لڑکی نے استقبال کیا اور انہیں اندر لے جا کر ایک بڑے کشادہ اور آرام دہ بیڈ روم میں بٹھایا۔ انہیں یکبارگی محسوس ہوا جیسے وہ بھٹک کر کسی محل سرا میں آ گئے ہوں۔ تھوڑی دیر میں وہ لڑکی ان کیلئے جوس کا گلاس تپائی پر رکھ کے یہ کہہ کر چلی گئی کہ۔۔۔ "میڈم ابھی آتی ہیں"

ڈاکٹر صاحب جو پہلے ہی ماحول سے اس قدر مرعوب ہو چکے تھے، مریض کے آنے سے پہلے ہی اپنا بیگ کھولنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جوس بھی پیتے جاتے تھے اور گھبراہٹ میں کبھی اطلس و کمخواب میں ڈوبی خواب گاہ کا جائزہ لینے لگتے اور کبھی ان کی بے اختیار نگاہیں اس اندرونی دروازے کی طرف اٹھ جاتیں جدھر سے میڈم نے مریض کو لے کر آنا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے آخری گھونٹ لیکر ایک لمبا سانس لیا اور پرسکون نظر آنے کی سعی کرنے لگے۔ انہیں محسوس ہوا کہ گل داؤدی کی گہری خوشبو جیسے لان سے بے اختیار ہو کر اندر چلی آئی ہو۔ خواب گاہ کی سحر انگیزی اور خوابیدگی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دفعتاً ڈاکٹر صاحب کی نگاہیں ادھر کو اٹھیں تو اک ماہ لقا دراز گیسوں لیے پنک ریشمی نائیٹی میں آہستگی سے کیٹ واک کرتی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔۔۔

"معاف کرنا جیدی تمہیں انتظار کرنا پڑا"

ادھر ڈاکٹر صاحب پہلے ہی کسی خواب میں سے گزر رہے تھے۔ انہیں اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی خواب ہے یا حقیقت؟ وہ پری وش کے احترام میں بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے اور اسکی آواز سن کر جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔۔۔

"ارے جیدی میں سحرش ہوں" یہ کہتے ہوئے سحرش نے جیدی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ نہیں معلوم ایسے میں کتنے سمے بیت گئے ہوں گے۔ ہوش آیا تو دونوں ایک دوسرے کے کاندھے بھگو چکے تھے۔ سحرش نے جیدی کو اسی طرح تھامے ہوئے بیڈ پر بٹھا لیا۔۔۔ ایسے میں خامشی ہمکلامی میں دونوں ہم آغوش دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔۔۔!

- بقیہ -

نادر تحفہ

والدین نے اسے شاباشی دی، گھونگھٹ میں بیٹھی منّو نے اقراء کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا ''میری پیاری بہن تم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، واقعی میں ہمارے لئے یہی سب سے نادر تحفہ ہے''۔۔۔ اور دونوں خوشی سے گلے مل گئی، وہ کسی کام سے کمرے میں گئی تو اسکی نگاہ بیگ میں رکھی ACID BOTTLE پر پڑی لیکن اس لمحے اسکے دل سے تیزاب کا خوف دور ہو گیا تھا کیونکہ آج وہ کسی کی زندگی برباد کرنے میں ناکام رہ گیا تھا۔۔۔ تبھی رانو اسکی تلاش میں وہاں آئی جو کالج سے گھر لوٹنے کے بعد سے اسکے لئے فکرمند تھی اور تھوڑی دیر قبل ہی اسکی خیریت معلوم کرنے آئی تھی اس لئے وہ بھی اس مبارک لمحے کی گواہ بن گئی تھی، رانو اسے باہر لے جانے آئی تھی، اپنی عزیز دوست کو احسانمند نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ اسکے گلے لگ گئی، بہت کچھ تھا جو وہ اس سے کہنا چاہتی تھی، بتانا چاہتی تھی مگر کبھی کبھی خاموشی سب کچھ کہہ جاتی ہے۔۔۔!

خیالِ یار

مدیحہ رحمٰن

(اوکاڑہ)

محفل میں وہ بڑی شان سے اس کے ساتھ والی نشست پر براجمان تھی۔ سماعت سے ٹکرانے والے ہر شعر میں ہمیشہ وہ اپنا اور اس کا عکس دیکھتی۔۔۔ دودھیا رنگت، بڑی چمکدار آنکھیں اور اُن کے گرد حلقے، گھنی بھنویں، گول مٹول چہرہ، پتلی ناک، باریک ہونٹ جن پر ہلکا سا لپ گلوز لگا ہوا تھا، سیاہ لمبے، مخملی گیسو جن سے دھیمی ناریل کی خوشبو آ رہی تھی، اس کی پشت اور شانوں پر بڑی بے ترتیبی و بے نیازی سے بکھرے ہوئے تھے۔۔۔ کالے رنگ کی لمبی قمیض اور چوڑی دار پاجامہ زیب تن کیے ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ مسکارے میں اٹی گھنی جھالروں کو دو سیکنڈ کے بعد جھپکتی اور اوپر والی ٹانگ کو جھولاتی جاتی۔۔۔ پاؤں میں مسٹرڈ رنگ کا کھسہ جس پر ذرا برابر گرد نہ تھی، اس کی نفاست پسندی کی دلیل پیش کر رہا تھا۔۔۔ کچھ ہی دیر میں ساتھ بیٹھے دمکتے آفتاب کا نام ہال میں گونجا تو وہ اک پل کو چونکی۔۔۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیوں کی جانب بڑھا اور اسٹیج کی طرف ہولیا۔۔ اسی پل وہ اسے سرتاپا مکمل دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ جھولتی ٹانگ اب منجمد ہوگئی۔۔۔ چاندی کی چمکدار نگینے والی انگوٹھی اب اسے بے چین کر رہی تھی۔۔ بیکلی میں وہ اسے انگلی میں گھماتی تگنی کا ناچ نچا رہی تھی۔۔۔ رقص کرتی پلکیں اب جھپکنا بھول گئی تھیں۔

سرخ و سیاہ ٹی شرٹ اور بلیو جینز میں ملبوس گندمی رنگت والی بارعب شخصیت، بادامی آنکھیں، ستواں ناک، پیشانی پر بکھرے گھنگریالے بھورے بال گو کسی ماہر مصور کا شاہکار۔۔۔ مدھر آواز والا جادوگر اب شعر کہتا جا رہا تھا۔۔۔ ہجوم سے آتی مکرّر کی گونج سے وہ بار بار دھیما سا تبسّم چہرے پر بکھیر کر وقفہ لیتا۔۔۔ پھر پھولی سانس کے ساتھ شعر دھرا دیتا۔۔۔ اس کی ہر ہر ادا میں طلسم تھا جو نجانے کب سے اسے فریفتہ کیے ہوئے تھا۔۔۔ محفل برخاست ہوئی تو وہ آٹو گراف لینے والوں کے جمِ غفیر میں کہیں گُم ہوگیا۔۔۔ ہال قطار در قطار رنگ برنگی کرسیوں سے بھرا ہوا تھا، جواب خالی پڑی تھیں۔۔۔ تیز روشنی والی جگمگاتی بتیاں اور قمقمے اس کے گرد سجی سنوری لڑکیوں کو مزید نکھار رہے تھے۔۔۔ جھنجھلاہٹ میں اس نے پارکنگ میں کھڑی گاڑی کا رخ کیا۔۔۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلی بار ہونے والا کوئی واقعہ نہیں تھا، اب یہ روز کا معمول بن چکا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنے موبائل کی کانٹیکٹ لسٹ سے Faadi نام کا نمبر ڈائل کیا۔۔۔ وہ ہیلو سننے کے لیے ترستی رہی۔۔۔ گھنٹی مسلسل بجتی رہ گئی، جواب ندارد۔۔۔ دلِ مضطرب نے اب پیغام بھیجنے میں عافیت سمجھی۔

''فادی میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں اگر ایسا کرنا تھا تو مجھے ساتھ لے کر نہ آتے۔۔ میں پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کروں گی، اس کے بعد خود کسی رکشہ یا ٹیکسی سے گھر چلی جاؤں گی۔۔۔ سمجھے؟''

طویل انتظار کے بعد وہ ٹیکسی میں گھر لوٹی تو اس شخص کو اپنے سامنے پایا جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی۔ امی آپ نے پھر انہیں بلا لیا؟؟؟ نظر انداز کرتے ہوئے وہ کچن سے پانی کا گلاس لیے اپنے کمرے کی جانب لپکی۔

بیلا! کھانا تو کھا لو میری جان۔۔۔ امی فہد آ جائے پھر اکٹھے کھاتے ہیں وہ تقریب میں کہیں پھنس گیا ہے۔۔۔ کچھ دیر میں کھانا اس کے کمرے میں لگ چکا تھا، اب دروازہ بند کیے وہ اس کے ہمراہ بیٹھی تھی۔

''فادی یہ تمہارے سر اور چہرے پر راکھ کیسی ہے؟'' وہ اس کے چہرے اور بالوں میں انگلیاں پھیرتی پیار سے سہلاتے ہوئے بولی۔۔۔ ''کل میں نے تمہارے لیے جو پینٹنگ بنائی تھی ناں اس پر چائے گر گئی ہے۔۔۔''

اب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔۔۔ ''فادی تم پہلے مجھے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھلایا کرتے تھے۔۔۔ اب ایسا نہیں ہو رہا۔۔۔ کچھ وقت سے میں تم میں غیر معمولی تبدیلی محسوس کر رہی ہوں جو مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔۔۔ اب تم میرے لیے ایک روٹی کے صرف دو نوالے بناتے ہو۔۔ دیکھو وہ باہر بیٹھے شخص سے مجھے اسی لیے شدید نفرت ہے کیونکہ وہ یہی کہتا ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو گے۔۔۔ اس کی کہی بات کو تم سچ ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

وہ اس کے مرجھائے چہرے کی ٹھوڑی کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے اٹھائے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''بالی! میں محفلوں کا آدمی ہوں مجھے تم سے ہمدردی تو ہو سکتی ہے مگر محبت نہیں۔۔۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو مگر میں تمہارا آئیڈیل نہیں ہوں۔۔۔ تم کبھی میرے دل پر حکمرانی نہیں کر سکتی۔۔۔''

فہد! وہ گھبرا کر بولی۔۔۔ دیکھو میں تمہاری بالی ہوں۔۔۔ تم تو مجھے اس طرح اذیت نہ دو۔۔۔ تم پاگل ہو بیلا۔۔۔ میں پاگل نہیں ہوں۔۔۔ فادی! شاعری نے تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر دی ہے۔۔۔ تم ناں یہ شاعری وائری چھوڑ دو۔۔۔ تم کسی محفل میں مت جایا کرو۔۔۔ جانتی ہوں دیکھنے اور سننے والے تمہیں نظر لگا دیتے ہیں پھر تم مجھ سے اکھڑے اکھڑے رہنے لگتے ہو۔۔۔ وہ اب اپنی پریشان زلفوں کو کنگھی سے سنوارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔۔۔ فادی میری چوٹی بنا دو۔۔۔ میں نے کتنی مشکل سے تمہیں سکھائی تھی۔۔۔ الٹے بل مت دینا اب۔۔۔ سنگھار میز کے سامنے کھڑی وہ اسے پھر سے سکھا رہی تھی۔۔۔ وہ چٹیا بناتے ہوئے بولا۔

''سنو بالی! میں ہرجائی ہوں۔۔۔ آوارہ ہوں۔۔۔ نہ اس کا ہوں، نہ تمہارا ہوں۔۔۔ یاد رکھنا میں ظالم ہوں۔۔۔ ستم ڈھانا میرا شیوہ ہے۔۔۔ میں

رشتے بنا تو لیتا ہوں مگر نبھانا نہیں جانتا۔۔۔مجھ سے کبھی وفا کی امید مت رکھنا۔۔۔''

وہ شیشہ سنگھار سے فادی کو ٹکٹکی بندھے مسلسل دیکھتی رہی۔۔۔وہ نادیدہ جھکی نظروں سے کہنے لگی۔۔۔

''میں جانتی ہوں جب سے وہ باہر بیٹھا شخص ہماری زندگی میں زہر گھولنے کے لیے آیا ہے۔۔تم مجھ سے خفا سے رہنے لگے ہو۔۔۔تم اب کم کم ملتے ہو۔۔۔ملتے ہو تو جانے کی باتیں کرتے ہو۔۔۔تم مجھے سب کہہ لو مگر یوں ساتھ نہ چھوڑو۔۔۔''

اچانک اسے غشی کے دورے پڑنے لگے۔

آنکھ کھلی تو خود کو ہسپتال پایا۔۔۔وہ ہڑبڑاتے ہوئے بولی!

''امی میں بیمار نہیں ہوں۔۔مجھے آپ کیوں یہاں لے کر آ جاتی ہیں؟ مجھے گھر جانا ہے۔۔ فادی بھی آیا ہے یہاں؟؟؟وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔۔۔اسے انتظار سے شدید چڑ ہے۔۔۔مجھے جانے دیں۔۔۔باخدا وہ مجھ سے ناراض تھا۔۔۔اسے ابھی بھی غصہ ہوگا کیا؟؟؟ سہی اور خائف لڑکی سوال در سوال کر رہی تھی۔۔۔اس نے مجھے یہاں دیکھ کر کیا کہا تھا؟؟؟وہ جب آیا تھا تو میرے لیے پھول لایا تھا؟؟؟ شیو بڑھی ہوئی تھی؟؟؟؟امی مجھے اس کے جوتے پالش کرنے ہیں۔۔۔ابھی مجھے اس کی چارپائی پر بستر بھی بچھانا ہے۔۔وہ خود نہیں بچھاتا امی۔۔۔مجھے اس کے تکیے میں تازہ روئی بھرنی ہے۔۔۔اسے سخت تکیے کی عادت نہیں ہے۔۔۔پتہ نہیں اسے اپنی چیک بک بھی ملی کہ نہیں۔۔۔کل اس کی سالگرہ بھی ہے مجھے اس کو تحفے میں وہ تارا دینا ہے جو سب سے زیادہ چمکدار ہوتا ہے۔۔۔کیسے لاؤں گی یا خدا۔۔۔دیکھیں میری چٹیا بھی کھل گئی ہے۔۔۔بال بکھر گئے ہیں۔۔۔اس کو ابھی ٹھیک سے گوندھنی نہیں آتی ناں۔۔۔ مجھے ابھی اس کے لیے کریلے بنانے ہیں۔۔۔لیکن وہ یہاں آیا کیوں نہیں؟؟؟

وہ صرف اسی شخص کے لیے نہیں آتا جسے آپ ہر وقت میرے سر پر سوار رکھتی ہیں۔۔۔امی میری بات سمجھیں۔۔۔اس کو اچھا نہیں لگتا جب کوئی اور مجھ سے ہم کلام ہو۔۔۔پتہ نہیں کیسے مانے گا۔۔۔اب وہ گھٹنوں میں منہ چھپائے بے آواز رو رہی تھی۔

بیلا چوبیس سال کی نوجوان لڑکی تھی، جو پچھلے آٹھ سالوں سے زندگی اور موت کے بیچ جنگ لڑ رہی تھی، تب سے وہ ایک ایسے شخص کے حصار میں تھی جس کا حقیقتاً کوئی وجود نہ تھا مگر وہ اسے ہر چہرے میں نظر آتا تھا، ہر شے میں اس کی جھلک دکھائی دیتی تھی، طویل عرصے سے وصل کی بادِ نسیم میں جیتی بالی کو اب ہجر کی لُو تنگ کر رہی تھی۔

وہ خفگی سے سر اٹھائے سرخ آنکھوں سے قابلِ الزام، قصوروار، تقصیر کار سائیکاٹرسٹ پروفیسر احمر اقبال کو دیکھ رہی تھی جو مریض کی پائنتی جانب کھڑا ٹیبل پر نظریں جھکائے پینسل سے کچھ لکھ رہا تھا۔۔۔

- بقیہ -

جبینِ نیاز

چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آج اپنے کیے پر شرمندہ ہے مگر کیا بھروسہ کل پھر کوئی گُل نہ کھلائے۔ ایک بار جب قدم دہلیز کے باہر نکل جاتے ہیں تو انہیں دوبارہ نکلنے میں دیر نہیں لگتی۔ میں ایسے شخص پر ہرگز اعتبار نہیں کر سکتی اور نہ ہی ایک چھت کے نیچے زندگی گزار سکتی ہوں۔ میرا روم روم غصّے اور نفرت سے اینٹھنے لگا۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ جی چاہا کہ قدم بڑھا کر گُل کو اس سے چھین لوں۔ اُس کی دسترس سے اُس کی آنکھوں سے اوجھل کر دوں۔ گُل کو بلانے جب باہر نکلی تو وہ باپ کی گود میں بیٹھی میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں مگن تھی اور رنجن اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر مسرت اور پُرسکون رنگ رقص کر رہا تھا۔ اُن کی یہ کیفیت دیکھ کر میرا اینٹھا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ نفرت اور غصّے کے شعلے پگھلتے محسوس ہوئے۔ دل کے کسی کونے سے آواز آئی:

''ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں بھی دو اجنبی ایک ساتھ سفر طے کرتے ہیں تم بھی کر لو گی اپنی گُل کی خاطر۔ کم سے کم جو محرومی تم نے سہی ہے گُل کو نہیں سہنے پڑے گی۔''

میں نے دو قدم آگے بڑھا کر گُل کو اپنی گود میں اٹھا لیا:

''چلو آؤ پاپا کے لیے مل کر ناشتہ بناتے ہیں۔''

گُل نے مسکرا کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اُسے سینے سے لگاتے ہی میرے اندر سُلگتا لاوا یکدم شانت ہو گیا۔

☆

وعدہ معاف

تابش خانزادہ
(لاس انجلس)

گوشت خود جانور ہونے کے باوجود لومڑیاں کبھی خود شکار کر کے نہیں کھاتیں۔ وہ ہمیشہ شیر کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہیں۔ جب شیر اپنے کیے ہوئے شکار کو کھا کر اچھی طرح سیر ہو جاتا ہے تو قیلولہ کے لیے کسی قریبی درخت کے نیچے چلا جاتا ہے تو آس پاس موجود لومڑیاں شیر کا بچا ہوا شکار کھا کر اپنا پیٹ بھرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لومڑیاں اپنا ٹھکانہ شیر کے کچھار کے آس پاس ہی بناتی ہیں اور اپنی صبح کا آغاز شیر کی پہلی دہاڑ سے کرتی ہیں۔ جیسے انسانوں کے حکمران بوڑھے ہونے کے بعد جوان خون سے تبدیل کر دیے جاتے ہیں اسی طرح جنگل کے بادشاہ بھی۔ لومڑیاں شیر کو اس کی دہاڑ سے ایسے پہنچانتی ہیں جیسے بادشاہوں کے خواص بادشاہ کی طبیعت کو۔

آج صبح ہی صبح لومڑی کو کسی نئے شیر کی دہاڑ سنائی دی تو اس وقت وہ اپنی غار میں غنودگی کے عالم میں تھی۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا کہ رات کی تاریکی میں جنگل کے پرانے بادشاہ کا تختہ الٹنے کے بعد آج صبح جنگل کی بادشاہت تبدیل ہوگئی ہے۔ لیکن دوسری دہاڑ نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا کہ یہ کسی نئے شیر کی دہاڑ ہے۔ لومڑی پہلے مسکرائی اور پھر خود کو اچھی طرح میک اپ سے آراستہ کرنے کے بعد نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے اپنی غار سے نکل کر شیر کی کچھار کی طرف بڑھنے لگی۔ جس وقت یہ لومڑی شیر کی کچھار کی طرف جا رہی تھی جنگل کے دوسرے جانور نئے شیر سے خوفزدہ ہو کر اپنی اپنی غاروں میں دبکے بیٹھے تھے۔

لومڑی نے راستے میں ملنے والے ایک ہرن سے ماجرا پوچھا تو اس نے سہمے ہوئے لہجے میں بتایا کہ ایک نئے شیر نے پہلے والے شیر کو ہلاک کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔ نیا شیر بہت غصے میں ہے اور ہر آنے جانے والے جانور کو کچا چبانے کے درپے ہے۔ میری مان تو تُو یہاں سے بھاگ کر اپنی جان کی خیر منا۔ ہرن یہ کہہ کر ایک طرف غائب ہو گیا۔ پھر لومڑی کو ایک گیدڑ نظر آیا۔ لومڑی نے اس سے بھی یہی سوال کیا۔ گیدڑ نے ہرن کی بات کی تصدیق کر دی اور لومڑی کو بتایا کہ نیا بادشاہ شکست خوردہ بادشاہ کے مصاحبوں کی جان کے درپے ہے۔ اس کے ساتھ گیدڑ نے لومڑی کو مشورہ دیا کہ چونکہ وہ پرانے شیر کی معتمد خواص میں شامل تھی اس لیے لومڑی کی عافیت میں ہے کہ وہ یہاں سے نکل کر کسی دوسرے جنگل میں جا کر اپنی جان بچائے۔

لیکن لومڑی کے چہرے پر بڑا اطمینان اور بے فکری نظر آ رہی تھی جیسے اسے اتنے بڑے واقعے کی مطلق پرواہ نہ ہو۔ وہ بدستور خراماں خراماں نئے شیر کے کچھار کی جانب بڑھنے لگی۔ اونچائی سے اس نے شیر کو نہایت غضبناک حالت میں پرانے بادشاہ کی لاش کے آس پاس ٹہلتے ہوئے دیکھا تو لومڑی بڑی احتیاط سے بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے شیر کے قریب پہنچی اور اس کو بڑے ادب سے سجدہ ریز سلام کر کے خوش آمدید کہا۔ لومڑی کی آواز سن کر شیر متوجہ ہوا اور لپک کر لومڑی کو دبوچتے ہوئے بولا، میری خفیہ ایجنسی نے پرانے بادشاہ کے مصاحبوں کی جو لسٹ مجھے دی ہے اس میں تمہارا نام سرفہرست ہے اس لیے آج تو میرے غضب سے نہیں بچ سکتی۔ آج میں تم سے ان تمام مظالم کا حساب لوں گا جو تم نے پرانے شیر سے مل کر جنگل کے جانوروں پر کیے تھے۔

لومڑی نے شیر کے غصے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا حضور! اسی لیے تو میں آپ کی خدمت اقدس میں بذاتِ خود حاضر ہوئی ہوں کہ اس کے ظالمانہ رویے سے آپ کو آگاہ کروں۔ حضور! کیا بتاؤں کہ میری چشم گہنگار نے اس درندے کے کیا کیا مظالم سنے اور دیکھے ہیں۔ جو کچھ میں نے سنا اور دیکھا ہے خدا کسی دشمن کو نہ دکھائے اور نہ سنوائے۔ اس کے ظلم و ستم کو دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آتا تھا اور میں دن رات دعائیں مانگا کرتی تھی کہ خدا اس شیر کو غارت کرے اور آپ جیسے کسی قلندر شیر کو اس کی جگہ جنگل کی حکمرانی سونپے۔ آج میری برسوں کی دعائیں قبول ہوگئی ہیں اور خدا نے آپ جیسے جواں اور ذی شان شیر کو میرا بلکہ سارے جنگل کا نجات دہندہ بنا کے بھیجا ہے۔

لومڑی کی فراست بھری گفتگو سن کر نیا شیر بہت خوش ہوا اور اسے اپنے خاص مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ اس نے ہلاک شدہ شیر کے بچے کھچے ورثے کی ایک فہرست تیار کی اور لومڑی کو اس کا والی مقرر کرنے کے بعد اس نے لومڑی کو خصوصی پینل کا جج مقرر کر کے اسے پرانے بادشاہ کے مصاحبوں پر مظالم کے مقدمات سننے اور سزائیں دینے کا آرڈیننس جاری کر دیا اور جنگل کے نئے حکمران نے لومڑی کی مدد سے تاج شاہی پہنا۔ اس روز کے بعد نیا شیر جہاں بھی شکار کے لیے جاتا تو لومڑی کو ہمیشہ اپنے خاص مصاحبین میں شامل رکھتا۔

وقت گزرتا گیا اور پھر شیر پرانا ہو گیا اور اس کی دہاڑ میں بھی کمزوری آتی چلی گئی اور پھر ایک رات اس جنگل کے باسی ایک نئے شیر کی دہاڑ سن کر ایک بار پھر لرز گئے۔ لیکن لومڑی نئی دہاڑ سن کر ہلکے سے مسکرائی اور پھر خود کو اچھی طرح میک اپ سے آراستہ کرنے کے بعد نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے اپنی غار سے نکل کر شیر کی کچھار کی طرف بڑھتے ہوئے سوچنے لگی، آخر نئے شیر کو بھی جانے والے شیر کی حکومت کے خلاف وعدہ معاف گواہوں کی ضرورت ہوگی۔

کہانی شاید دلچسپ نہ ہو، مگر کہانی میں چھپا طنز، ڈھونڈنے یا تلاش کرنے کے لیے کہیں جانے کے بجائے، آنکھیں کھلی اور چوکنا ہونا ضروری ہے!!!

حسنِ زن

دنیا کی تین خوبصورت ترین عورتیں، میری ماں، اس کا سایہ اور آئینے میں اس کا عکس۔

خلیل جبران

احساس کے خوفناک سائے

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
(جموں)

اتوار کی ایک سہانی دوپہر میں اپنی پچیس لاکھ روپے کی آرام دہ نئے ماڈل کی گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مصوّر القمر کی نظر جونہی اُس کے سامنے لگے چھوٹے سے آئینے پر پڑی تو اُسے اپنے چہرے پر ادھیڑ عمری کے آثار دیکھ کر اس بات کا شدید احساس ہوا کہ اُس کا وجود وقت کے دریا میں بہتے بہتے اپنا سب رنگ وروپ کھو چکا ہے۔اُس کے سر کے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی اُگ آئی تھی۔چہرے پہ اب وہ پہلی سی لالی نظر نہیں آرہی تھی۔منہ میں بہت سی داڑھیں دم توڑ چکی تھیں۔اسی حقیقت نے اُس کے دل میں یہ احساس بھی پیدا کر دیا کہ وہ بچپن،لڑکپن اور جوانی کی منزلوں سے گزرنے کے بعد اب بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھنے جا رہا ہے۔

مصوّر القمر ایک بڑی عدالت میں منصف کے فرائض انجام دے رہا تھا۔اُس کی ملازمت کا زیادہ تر زمانہ گزر چکا تھا،چند سال باقی رہ گئے تھے۔اُس نے اپنے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لئے ہر طرح کی مشکلات کا سامنا خندہ پیشانی سے کیا تھا۔اُس کا کامل یقین تھا کہ جب آدمی کا ضمیر مر جاتا ہے تو پھر وہ ایک زندہ لاش کی مانند رہ جاتا ہے۔اسی لئے وہ عدالت میں آنے کے بعد عدل وانصاف کی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے آسمان کی طرف نظریں اُٹھاتا دل ہی دل میں خالق کائنات سے التجا کرتا کہ وہ اُسے یہ توفیق عطا فرمائے کہ اس عدل وانصاف کی کرسی پر بیٹھ کر ظالم کو اُس کے ظلم کی سزا دلا سکے اور مظلوم کو خوش کر سکے۔قانون پڑھتے پڑھتے اور وکلاء کی بحث سُنتے سُنتے اُس کا دل کافی حسّاس اور دماغ مشّاق ہو گیا تھا۔اُس کے دماغ میں آج نہ جانے کیوں اپنے سفر حیات کے مختلف پڑاؤ ایک فلم سیٹ کی طرح گردش کرنے لگے تھے۔ساتھ ہی اُس کے دل میں زندگی کی ناپائیداری کا احساس اُسے سرد آہیں لینے پر مجبور کر رہا تھا۔اُسے اپنا بچپن یاد آنے لگا کہ جب وہ بے فکری اور مستانگی کے دن گزارتا تھا۔ایک غریب لوہار کا بیٹا ہونے کے باوجود اُس نے اپنے تین بھائیوں اور دو بہنوں میں پہلی کلاس سے ہی امتحانات میں اچھے نمبرات حاصل کئے تھے۔اُسے دیہات میں گزارے دن یاد آنے لگے کہ جب وہ کھیتوں کھلیانوں،جنگلوں اور بیابانوں میں گھوما کرتا تھا،شام ہوتے ہی مھارُو کے پیڑوں پر چمگادڑ نُما گلہریوں کی اُچھل کود،دُور سے بانسری کی دُھن،کوئل کی کوک اور پپیہے کی چہک سُن کر لمحہ بھر کے لئے مسرور ہو جاتا تھا۔دھان اور مکئی کے کھیتوں کی ہریالی اُس کا من موہ لیتی تھی۔شادی وغمی کے ماحول کو اُس نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔اُس نے اپنی دیہاتی زندگی میں دُلہے کو گھوڑے پہ سوار ہو کر بینڈ باجے کی دُھن پر براتیوں کو ناچتے،اُدھم مچاتے دُلہن کے گھر جاتے دیکھا تھا۔اُس نے دُلہن کو روتے ہوئے اپنے والدین،بھائی،بہنوں کے گلے لگ کر ڈولی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔کہاروں کو مخصوص انداز میں ڈولی اُٹھاتے دیکھا تھا۔اُس نے اپنے گاؤں میں کچھ بچّے،جوان اور ضعیف العمر مردوں وعورتوں کی تجہیز وتکفین کرتے دیکھا تھا۔اُس نے اپنے گاؤں کے سامنے پار ہندو برادری میں کئی متوفین کی ارتھی اُٹھتے بھی دیکھی تھی،سنکھ کی بکسُری آواز سُن کر اُس کا دل مایوس ہو جاتا تھا۔اُسے وہ ٹونا بھی یاد آیا کہ جب اُس کے گاؤں کے سامنے پار رام بابو کی ارتھی اُٹھی تھی۔اُس کے مردہ جسم پر لال رنگ کا کپڑا تھا۔چار آدمی لکڑی کے تختے پر اُس کی ارتھی اُٹھائے نیچے ڈھلوان میں ندی کے کنارے شمشان گھاٹ کی طرف لے جا رہے تھے کہ اسی دوران مصورالقمر کی ماں نے اُسے کہا تھا:

''بیٹے!وہ دیکھ سامنے پار رام بابو کی ارتھی اُٹھی ہے۔اُس کے لواحقین اُسے شمشان گھاٹ کی طرف لے جا رہے ہیں۔یہ موقع غنیمت جان لے۔تیرے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں پر مسّے ہیں۔سات تیلیاں ہاتھ میں لے پھر ہر ایک تیلی کو سات سات بار مسّوں پر پھیرتے ہوئے یہ کہتا جا کہ او دُنیا سے جانے والے میرے ان مسّوں کو ساتھ لیتا جا۔دیکھنا ایک مہینے کے بعد تیری اُنگلیوں سے یہ مسّے غائب ہو جائیں گے''

اُس نے اپنی ماں کا بتایا ہوا یہ ٹونا کر کے دیکھا تھا کہ واقعی ایک مہینے کے بعد اُس کی انگلیوں سے مسّے غائب ہو گئے تھے۔دسویں اور بارہویں جماعت میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد جب اُس نے کالج میں داخلہ لیا تھا تو اُس کی جوانی نے اُسے یہ احساس کرایا تھا کہ زندگی کا سب سے نازک ترین اسٹیج یہی ہوتا ہے جس میں اگر آدمی بہک گیا تو گناہوں کی دلدل میں پھنس کر اپنی زندگی تباہ کر دیتا ہے اور اگر فکر واحساس اور محنت ومشقت سے کام کرتا ہے تو اُس کی زندگی خوب صورت بن جاتی ہے۔بی ایس سی میں بھی پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد اُس نے ایل ایل بی کیا تھا۔وہ ایک ایسا وکیل بننا چاہتا تھا جو ہمیشہ سچائی کا ساتھ دے اور ایسے لوگوں کی وکالت کرے جو غریب،مظلوم اور بے سہارا ہوں۔

وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد مصوّر القمر نے شہر کی ایک پڑھی لکھی لڑکی نازنین کے ساتھ شادی کی تھی۔پھر وہ مستقل طور پر دیہاتی ماحول سے نکل کر شہری ماحول میں آ کے بس گیا تھا۔خوب صورت تو وہ بچپن ہی سے تھا لیکن نازنین کے آنے سے اُس کی زندگی میں بہار آ گئی تھی۔اُس نے مصوّر القمر کی زندگی کو نکھارنے سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔وہ انگریزی میں ایم اے تھی۔دونوں کی نئی نئی شادی نے اُن کے جذبات واحساسات میں ایک طرح کا اُچھال پیدا کر دیا تھا۔پھر تین سال کے بعد اُن کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی۔چار چار سال کے بعد نازنین نے دو بیٹوں کو جنم دیا تھا۔خوب صورت مکان تعمیر کروانے کی چاہت،گھر کے لئے ضرورت کا معیاری سامان خریدنے کا ارمان،

بچّوں کی بہتر تعلیم وتربیت کی فکر، والدین، بھائی، بہنوں، رشتے داروں اور دوست یاروں کی فرمائشوں نے مصورالقمر اور نازنین کے حسن وجمال میں خاصی کمی پیدا کردی تھی۔ دونوں اب اپنے آپ کو یوں محسوس کررہے تھے کہ جیسے اُن کی حیثیت اُس لباس یا برتن کی سی ہے جو گردشِ ایّام میں اپنی خوب صورتی کھونے کے بعد آخر کار میلا ہوجاتا ہے یہاں تک کہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

مصوّرالقمر یادِ ماضی میں سرگرداں گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے تین منزلہ مکان پر نظریں دوڑائیں، پھر اُس نے اپنے آپ سے کہا یہ تیرے محل چوبارے، یہیں رہ جائیں گے پیارے!۔ اُس کے دل ودماغ سے ہوتے ہوئے پورے وجود میں آج نہ جانے کیوں احساس کے خوفناک سائے پھیلتے جارہے تھے۔ اپنی گذشتہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اُسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ اُس کا وجود وقت کے آہنی شکنجے میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو سدا بہار نہیں رکھ پائے گا۔ اُس نے اپنے مخصوص کمرے میں آکر قیمتی سوٹ بوٹ اور ٹائی اُتاری۔ نائٹ سوٹ زیب تن کرہی رہا تھا کہ اتنے میں نازنین اُس کے قریب آئی۔ اُس نے بیوی کو سرتاپا دیکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی:

''کیا آپ مجھے آج پہلی بار دیکھ رہے ہیں؟''

مصورالقمر نے کہا

''تمھارا نام نازنین ہے لیکن اب تم میں وہ پہلے سے ناز وانداز نہیں رہے۔ مجھے تمھاری ان خوب صورت ریشمی زلفوں میں کہیں کہیں سفیدی نظر آرہی ہے۔ تمھارے چہرے پر جوانی کا خمار ونکھار مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔ کہیں ہم دونوں بوڑھے تو نہیں ہورہے ہیں!''

نازنین، مصورالقمر کی باتیں سُن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُس نے کہا

''کیا آپ ابھی بھی اپنے آپ کو جوان سمجھ رہے ہیں؟ مجھے تو آپ میں بڑھاپے کے آثار صاف نظر آرہے ہیں۔ آپ کوئی بھی تحریر بغیر عینک کے نہیں پڑھ پاتے ہیں۔ شوگر اور بلڈ پریشر کا آپ پہ غلبہ ہے، آپ کی ملازمت کا سورج دھیرے دھیرے غروب ہورہا ہے۔ اس عمر میں آدمی لباس کتنا ہی قیمتی کیوں نہ پہن لے بڑھاپے کے آثار چھپائے نہیں چھپتے''

''تم کسی حد تک صحیح کہہ رہی ہو لیکن میرا دل جوان ہے''

نازنین نے کہا:

''دیکھئے، ایک پُرسکون اور آرام دہ زندگی جینے کے لئے جسم وجان کا تندرست رہنا نہایت ضروری ہے۔ اسی لئے کسی بزرگ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ ورنہ زندگی ایک بارِ گراں محسوس ہوتی ہے۔ آج آپ مجھے حسبِ معمول ہشّاش بشّاش نظر نہیں آرہے ہیں۔''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس یونہی بات میں بات پیدا ہورہی ہے''

''بہرحال جو بھی ہے۔ مجھے آپ ہر وقت خوش نظر آنے چاہیئے'' یہ کہتے ہوئے وہ رسوئی کی طرف چلی گئی۔ اُس نے ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا لگا دیا۔ کچھ ہی وقت کے بعد مصورالقمر کی بیٹی شاہدہ اور اُن کے دونوں بیٹے بھی ڈائننگ ٹیبل کے قریب کرسیوں پہ آکے بیٹھ گئے۔ شاہدہ گریجویشن کے آخری سال میں ہے۔ بڑا بیٹا عمران ایم بی بی ایس کررہا ہے اور چھوٹا بیٹا ذیشان بارہویں جماعت میں زیرِ تعلیم ہے۔ کھانا کھانے کے بعد نازنین نے اپنے شوہر سے ایک بار پھر پوچھا:

''میں آج آپ کو کسی گہری سوچ میں محسوس کررہی ہوں۔ آخر اس خاموشی اور گہری سوچ کی کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''میں نے علمائے دین سے سُنا ہے کہ خاموشی آدھی عبادت ہے۔ اس لئے خاموشی کو ترجیح دینے لگا ہوں''

لیکن میں نے کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا ہے کہ

خاموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے
تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

مصورالقمر کے ہونٹوں پہ بیوی کا شعر سُن کر تھوڑی سی مسکان پھیل گئی۔ اُس نے لمحہ بھر بیوی کو کوئی بات نہیں بتائی لیکن پھر اُس نے سوچا کہ میری خاموشی کہیں میری شریکِ زندگی کے لئے تشویش کا باعث نہ بن جائے۔

''نازنین! زندگی کا ہر لمحہ اعلانِ جدائی کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ مجھے میرا وجود وقت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی کا احساس میری رگ رگ میں اُتر چکا ہے۔ میں مستقبل کے بارے میں بہت کچھ سوچنے لگا ہوں۔''

نازنین نے مصورالقمر کو سمجھا دیا:

''دیکھئے ہر حال میں خوش رہنا سیکھئے۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے''

رات کو کھانا کھانے کے بعد مصورالقمر نے اپنی لائبریری میں جاکر لوہے کی الماریوں میں ترتیب وار لگی بڑی ضخیم اور قیمتی کتابوں پر نظریں دوڑائیں تو ایک ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گیا، یہ سوچتے ہوئے کہ میرے مرنے کے بعد ان کتابوں کو کون سنبھالے گا، کون پڑھے گا۔ ان کتابوں کے ساتھ میری زندگی کا بیشتر زمانہ گزر چکا ہے۔ وہ لائبریری سے نکل کر بیڈروم میں آکے بستر پر دراز ہوگیا۔ اُس کے دماغ میں سوچ کے دائرے پھیلنے لگے۔ اُداسی اور مایوسی کے مہیب سائے اُس کے دل ودماغ کا تعاقب کرنے لگے۔ اُس نے سوچا ابھی میں ملازمت میں ہوں، عدالت میں پہنچنے کے فوراً بعد میرے آگے پیچھے چپراسی، دربان، بڑے بڑے سرمایہ دار لوگ اور وکلاء جھک جھک کے مجھے سلام کرتے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میرا رعب ودبدبہ ختم ہوجائے گا۔ مجھ سے تمام اختیارات چھن جائیں گے۔ پینشن میرے بڑھاپے کا مالی سہارا ہوگی۔ میرے وجود میں خون کی کمی آنا شروع ہوجائے گی، میرے سر کے بال برف کی مانند سفید ہوجائیں گے۔ تیز چلنے سے میری سانسیں پھولنے لگیں گی۔ ہاتھ کپکپانے لگیں گے۔ قوتِ سماعت اور آنکھوں کی بینائی میں کمی آجائے گی۔ جب میرے سارے

باقی صفحہ ۱۰۷ پر ملاحظہ کیجیے

"نکہتِ بہاراں"

ساغر صدیقی

(۱۹۲۸ء تا ۱۹۷۴ء)

اگر بزمِ انساں میں عورت نہ ہوتی
خیالوں کی رنگین جنت نہ ہوتی

ستاروں کے دل کش فسانے نہ ہوتے
بہاروں کی نازک حقیقت نہ ہوتی

جبینوں پہ نورِ مسرت نہ ہوتا
نگاہوں میں شانِ مروت نہ ہوتی

گھٹاؤں کی آمد کو ساون ترستے
فضاؤں میں بہکی بغاوت نہ ہوتی

فقیروں کو عرفانِ ہستی نہ ملتا
عطاء زاہدوں کو عبادت نہ ہوتی

مسافر سدا منزلوں پر بھٹکتے
سفینوں کو ساحل کی قربت نہ ہوتی

ہر اک پھول کا رنگ پھیکا سا ہوتا
نسیمِ بہاراں میں نکہت نہ ہوتی

خدائی کا انصاف خاموش رہتا
سنا ہے کسی کی شفاعت نہ ہوتی

○

ولی عالم شاہین

(کینیڈا)

بے شغل و مدارات چلے جاؤ گے؟ نہ نہ
آ کر بھی کب آتے ہو کہ پھر آؤ گے؟ نہ نہ

خوشبو سے ہماری ہے خوش آثار یہ مٹّی
مٹّی کی یہ پہچان مٹا پاؤ گے؟ نہ نہ

مانا کہ ہو پردے پہ اور اخبار میں گلپوش
گلیوں میں تم آنکھیں بھی ملا پاؤ گے؟ نہ نہ

ہو ساری قطاروں میں تمہی شیش محل کی
باقی ہے کہاں کون کہ شرماؤ گے؟ نہ نہ

سچ ہوتی ہے دو بار ہی دیوار گھڑی اب
تم بھی مرے دل! وقت سے کتراؤ گے؟ نہ نہ

ہاں، کوہِ گراں روئی کے گالوں کی طرح ہیں
دل میں بھی کوئی حشر اٹھا پاؤ گے؟ نہ نہ

نکلی نہ سرِ شاخ ابھی ایک بھی کونپل
پھر بے خبری کی ہی خبر لاؤ گے؟ نہ نہ

ملتا ہے یہاں ایک ہی موقع سرِ آغاز
پھر کاہے پسِ فیصلہ پچھتاؤ گے؟ نہ نہ

ممکن ہے نکل جاؤ کسی اور ڈگر پر
پنگھٹ پہ کہیں رک کے پلٹ آؤ گے؟ نہ نہ

سانسیں ہیں تو سانسوں کا تحفظ بھی ہے لازم
گھر آتے ہوئے ڈھال کو پھینک آؤ گے؟ نہ نہ

آنکھوں میں اترتی ہی نہیں شامِ غزل کیوں
بے نور و نوا یونہی بکھر جاؤ گے؟ نہ نہ

○

خالد اقبال یاسر
(اسلام آباد)

خوش گمانی تھی مری، ایسے نہیں ہو سکتا
ہو بھی سکتا ہو تو یوں کھل کے نہیں ہو سکتا

اس کی ابرو کے اشارے پہ ہوا کرتا ہے
جو ہوا اس سے بنا پوچھے نہیں ہو سکتا

روبرو آ کے ذرا مجھ سے وہ دوبارہ کہے
دیکھتا ہوں کہ بھلا کیسے نہیں ہو سکتا

کن گمانوں میں ہے وہ بوزنہ حرف انداز
کوئی نمرود بھی جو چاہے نہیں ہو سکتا

اس کے ہاتھوں میں نہیں گنبد دوار کی باگ
جو بھی آئندہ ہے وہ پہلے نہیں ہو سکتا

سرگروہی نہیں جچتی اسے شمہ بھر بھی
جو بھی کہتا رہے وہ، اس سے نہیں ہو سکتا

ہو بھی جاتا ہے مگر مان کے دیتا ہی نہیں
زعم کتنا ہے اسے، جیسے نہیں ہو سکتا

گردش چرخ بھی پیچھے کو نہیں پھر سکتی
وقت معلوم اگر آگے نہیں ہو سکتا

سر بچایا نہیں یاسر کبھی اپنی خاطر
سر اٹھایا ہے تو اب نیچے نہیں ہو سکتا

○

اشرف جاوید
(کراچی)

دیپ سے دیپ جلانے میں بہت دیر لگی
دھیان کو گیان بنانے میں بہت دیر لگی

مر گئے وارثِ مقتول مقدمہ لڑتے
انھیں انصاف دلانے میں بہت دیر لگی

رات معمول سے لمبی تو نہیں تھی، لیکن
رات سورج کو جگانے میں بہت دیر لگی

پہلے دریا کو کناروں کے میاں لایا گیا
پھر کناروں کو ملانے میں بہت دیر لگی

کبھی روٹھے رہے دنیا سے بہت دیر تلک!
کبھی دنیا کو منانے میں بہت دیر لگی

بات کرنے میں کوئی امر نہیں تھا مانع!
بات کو آگے بڑھانے میں بہت دیر لگی

اپنے ہونے کا اُسے پہلے یقیں آ جاتا!
لیکن آواز اُٹھانے میں بہت دیر لگی

ایک تو اُس کو بلانے میں تامّل برتا
دوسرا، اُس کے بھی آنے میں بہت دیر لگی

حال پوچھا ہے مسیحا نے بہت دیر کے بعد
ہمیں بھی حال سنانے میں بہت دیر لگی

○

ارشد سعید
(آسٹریلیا)

رکھ کر بھی کیا کریں گے منہ میں زبان اپنی
ویران ہو گئی ہے چلتی دکان اپنی

صدیوں سے حکمراں ہیں انساں نما درندے
اچھا ہے تان لیں ہم اِن پر کمان اپنی

چلتا رہے گا یوں ہی یہ کاروبارِ ہستی
سر کو جھکا کے سن لے تُو بھی اذان اپنی

اُس وقت دیکھنا تم اپنی زمیں کے موسم
رنگت بدل رہا ہو جب آسمان اپنی

دیکھو تو ہم ہیں شاعر ذرّات کے برابر
سوچو تو آسماں تک اونچی اڑان اپنی

خود سے زیادہ خود کو کوئی نہیں سمجھتا
خود سے ہی مشورہ کر ہر بات مان اپنی

ہم بے دیار ارشدؔ آئے ہیں اب وطن میں
پہچان کر ہی لے گا اک دن جہان اپنی

○

جمیل عثمان
(نیویارک)

دعائیں جتنی بھی مجھ کو ہیں ازبر بھول جاتا ہوں
سلیقہ مانگنے کا اس سے اکثر بھول جاتا ہوں

جو دیواروں پہ لکھے ہیں نوشتے پڑھ تو لیتا ہوں
مگر کیا کیجیے میں ان کو پڑھ کر بھول جاتا ہوں

محبت سے کہے جملے ہمیشہ یاد رہتے ہیں
عناد و بغض کی باتیں میں یکسر بھول جاتا ہوں

چلاتا ہے کوئی جب طنز کے نشتر مرے دل پر
میں تھوڑے ہی دنوں میں زخم کھا کر بھول جاتا ہوں

ملاتا ہوں خلوص_ دل سے اپنا ہاتھ میں سب سے
کبھی ان آستینوں میں تھے خنجر، بھول جاتا ہوں

میں حق گوئی کا عادی ہوں اور اس عادت کے بدلے میں
برستے ہیں جو مجھ پر، میں وہ پتھر بھول جاتا ہوں

مرے اللہ میرے شہر میں مجھ کو اماں دے دے
بھٹکتا ہوں میں ویرانوں میں اور گھر بھول جاتا ہوں

نکلتا ہوں میں سر دینے مگر جب وقت آتا ہے
میں دے کر دست در دست_ عدو، سر بھول جاتا ہوں

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

تُو نے دیوانہ بنایا تو میں دیوانہ بنا
مست ادائیں تھیں تری، دیکھ کے مستانہ بنا

کیسی جادو بھری باتیں تھیں جنہیں سُن سُن کر
خود سے بے خود ہوُا، ماحول سے بیگانہ بنا

کیسا دستورِ محبت ہے کہ جو بھی راہی
عشق کی راہ میں نکلا، وہی افسانہ بنا

پَر جلا کر بھی تڑپنے کا مزہ پوچھ اُس سے
جو کسی شوخ حسینہ کا ہو پروانہ بنا

تُم کو جب پیار سے دیکھا تو پھر ایسا بھی ہوُا
اپنے یاروں کا رویّہ بھی رقیبانہ بنا

مئے پرستی کو مری دیکھ، کرم کر مجھ پر
ہاتھ سے تُو نہ پِلا، آنکھ کو پیمانہ بنا

عمر تو یوں بھی گزر جاتی ترے بن جاناں
میری قسمت ، ترا کوچہ مرا کاشانہ بنا

○

فقیہ حیدر

(اسلام آباد)

میں جنوں میں ہوں گرفتار مجھے جانتے ہیں؟
آپ لگتے ہیں سمجھ دار مجھے جانتے ہیں؟

جتنا عاجز ہوں میں اتنی ہی انا ہے مجھ میں
اس حوالے سے مرے یار مجھے جانتے ہیں

اس لیے خوف نہیں آتا مجھے دریا سے
مجھے معلوم ہے منجدھار مجھے جانتے ہیں

میں بلا ناغہ اڑاتا ہوں مکانوں میں خاک
شہر کے سب درودیوار مجھے جانتے ہیں

میری اک عمر فقط جنگ و جدل میں گزری
تیر ہو برچھی کہ تلوار مجھے جانتے ہیں

میری تعمیر مرا ملبہ بنی ہے کیسے ؟
میرے جیسے سبھی مسمار مجھے جانتے ہیں

تو نہیں جانتا مجھ کو تو الگ ہے ورنہ
تیرے لشکر کے علم دار مجھے جانتے ہیں

ایک مدت سے بھلا رکھا ہے اپنوں نے فقیہ
شکر صد شکر کہ اغیار مجھے جانتے ہیں

○

نبیل احمد نبیل

(لاہور)

اِس دل کے اِضطراب کا مطلب کچھ اور ہے
لیکن ترے حساب کا مطلب کچھ اور ہے

یہ ماہتاب صرف فلک آشنا نہیں
اِس شامِ ماہتاب کا مطلب کچھ اور ہے

میں نے کہی ہے بات زمانے کے درد کی
لیکن ترے جواب کا مطلب کچھ اور ہے

اِتنا بُرا نہ مانیے اِس دل کی بات کا
اِس خانماں خراب کا مطلب کچھ اور ہے

زُلفوں کا یہ نہیں کسی شاخِ طلب کا ہے
بکھرے ہُوئے گلاب کا مطلب کچھ اور ہے

کُچھ اور کہہ رہی ہے نظر کی فسردگی
پلکوں پہ اشکِ آب کا مطلب کُچھ اور ہے

کچّے گھڑے کے اور تقاضے ہیں دیکھیے
اِس موجۂ چناب کا مطلب کُچھ اور ہے

یہ شہرِ بے حسی ہے یہاں کم نظر ہیں لوگ
اِس میں تو انقلاب کا مطلب کُچھ اور ہے

پیمانۂ سزا و جزا اور ہے یہاں
اِس طرزِ احتساب کا مطلب کُچھ اور ہے

یہ بات جھوٹ ہے کہ وہ مجھ سے ہے بدگماں
مجھ سے اِس اجتناب کا مطلب کُچھ اور ہے

اِس مے کشی کا اُن کی جُدائی سبب نہیں
چھلکی ہُوئی شراب کا مطلب کُچھ اور ہے

تم اِس کو جو بھی نام دو جو بھی کہو مگر
حدِّ نظر سراب کا مطلب کُچھ اور ہے

دُنیا سے ہے جُدا مری تنہائی کا سبب
ٹھہرے ہُوئے عذاب کا مطلب کُچھ اور ہے

حرص و ہَوا کا نام جسے دے رہے ہو تم
اس حسنِ پُر شباب کا مطلب کُچھ اور ہے

خوفِ نگاہِ بد بھی ہے پیشِ نظر ضرور
رُخ پر مگر حجاب کا مطلب کُچھ اور ہے

پاسِ خُدا ہے تجھ کو نہ خوفِ خُدا کوئی
اِس سجدۂ ثواب کا مطلب کُچھ اور ہے

اِس کو نبیل اشکِ ندامت نہ جانیے
اِس بار اس حباب کا مطلب کُچھ اور ہے

احمد رضا راجا

(لاہور)

وہ آفتاب ہوں جو خود ہی دن نکالتا ہے
تُو میری رات چراغوں سے کیوں اجالتا ہے

اسیرِ شام و سحر میں رہوں وہ چاہتا ہے
تبھی تو وقت مجھے روز و شب میں ٹالتا ہے

وہی مجھے بھی وسیلے حیات کے دے گا
جو پتھروں میں چھپی زندگی کو پالتا ہے

جسے ہوا کے مخالف اُڑان بھرنی ہو
وہ پنچھی اُڑتے ہوئے پَر کہاں سنبھالتا ہے

کہ دور دور تلک کف سے بھر گیا ساحل
یہ چاند ایسے سمندر کو کیوں اچھالتا ہے

تم اپنی پیار کہانی کو عام مت کرنا
زمانہ ایسے فسانے بہت اچھالتا ہے

یہ پیڑ ہیں جو بچاتے ہیں دھوپ سے ورنہ
کسی پہ کون یہاں اپنا سایا ڈالتا ہے

وہ وقت آنے پہ اپنا حساب کر لے گا
کسی کو کون یہاں بے سبب سنبھالتا ہے

حرارتوں کی بھی جیبوں میں کچھ نہیں راجا!
گُلوں کا زَر یوں صبا سے کوئی نکالتا ہے؟

- ناول -

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار

(میاں)

قسط ۱۰

جب سے شاہ صاحب مدینے والے میوات تشریف لائے ہیں۔۔۔ اُس وقت سے شاہ صاحب کا موڈ۔۔۔ مزاج۔۔۔ اور میل ملاپ میں۔۔۔ پہلے سی گرمجوشی۔۔۔ مٹھاس۔۔۔ اور۔۔۔ روانی۔۔۔ نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔۔۔ کھانے پینے۔۔۔ اُٹھنے بیٹھنے۔۔۔ اور۔۔۔ سونے جاگنے میں بے قاعدگی کے سبب۔۔۔ شاہ صاحب کے چہرے کی لالی۔۔۔ اور۔۔۔ آنکھوں کی چمک بھی۔۔۔ ہرگزرنے والے دن کے ساتھ۔۔۔ ماند پڑتی جارہی ہے۔۔۔ روز صبح شاہ صاحب۔۔۔ بادلِ نخواستہ۔۔۔ عقیدت مندوں کو دیدار بھی کراتے۔۔۔ اور۔۔۔ اُن کی جانب۔۔۔ دونوں ہاتھ بڑھا کر۔۔۔ چومنے اور آنکھوں سے لگانے کی سعادت بھی عطا کرتے ہیں۔۔۔ مگر۔۔۔ جونہی۔۔۔ کوئی عقیدت مند۔۔۔ دم۔۔۔ درود۔۔۔ تعویز۔۔۔ گنڈے۔۔۔ یا بیماری کے علاج کی درخواست کرتا ہے۔۔۔ تو۔۔۔ شاہ صاحب کے لہجے میں اچانک سختی عود کر آتی ہے۔۔۔ شاہ صاحب اکثر۔۔۔ زوار شاہ۔۔۔ جبار شاہ۔۔۔ دلدار شاہ۔۔۔ اور۔۔۔ قریبی دوستوں سے۔۔۔ اس بات پر فکرمندی کا اظہار کرتے ہیں۔۔۔ کہ۔۔۔ عقیدت۔۔۔ نیاز مندی۔۔۔ دم۔۔۔ درود۔۔۔ کی حد تک۔۔۔ تو۔۔۔ اُن کا۔۔۔ کسی نہ کسی طور۔۔۔ زور چلتا ہے۔۔۔!

طرح طرح کی موسمی۔۔۔ اور متعدی۔۔۔ بیماریوں۔۔۔ مثلاً۔۔۔ گیلی کھانسی۔۔۔ خشک کھانسی۔۔۔ کالی کھانسی۔۔۔ تپ دق۔۔۔ دمہ۔۔۔ دن کا بخار۔۔۔ رات کا بخار۔۔۔ باری کا بخار۔۔۔ معیادی بخار۔۔۔ پورے سر کا درد۔۔۔ آدھے سر کا درد۔۔۔ ریح کا درد۔۔۔ ناف کا درد۔۔۔ دردِ شقیقہ۔۔۔ عرق النساء۔۔۔ جی مالش۔۔۔ اپھارا۔۔۔ قے۔۔۔ پیچش۔۔۔ عارضی قبض۔۔۔ دائمی قبض۔۔۔ اسہال۔۔۔ آوں۔۔۔ پیپ۔۔۔ خون آنا۔۔۔ تلّی بڑھ جانا۔۔۔ سُوکھیا۔۔۔ پیلیا۔۔۔ لقوہ۔۔۔ خنّاس۔۔۔ نکسیر۔۔۔ گل پھڑے۔۔۔ کنسوئے۔۔۔ منہ آنا۔۔۔ رال بہنا۔۔۔ گلے کے غدود۔۔۔ ہسلی اُترنا۔۔۔ بواسیر خونی۔۔۔ بواسیر بادی۔۔۔ پھوڑا۔۔۔ پھنسی۔۔۔ داد۔۔۔ دھدّر۔۔۔ چھالے۔۔۔ چنبل۔۔۔ سوزاک۔۔۔ جریان۔۔۔ احتلام۔۔۔ سرعتِ انزال۔۔۔ گنٹھیا۔۔۔ مرگی۔۔۔ مالیخولیا۔۔۔ خلجان۔۔۔ سرطان۔۔۔ وغیرہ کا علاج۔۔۔ کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں۔۔۔؟

جس تیزی سے۔۔۔ عقیدت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا تھا۔۔۔ اُسی تیزی سے شاہ صاحب مدینے والے کی۔۔۔ اُلجھن۔۔۔ اور۔۔۔ پریشانی۔۔۔ بڑھ رہی تھی۔۔۔ وہ اکثر راتوں کو جاگ کر۔۔۔ بھنڈی بازار گھرانے کے نمائندہ اُستاد چھجو خان۔۔۔ اُستاد نذیر خان۔۔۔ اور۔۔۔ اُستاد خادم حسین کے۔۔۔ پلٹے۔۔۔ اور۔۔۔ تانیں۔۔۔ کبھی دھیمی۔۔۔ کبھی بلند آواز میں گایا کرتے۔۔۔ کبھی کبھی تو۔۔۔ اُن کی آواز۔۔۔ اس قدر بلند ہوجاتی کہ۔۔۔ اہل خانہ۔۔۔ یا۔۔۔ شاہ برادرز میں سے۔۔۔ کوئی۔۔۔ شاہ صاحب مدینے والے کی خیریت۔۔۔ اور۔۔۔ ضرورت دریافت کرنے چلا آتا۔۔۔!

اُستاد چھجوں خان۔۔۔ اُستاد نذیر خان۔۔۔ اور اُستاد خادم حسین کے والد۔۔۔ اُستاد دلاور حسین اپنے وقت کے بڑے گوّیے مانے جاتے تھے۔ اُستاد دلاور حسین خان نے موسیقی کی تعلیم۔۔۔ گوالیار گھرانے کے اُستاد ہدّو خان صاحب سے حاصل کی تھی۔۔۔ اُستاد ہدّو خان کا شجرۂ نسب۔۔۔ میاں تان سین سے ملتا ہے۔۔۔ موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے سے قبل اُستاد دلاور حسین بجنور میں قیام رکھتے تھے۔۔۔ شہرت و ناموری کے بعد اُستاد کے تینوں بیٹے۔۔۔ اُستاد چھجو خان۔۔۔ اُستاد نذیر خان۔۔۔ اور۔۔۔ اُستاد خادم حسین۔۔۔ بمبئی منتقل ہو گئے۔۔۔ جہاں اُن کا مستقل قیام بھنڈی بازار میں رہا۔۔۔ تینوں اپنے ناموں کے علاوہ۔۔۔ مشترکہ نام۔۔۔ قوّالی بچے۔۔۔ کے نام سے بھی بہت شہرت حاصل کر چکے تھے۔۔۔ مگر۔۔۔ جو۔۔۔ شہرت۔۔۔ اور۔۔۔ ناموری۔۔۔ بطور بھنڈی بازار گھرانے کے۔۔۔ اُنہوں نے کمائی۔۔۔ وہ۔۔۔ دیگر اُستادان۔۔۔ اور۔۔۔ گھرانوں کے حصہ میں۔۔۔ کم کم آئی۔۔۔ یوں تو بھنڈی بازار گھرانے سے فیض اُٹھانے والوں کی تعداد۔۔۔ ہزاروں میں ہے۔۔۔ محمد رفیع۔۔۔ لتا منگیشکر۔۔۔ آشا بھوسلے۔۔۔ مہندر کپور۔۔۔ خاصی شہرت۔۔۔ اور۔۔۔ نام کمانے والوں میں۔۔۔ نمایاں مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔۔۔!

آج کل پھر سے۔۔۔ عقیدت مندوں۔۔۔ اور۔۔۔ نیاز مندوں کی تعداد بڑھنے کے سبب۔۔۔ شاہ صاحب مدینے والے کی طبیعت میں ہیجانی کیفیت نمایاں سے نمایاں تر ہورہی تھی۔۔۔ اُن کا دن زائرین کے ساتھ۔۔۔ اور۔۔۔ راتیں محفل سماع میں گزرا کرتی۔۔۔ جب بھی اُنہیں کسی محفلِ سماع کی اطلاع ملتی۔۔۔ وہ بن بلائے مہمان کے طور پر۔۔۔ مریدوں۔۔۔ اور۔۔۔ عقیدت مندوں کی ٹولی لے کر پہنچ جاتے۔۔۔ اُن دنوں عبدالرحمٰن کنج والا۔۔۔ مجیب شعلہ۔۔۔ ابراہیم اقبال۔۔۔ یوسف آزاد۔۔۔ حنیف آگرہ والے۔۔۔ بابو اور منّا شوکت علی درگاہ حسام الدین والے۔۔۔ نامور قوالوں میں شمار ہوتے تھے۔۔۔ جب جب۔۔۔ اور۔۔۔ جہاں جہاں۔۔۔ ان نامور قوالوں کی محفل برپا ہوتی۔۔۔ وہاں، وہاں۔۔۔ شاہ صاحب مدینے والے۔۔۔ پہنچ جاتے۔۔۔ کثرت سے محفل سماع میں شرکت کا شاہ صاحب مدینے والے کی شخصیت پر۔۔۔ اتنا اثر ہوا۔۔۔ کہ قوّالی سننے کے دوران۔۔۔ اکثر انہیں۔۔۔ حال۔۔۔ آنے

لگتے۔۔۔کچھ لوگ۔۔۔اسے شاہ صاحب مدینے والے کی اداکاری۔۔۔یا۔۔۔ مریدوں کورام کرنے کے لیے۔۔۔نوسربازی کانام بھی دیا کرتے۔۔۔!

حنیف آگرہ والے سے شاہ صاحب مدینے والے کی یاداللہ۔۔۔وقت گزرنے کے ساتھ۔۔۔دوستی میں تبدیل ہوگئی۔۔۔اور۔۔۔اسی دوستی کے ذریعہ ۔۔۔پران کلیئر میں۔۔۔صابر صاحب کے سالانہ عروسی کے موقع پر۔۔۔حنیف آگرہ والے کے ایک نیاز مند۔۔۔بابو بھائی سے ملاقات ہوگئی۔۔۔بقول بابو بھائی۔۔۔پران کلیئر۔۔۔کسی زمانے میں ۔۔۔رُڑکی ضلع کا ایک نامانوس گاؤں تھا۔۔۔گاؤں کے زمیندار عبدالغفار خان بڑے دل کے مالک۔۔۔ایک فیاض انسان تھے۔۔۔جوسال کے تین سوپینسٹھ دن باقاعدگی سے۔۔۔غریبوں کوتینوں وقت کھانا کھلایا کرتے۔۔۔غفار خان کی غیر موجودگی میں۔۔۔اُن کا کوئی بھانجا۔۔۔بھتیجا۔۔۔یا۔۔۔عزیز واقارب۔۔۔لنگر خانے کی نگرانی پر مامور ہوا کرتا۔۔۔ایک مرتبہ غفار خان حج کی سعادت کے لیے حجاز مدینہ گئے۔۔۔تو۔۔۔ اپنے بھانجے صابر علی کو۔۔۔یہ کہہ کر لنگر خانے کا نگران بنا گئے۔۔۔کہ۔۔۔ غریبوں کے کھانے میں کسی طرح کی کمی۔۔۔یا۔۔۔کوتاہی نہ آنے پائے۔۔۔ جس طرح میں دل کھول کر غریبوں کوتینوں وقت کا کھانا کھلاتا ہوں۔۔۔اُسی طرح تم بھی۔۔۔تینوں وقت غریبوں کو دل کھول کر کھانا کھلانا۔۔۔اُس زمانے میں ۔۔۔کس طرح کی سواری کا رواج یا انتظام و انصرام نہ تھا۔۔۔سوائے۔۔۔ ہاتھی۔۔۔گھوڑے۔۔۔خچر۔۔۔وغیرہ کے۔۔۔اہلِ ایمان۔۔۔دس بیس۔۔۔ سو پچاس۔۔۔کی ٹولیوں میں۔۔۔گروپ۔۔۔وفد۔۔۔یا۔۔۔جتھے۔۔۔بنا کر۔۔۔حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے۔۔۔حجاز مقدس روانہ ہوا کرتے۔۔۔اُن دنوں۔۔۔حجاز مقدس کا سفر۔۔۔ہفتوں۔۔۔یا۔۔۔مہینوں کے بجائے۔۔۔سال۔۔۔دوسال پر محیط ہوتا تھا۔۔۔

☆

پران کلیئر کے زمیندار غفار خان قریب ڈیڑھ سال بعد فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد گھر لوٹے۔۔۔تو۔۔۔یہ دیکھ کر اُن کا دل باغ باغ ہوگیا۔۔۔ کہ۔۔۔جس طرح وہ لنگر خانہ چھوڑ کر گئے تھے۔۔۔بالکل اُسی طرح۔۔۔ بلکہ۔۔۔اُس سے بھی اچھے طریق پر۔۔۔چل رہا ہے۔۔۔زمیندار غفار خان نے چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے اپنے بھانجے صابر علی کی بابت دریافت کیا۔۔۔تو۔۔۔سامنے لگے گولر کے درخت کی جانب۔۔۔ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لوگوں نے۔۔۔اُن کے بھانجے۔۔۔ صابر علی کی۔۔۔نشان دہی کی۔۔۔حیرت میں ڈوبے۔۔۔غفار خان۔۔۔ دھاڑے مار۔۔۔مار کر۔۔۔روتے جاتے۔۔۔اور۔۔۔بھانجے سے۔۔۔ اُس کی ناگفتہ بہ کیفیت۔۔۔کی بابت دریافت کرتے جاتے۔۔۔جواب میں بھانجے نے۔۔۔نقاہت بھرے لہجے میں صرف اتنا کہا:

''آپ نے کھلانے کے لیے کہا تھا۔۔۔کھانے کے لیے نہیں۔۔۔!''

جونہی زمیندار غفار خان۔۔۔بھانجے کو بھانہوں میں بھرنے کے لیے آگے بڑھے۔۔۔تو۔۔۔اُن کے کانوں میں غیبی صدا گونجی۔۔۔رُک جاؤ۔۔۔ غفار خان۔۔۔جسے تم اپنا بھانجا سمجھ کر۔۔۔بانہوں میں سمیٹنا چاہتے ہو۔۔۔وہ کوئی عام انسان نہیں۔۔۔ہمارا محبوب بندہ۔۔۔اور۔۔۔ولی خدا۔۔۔پیرانِ پیر کلیئر شریف ہے۔۔۔بھانجے کی جانب بڑھنے کے بجائے۔۔۔اُس کے سفرِ آخرت کی تیاری کرو۔۔۔کیونکہ۔۔۔اُس کی روح۔۔۔قصرِ عنصری سے۔۔۔ پرواز کر چکی ہے۔۔۔!

بظاہر یہ جنازہ۔۔۔ایک عام انسان صابر علی کا جنازہ تھا۔۔۔مگر۔۔۔ جس طور خلقِ خدا ٹوٹ کر۔۔۔اس جنازے میں۔۔۔شریک ہونے کے لیے۔۔۔بیتاب۔۔۔و۔۔۔بے قرار نظر آتی تھی۔۔۔اُسے دیکھ کر۔۔۔کسی کے لیے۔۔۔یہ یقین کرنا آسان نہ تھا۔۔۔کہ۔۔۔یہ کسی عام شخص کا جنازہ ہے۔۔۔شرکائے جنازہ جس عقیدت۔۔۔احترام۔۔۔اور۔۔۔لحن میں۔۔۔ ثنائے ربّی۔۔۔اور ثنائے محمد کر رہے تھے۔۔۔اُسے سن کر اہلِ ایمان کا کلیجہ باہر آنے لگا تھا۔۔۔!

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

مس خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

پیرانِ پیر صابر علی رحمتہ اللہ علیہ کے جنازے سے واپسی پر۔۔۔شاہ صاحب مدینے والے کا دل بوجھل ہوگیا تھا۔۔۔قدم۔۔۔من من بھر کے۔۔۔ ہوگئے تھے۔۔۔رقّت اس قدر۔۔۔طاری ہوگئی تھی۔۔۔کہ۔۔۔الفاظ۔۔۔ بعد میں ادا ہوتے۔۔۔آنکھوں سے۔۔۔آنسوؤں کی جھڑی پہلے لگ جاتی۔۔۔ بابو بھائی شاہ صاحب مدینے والے کے گلے میں۔۔۔بانہیں ڈال کر۔۔۔اُن کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔۔۔اس کیفیت میں۔۔۔شاہ صاحب مدینے والے نے۔۔۔ بابو بھائی کو۔۔۔اپنے ہمراہ۔۔۔میوات چلنے کی دعوت دی۔۔۔ تو۔۔۔بابو بھائی شاہ صاحب مدینے والے کی۔۔۔خواہش رد نہ کرسکے۔۔۔!

کلیئر شریف میں شاہ صاحب مدینے والے سے ملاقات کے وقت۔۔۔بابو بھائی کو شاہ صاحب مدینے والے کی حیثیت و مرتبے کا۔۔۔قطعی اندازہ نہ تھا۔۔۔وہ انہیں۔۔۔اوسط درجہ کا صوفی۔۔۔یا۔۔۔پیر سمجھ کر۔۔۔ اُن کے ہمراہ۔۔۔میوات چلے آئے تھے۔۔۔مگر۔۔۔جب بابو بھائی نے۔۔۔ شاہ صاحب مدینے والے کے دولت کدے۔۔۔بلکہ۔۔۔آستانے پر۔۔۔ لوگوں کا ہجوم۔۔۔اور۔۔۔شاہ صاحب سے اُن کی۔۔۔والہانہ۔۔۔عقیدت دیکھی۔۔۔تو۔۔۔اُن کی آنکھیں۔۔۔کھلی کی کھلی رہ گئیں۔۔۔بقول مرزا محمد رفیع سودا:

بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا
ہم نے اسے ہر خار بیابان میں دیکھا

روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا
جس نور کو تو نے سر کنعان میں دیکھا

برہم کرے جمعیت کونین جو پل میں
لٹکا وہ تری زلف پریشان میں دیکھا

واعظ تو سنے بولے ہے جس روز کی باتیں
اس روز کو ہم نے شب ہجران میں دیکھا

اے زخم جگر سودہٗ الماس سے خو کر
کتنا وہ مزا تھا جو نمک دان میں دیکھا

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

بابو بھائی کی شخصیت کے برعکس شعر پڑھنے کا انداز۔۔۔ بڑا دلنشیں۔۔۔اور۔۔۔دل گداز تھا۔۔۔کوشش کے باوجود۔۔۔شاہ صاحب مدینے والے۔۔۔جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔۔۔شاہ صاحب کی آنکھوں سے رواں آنسو۔۔۔کچھ نہ کہتے ہوئے بھی۔۔۔بہت کچھ کہہ رہے تھے۔۔۔بابو بھائی۔۔۔زمانے کے۔۔۔چشم آشنا۔۔۔سرد و گرم کی مار کھائے ہوئے۔۔۔ جہاندیدہ انسان تھے۔۔۔شاہ صاحب مدینے والے کے رقّت آمیز آنسو دیکھ کر۔۔۔بابو بھائی کے لیے۔۔۔خاموش رہنا ممکن نہیں رہا۔۔۔!

''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں شاہ صاحب۔۔۔؟''

''چھاپ تلک سب چھین لیو رے موسے نیناں ملا کے''

''کس نے۔۔۔؟''

''شاہ صاحب مدینے والے نے انگلی کے اشارے سے آسمان کی جانب اشارہ کیا۔۔۔!''

نہ کہیں سے دور ہیں منزلیں نہ کوئی قریب کی بات ہے
جسے چاہیں اس کو نواز دیں یہ درِ حبیبؐ کی بات ہے

جسے چاہا در پہ بلالیا ، جسے چاہا اپنا بنا لیا
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑے نصیب کی بات ہے

وہ خدا نہیں ، بخدا نہیں، مگر وہ خدا سے جدا نہیں
وہ ہیں کیا مگر وہ کیا نہیں یہ محبّ حبیبؐ کی بات ہے

ترے حسن سے تری شان تک ہے نگاہ و عقل کا فاصلہ
یہ ذرا بعید کا ذکر ہے وہ ذرا قریب کی بات ہے

وہ مچل کے راہ میں رہ گئی، یہ تڑپ کے در سے لپٹ گئی
وہ کسی امیر کی آہ تھی، یہ کسی غریب کی بات ہے

تجھے اے منوّر بے نوا در شاہ سے چاہیے اور کیا
جو نصیب ہو کبھی سامنا تو بڑے نصیب کی بات ہے

''بے شک۔۔۔ بے شک۔۔۔ جس تن لاگے۔۔۔ سو تن جانے۔۔۔!''

''پہیلیاں مت بجھوایئے۔۔۔ہم آپ کی طرح۔۔۔معرفت کے بندے نہیں ہیں۔۔۔''

''معرفت ۔۔۔اوں ۔۔۔ہوں۔۔۔!''(شاہ صاحب نے ، چارو ناچار، بابو بھائی کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا)

''اچھا۔۔۔تو۔۔۔یہ بات ہے۔۔۔!''(بابو بھائی نے زوردار قہقہہ فضا میں بکھیرتے ہوئے بات جاری رکھی)میں سمجھا۔۔۔کوئی بڑی بات ہے۔۔۔!''

''آپ کے خیال میں۔۔۔یہ بڑی بات نہیں۔۔۔!''

''زندگی۔۔۔اور۔۔۔موت کے علاوہ۔۔۔بابو بھائی کے پاس۔۔۔ ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔۔۔!(ہوا میں چٹکی بجاتے ہوئے) بس یوں سمجھ لیجیے۔۔۔آپ کا مسئلہ۔۔۔اب میرا۔۔۔مسئلہ ہے۔۔۔(ایک مرتبہ پھر چٹکی بجاتے ہوئے)یُوں۔۔۔حل کردوں گا۔۔۔یُوں۔۔۔!''

''الٰہ دین کا چراغ ہے۔۔۔آپ کے پاس۔۔۔؟''

''یہ ہی سمجھ لیجیے۔۔۔!''

''میرے لیے کیا حکم ہے۔۔۔؟''

''حکم۔۔۔ وکم۔۔۔ بڑے لوگ دیا کرتے ہیں۔۔۔ بوریا بستر ا لپیٹیں۔۔۔اور۔۔۔چلنے کی تیاری کریں۔۔۔!''

''چلنے کی تیاری۔۔۔کہاں۔۔۔؟''

''جہاں ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔۔۔!''

☆

شاہ صاحب مدینے والے۔۔۔اور۔۔۔بابو بھائی۔۔۔منزلِ مقصود پر پہنچ تو آسانی سے گئے۔۔۔مگر۔۔۔ایک سے زائد بار۔۔۔اطلاع بھجوانے کے باوجود۔۔۔اندر سے کوئی جواب نہ آتا تھا۔۔۔ضرورت سے زیادہ تاخیر کے بعد۔۔۔سردی کے موسم میں بابو بھائی کی پیشانی پر ننھے ننھے قطرے نمودار ہوئے۔۔۔تو۔۔۔شاہ صاحب مدینے والے کو تشویش ہوئی۔۔۔

''واللہ ہمیں آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔۔۔؟''

''ہماری طبیعت ۔۔۔ کیوں۔۔ ہماری طبیعت کو کیا ہوا۔۔۔؟ (بابو بھائی نے قدرے لاپروائی سے انجان بننے کی کوشش کی) شاہ صاحب مدینے والے نے۔۔۔کاندھے سے رومال اُٹھا کر۔۔۔بابو بھائی کے ماتھے سے پسینے کے قطرے۔۔۔صاف کرنے کی کوشش کی۔۔۔تو۔۔۔ بابو بھائی نے۔۔۔ قطعی۔۔۔لاپرواہی سے۔۔۔شاہ صاحب مدینے والے کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا:

''اماں۔۔۔آپ بھی۔۔۔کمال کرتے ہیں۔۔۔شاہ صاحب۔۔۔ یہ پریشانی کی بات ہرگز نہیں۔۔۔یہ۔۔۔تو۔۔۔نشاستے کا کمال ہے۔۔۔!''

''نشاستہ۔۔۔؟''

''جی ہاں۔۔۔نشاستہ۔۔۔گرمی ہو۔۔۔یا۔۔۔سردی۔۔۔خزاں ہو۔۔۔یا۔۔۔بہار۔۔۔صبح کے ناشتے میں۔۔۔ہم ۔۔۔چاروں مغز۔۔۔ بادام۔۔۔خشخاش۔۔۔مغز۔۔۔اور۔۔۔دودھ کے علاوہ۔۔۔قطعاً کچھ نہیں لیتے۔۔۔!''

''اس کے بعد۔۔۔ کچھ۔۔۔ لینے کی ضرورت۔۔۔ رہتی کہاں ہے۔۔۔!''

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ ۔۔۔ دست بدستہ۔۔۔ معافی کا خواستگار ہوں۔۔۔ آپ کو ناحق انتظار کی زحمت سے دوچار کیا۔۔۔!''

(گاڑھے کے لباس میں ملبوس پچاس۔۔۔پچپن کے پیٹے کے ایک صفاچٹ بزرگ، سر پر رومال، ہاتھ میں تسبیح اور پیروں میں کھڑاؤں پہنے ہوئے وارد ہوئے)۔۔۔ بابو بھائی نے۔۔۔نہایت عقیدت۔۔۔و۔۔۔احترام سے اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے۔۔۔شاہ صاحب مدینے والے کا تعارف کرانا چاہا۔۔۔صاحبِ خانہ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے۔۔۔دونوں حضرات کو۔۔۔سامنے پڑے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے۔۔۔خود ایک بوسیدہ موڑھے میں دھنس گئے۔۔۔!''

''حضرت شاہ صاحب۔۔۔بڑی تکلیف میں ہیں۔۔۔!''

''سودا جو بڑا ہوا۔۔۔!''(صاحبِ خانہ کے معنی خیز تبصرے پر، بابو بھائی اور شاہ صاحب مدینے والے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے)

''سودا۔۔۔؟''(بابو بھائی نے استفہامیہ انداز میں منہ کھولا تو صاحبِ خانہ نے مزید گرہ لگائی)

''آپ نے درست سنا۔۔۔ہم نے۔۔۔سودا ہی کہا ہے۔۔۔!''

''کیسا سودا۔۔۔ کون سا سودا۔۔۔ کچھ ۔۔۔ وض۔۔۔ وضاحت۔۔۔فرما دیجیے۔۔۔تو۔۔۔ناچیز کی۔۔۔کم فہمی۔۔۔اور۔۔۔کم علمی کی۔۔۔پردہ پوشی۔۔۔ہو جائے گی۔۔۔!''

''فیصلہ کر لیجیے۔۔۔ ہمارے خیال میں۔۔۔ تو۔۔۔ مقصود آپ کا۔۔۔پردہ کشائی ہی ہے۔۔۔!''(صاحبِ خانہ کے ذو معنی جملہ پر تخت سے اتر کر، بابو بھائی نے دوزانو ہو کر صاحبِ خانہ کے گھٹنے دباتے ہوئے)

''حضور۔۔۔ بندہ پرور۔۔۔ عالی جاہ۔۔۔ بڑی اُمید۔۔۔ بڑی آس۔۔۔ اور۔۔۔ بڑے اعتماد کے ساتھ۔۔۔ شاہ صاحب کو۔۔۔ آپ کے۔۔۔ درِ دولت پر۔۔۔ لایا ہوں۔۔۔ خالی ہاتھ نہ لوٹایئے گا۔۔۔ خدارا۔۔۔خالی ہاتھ نہ لوٹایئے گا۔۔۔!''

''اماں۔۔۔ بابو بھائی۔۔۔آپ ایک۔۔۔ سرد گرم چشیدہ۔۔۔ شخصیت کے مالک ہیں۔۔۔آپ سے بہتر۔۔۔کون جانتا ہے۔۔۔(آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہ۔۔۔میرے پروردگار سے۔۔۔بہتر۔۔۔ بڑا۔۔۔اور۔۔۔فیاض۔۔۔کوئی نہیں۔۔۔اُسی سے لَو لگایئے۔۔۔ہمیں یقین ہے۔۔۔کہ۔۔۔آپ کو مایوسی۔۔۔نہ ہوگی۔۔۔!''

''میں بہت گناہ گار۔۔۔ خطا کار۔۔۔ سیاہ کار۔۔۔ انسان

ہوں۔۔۔نہیں جانتا۔۔۔ میرے پروردگار نے۔۔۔ مجھے۔۔۔اس امتحان سے۔۔۔کیوں۔۔۔دوچار کیا۔۔۔کیوں۔۔۔دوچار کیا۔۔۔؟''

(آخری الفاظ تک پہنچتے پہنچتے۔۔۔شاہ صاحب مدینے والے کی۔۔۔ گھِگّی۔۔۔بندھ گئی)

''پروردگارِ عالم کا انتخاب کبھی غلط نہیں ہوتا۔۔۔اُس نے آپ کو۔۔۔ اس ذمہ داری کا اہل جانا۔۔۔تبھی آپ کا انتخاب کیا۔۔۔اگر آپ اپنے رب کو راضی رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔تو۔۔۔اُس کے بتلائے ہوئے راستے۔۔۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن o اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمo

پرسختی سے کاربند ہو جایئے۔۔۔!(اتنا کہہ کر صاحبِ خانہ موڑھے سے اُٹھتے ہوئے، خدا حافظ کہہ کر، زنان خانے کی طرف بڑھے، اچانک مڑکر پیچھے دیکھا اور فرمایا)

''اور ہاں۔۔۔! میوات واپسی سے قبل شملہ میں ڈاکٹر مائیکل اسٹیفن سے ملتے جایئے۔۔۔وہ۔۔۔آپ کا۔۔۔شدت سے انتظار کررہے ہیں۔۔۔''

☆

''Who is Sha Sab Among You...?''(ڈاکٹر مائیکل اسٹیفن کے سوال پر شاہ صاحب مدینے والے اور بابو بھائی ایک دوسرے کا ہونّقوں کی طرح منہ دیکھنے لگے)

''آپ دونوں میں۔۔۔شاساب۔۔۔کون اے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں ۔۔۔ شاہ صاحب ہوں۔۔۔!'' (شاہ صاحب مدینے والے کے جواب پر ڈاکٹر اسٹیفن، ہنسی ضبط کرتے ہوئے)

آپ۔۔۔ اِدر ۔۔۔ میرے پاس۔۔۔ بیٹو(اپنی کُرسی کے قریب پڑے بنچ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے)

''I Would like to brief you in short'' (ایک مرتبہ پھر شاہ صاحب مدینے والے اور بابو بھائی، ایک دوسرے کا اجنبیوں کی طرح منہ دیکھنے لگے)

''میں۔۔۔ آپ کو۔۔۔ ٹوڑے میں۔۔۔ بٹلائے گا۔۔۔ !

(سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں اور انگوٹھے کی مدد سے اشارہ کرتے ہوئے)

یہ میڈیسن جو میں آپ کو ڈیٹا۔۔۔ یہ ہومیو میڈیسن اوٹا۔۔۔اس کو Dr. Willmar Schwabe انوینٹ کرٹا۔۔۔ You no Invent ۔۔۔ بناٹا۔۔۔ بناٹا۔۔۔امارا کنٹری میں یہ میڈیسن بوٹ پاپولر ہوٹا۔۔۔ Because اس میڈیسن کا کوئی سائیڈ ایفکٹ نائی اوٹا۔۔۔اس میڈیسن کا نام Nuxvomica-30 اوٹا۔۔۔ اِدر کا لوگ۔۔۔اس کو۔۔۔امرٹ ڈارا۔۔۔ بولنا مانگٹا۔۔۔ This Medicine not a treatment just like a pain killer۔۔۔ پیشنٹ کو ٹیک کرنا نہیں مانگٹا۔۔۔ بٹ۔۔۔ اُس کو ریلیف۔۔۔آرام۔۔۔آرام۔۔۔ڈیٹا۔۔۔او۔کے۔۔۔!''

''جی صاحب۔۔۔جی۔۔۔!''(دونوں ہم آواز ہوکر)

''Look at this۔۔۔ ادھر دیکھو۔۔۔ اس میڈیسن کا فیوڈراپ۔۔۔ فیو مِن۔۔۔ ٹوڈاکٹرا۔۔۔ آئی مِن۔۔۔ ایٹ۔۔۔ ٹو۔۔۔ ٹین۔۔۔ یونو۔۔۔ایٹ۔۔۔!''(دونوں ہاتھوں کی انگلیاں دکھاتے ہوئے)

''جی صاحب۔۔۔جی۔۔۔ آٹھ۔۔۔!''(ایک مرتبہ پھر شاہ صاحب مدینے والے اور بابو بھائی نے ایک ساتھ جواب دیا)

''Thats Good۔۔۔ یہ میڈیسن میٹا ہوٹا۔۔۔جسٹ سوئیٹ ٹیبلٹ۔۔۔ میٹا گولی۔۔۔ میٹا گولی۔۔۔مالوم۔۔۔؟''

''جی صاحب۔۔۔مالوم۔۔۔!''(اس بار شاہ صاحب نے جواب دیا اور بابو بھائی نے سر ہلانے پر اکتفا کیا)

''نائٹ میں۔۔۔ایٹ ٹو ٹین۔۔۔ڈراپ۔۔۔اس بوٹل میں۔۔۔ ڈالنا مانگٹا۔۔۔(زور سے شیشی ہلاتے ہوئے) اس کو شیک کرٹا۔۔۔ Day After Tomorrow اس پاؤڈر میں فورٹو فائیو(ایک ہاتھ کے اشارے سے پانچ، دوسرے سے چار کا اشارہ کرتے ہوئے) پیشنٹ کو Three to four ڈوز ڈینا مانگٹا۔۔۔او۔کے۔۔۔Under Stand۔۔۔سمج آیا۔۔۔؟''

''آیا صاحب۔۔۔آیا۔۔۔''

''That's Good۔۔۔اَم یہ بوٹل آپ کو Free of cost ڈینا مانگٹا (شاہ صاحب مدینے والے اور بابو بھائی کے چہروں پر حیرت دیکھتے ہوئے) یونو۔۔۔گفٹ۔۔۔(دونوں نے نفی میں سر ہلایا) آئی مین ٹوفا۔۔۔! ٹوفا۔۔۔سمجھا۔۔۔؟''

''جی صاحب۔۔۔تحفہ سمجھتے۔۔۔!''

''That's Good۔۔۔ یہ آپ کا گفٹ۔۔۔ آئی مین ۔۔۔ ٹوفا۔۔۔اور۔۔۔ یہ۔۔۔ایڈریس۔۔۔ You can buy the medicine from this shop personaly or through postal mail۔۔۔او۔کے۔۔۔گڈ بائی۔۔۔سلام الے کم۔۔۔!(ہاتھ ملاتے ہوئے)

''It was nice meeting you۔۔۔!''

☆

ایٹہ۔۔۔ اور۔۔۔شملہ۔۔۔ کے سفر کے بعد شاہ صاحب مدینے والے کی شخصیت۔۔۔ سبھاؤ۔۔۔ اور معمولات۔۔۔ یکسر تبدیل ہو گئے تھے۔۔۔عاجزی۔۔۔انکساری۔۔۔درگذر۔۔۔اُن کی شخصیت۔۔۔کا۔۔۔ لازمہ بن چکے تھے۔۔۔نیند۔۔۔اور۔۔۔خوراک بھی۔۔۔برائے نام۔۔۔رہ گئی تھی۔۔۔راتوں کو جاگ کر۔۔۔خدا کے حضور۔۔۔گڑگڑانا۔۔۔اور۔۔۔ گریہ وزاری کرنا۔۔۔اہلِ خانہ کے لیے۔۔۔حیرت کا باعث تھا۔۔۔!

شاہ صاحب نے واپسی پر۔۔۔ پہلا فرمان یہ۔۔۔ جاری کیا۔۔۔

کہ۔۔۔اُن کے نام کے ساتھ۔۔۔مدینے کا۔۔۔لاحقہ نہ لگایا جائے۔۔۔اس کے علاوہ ۔۔۔ مریدین ۔۔۔ اور معتقدین کو۔۔۔ شاہ صاحب کے ہاتھ چومنا۔۔۔سجدے۔۔۔یا۔۔۔شاہ صاحب کے روبرو۔۔۔رکوع۔۔۔کا زاویہ بنانا۔۔۔قطعی طور پر ممنوع۔۔۔قرار دے دیا گیا۔۔۔!

اب شاہ صاحب کا بیشتر وقت تنہائی میں گزرتا۔۔۔شملہ۔۔۔اور۔۔۔ایبٹ کے سفر کے بعد۔۔۔مطالعہ بھی۔۔۔شاہ صاب کے۔۔۔روزمرہ میں۔۔۔شامل ہو چکا تھا۔۔۔چُن، چُن کر۔۔۔ڈھونڈ، ڈھونڈ کر۔۔۔شاہ صاحب۔۔۔عالم۔۔۔ فاضل۔۔۔ اور ۔۔۔ ماہرین سے۔۔۔ ملنے کی خواہش کا اظہار کرتے۔۔۔ اور ۔۔۔گھنٹوں۔۔۔ ملاقات۔۔۔ گفتگو۔۔۔کبھی بحث و مباحثہ۔۔۔ بھی ۔۔۔ دیکھنے کو ملتا۔۔۔ ایک واضح۔۔۔ اور۔۔۔ نمایاں تبدیلی۔۔۔شاہ صاحب ۔۔۔کی۔۔۔طبیعت کا ٹھہراؤ۔۔۔اور۔۔۔ بولنے سے زیادہ سننے۔۔۔ بلکہ۔۔۔سمجھنے۔۔۔و۔۔۔غور و فکر۔۔۔کرنے کی عادت تھی۔۔۔جس کا مظاہرہ کچھ دنوں بعد۔۔۔وسیع النظر۔۔۔وسیع الدماغ۔۔۔اور۔۔۔وسیع الرائے۔۔۔احباب کے اجتماع کی صورت۔۔۔نمایاں ہونے لگا۔۔۔جس میں۔۔۔شاہ صاحب کے صاحبزادگان۔۔۔عزیز و اقارب۔۔۔دوست احباب کے علاوہ۔۔۔بہت سے نئے چہرے بھی نمایاں تھے۔۔۔!

گھنٹوں کی گفتگو۔۔۔ بحث و تمحیص ۔۔۔ اور۔۔۔ مغز پچی کے بعد۔۔۔شاہ صاحب نے۔۔۔آئندہ کے لائحہ عمل کا اعلان کیا۔۔۔جس کے نمایاں نکات درج ذیل تھے:

۱۔ ایمان و ایقان

۲۔ ارکانِ اسلام کی سختی سے پابندی

۳۔ طہارت و پاکیزگی کا شعار

۴۔ خواتین، بزرگ اور بچوں کا احترام

۵۔ تعلیم کا فروغ

۶۔ صاف پانی کا حصول

۷۔ قرب و جوار اور دور دراز سے آنے والے عقیدت مندوں کے آرام و انصرام کا مناسب بندوبست و انتظام

۸۔ روزانہ کے معمولات میں منتظم اور زائرین کے نظم و ضبط کے قواعد

۹۔ ہر طرح کی غیر شرعی حرکات و سکنات اور عمل سے پرہیز

۱۰۔ آستانہ عالیہ پر رضا کارانہ عطیات کے علاوہ ہر قسم کے لین دین پر پابندی وغیرہ۔

متذکرہ بالا نکات پر۔۔۔شرکائے محفل کا کُلّی اتفاق تھا۔۔۔مگر۔۔۔چند ایک باتوں پر۔۔۔ کچھ اصحاب۔۔۔ بالخصوص۔۔۔ شاہ صاحب کے فرزندان۔۔۔کو۔۔۔جُز بُز۔۔۔ہوتے۔۔۔ناک۔۔۔بھوں چڑھاتے۔۔۔دیکھا گیا۔۔۔کسی کی پسند۔۔۔اور۔۔۔ناپسند کو۔۔۔خاطر میں۔۔۔نہ لاتے ہوئے۔۔۔ شاہ صاحب نے۔۔۔ مستری محمد رمضان سے۔۔۔ ہاتھ کے اشارے کے ساتھ۔۔۔کچھ دریافت کیا۔۔۔تو۔۔۔مستری رمضان نے۔۔۔جیب سے۔۔۔چند مڑے تُڑے کاغذ نکال کر۔۔۔شاہ صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے۔۔۔دونوں ہاتھوں کی مدد سے۔۔۔کاغذوں کی شکنیں درست کرنا شروع کیں۔۔۔ شاہ صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے۔۔۔ کاغذات کو بغور دیکھنے کے بعد۔۔۔ اُوں، ہوں۔۔۔ کرتے ہوئے۔۔۔ مستری رمضان کی جانب دیکھ کر کہا:

''بات بنی نہیں۔۔۔!''

''میں سمجھا نہیں۔۔۔؟'' (مستری رمضان نے، ادب و احترام سے شاہ صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا)

''میرا خیال تھا۔۔۔ کہ۔۔۔ میری تجاویز۔۔۔ اور ۔۔۔ اندازوں کو۔۔۔آپ۔۔۔ماہرانہ انداز میں۔۔۔بیان کریں گے۔۔۔!''

''جس طرح آپ فرمائیں گے۔۔۔ بالکل ۔۔۔ اُسی طرح ہو گا۔۔۔!''

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

''میرے خیال میں (کاغذ لپیٹتے ہوئے) نئے سرے سے۔۔۔ بڑی انتظار گاہ۔۔۔ بڑے مہمان خانے۔۔۔وضو خانے۔۔۔اور مسجد بھی۔۔۔اس سے۔۔۔دو۔۔۔بلکہ۔۔۔تین گنا۔۔۔بڑی ہونی چاہیے۔۔۔!''

''اُس کے لیے ۔۔۔ تو۔۔۔ وسائل۔۔۔ اور۔۔۔ زمین بھی۔۔۔بہت درکار ہو گی (مستری رمضان نے فکرمندی سے اپنی رائے کا اظہار کیا)

''جس نے یہاں تک پہنچایا ہے۔۔۔آگے کی سبیل بھی۔۔۔وہی پیدا کرے گا۔۔۔!''

''شاہ صاحب کے دوٹوک انداز اور اظہار پر شرکائے محفل نے۔۔۔کسی طرح کے تحفظات کا اظہار کیے بغیر ہاں میں ہاں ملائی۔۔۔مگر تینوں صاحبزادگان آنکھوں، آنکھوں میں ۔۔۔ایک دوسرے کو۔۔۔سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے۔۔۔اختلاف رائے کے خواہش مند دکھائی دیتے تھے۔۔۔تینوں بیٹوں، زوار شاہ، جبار شاہ اور دلاور شاہ کے چہروں کو پڑھتے ہوئے۔۔۔شاہ صاحب نے۔۔۔خندہ پیشانی سے بیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے۔۔۔اظہار رائے کی دعوت دی۔۔۔تھوڑے تردّد۔۔۔تھوڑی جھجک کے بعد۔۔۔زوار شاہ نے بھی۔۔۔وسائل کی بابت۔۔۔تشویش کا اظہار کیا۔۔۔تو۔۔۔شاہ صاحب نپے تلے لہجے میں گویا ہوئے:

ویسے تو۔۔۔کوئی کام۔۔۔اللہ کی۔۔۔مرضی۔۔۔و۔۔۔منشا کے بغیر نہیں ہوتا۔۔۔ انسان کے ارادوں۔۔۔ مرادوں۔۔۔ اور ۔۔۔ خواہشات۔۔۔حتیٰ کہ۔۔۔ضروریات بھی۔۔۔ اللہ کے حکم کے تابع۔۔۔

اور۔۔۔ اُس کی منظوری کے بغیر۔۔۔ بار آور نہیں ہوتیں۔۔۔ اللہ کی مخلوق کا۔۔۔ جوق۔۔۔ در جوق۔۔۔ اُمڈ آنا۔۔۔ ناچیز کو تمناؤں کا مرکز بنالینا۔۔۔ سب۔۔۔ اُسی کی رضا۔۔۔ اُسی کی منشا۔۔۔ اُسی کی ہدایت کے مطابق ہے۔۔۔ ایٹہ اور شملہ جانے سے پہلے۔۔۔ اور۔۔۔ آنے کے بعد۔۔۔ جس برق رفتاری سے معتقدین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔۔۔ یہ بھی۔۔۔ اُسی کی عطا ہے (آسمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں۔۔۔ یہ تعویذ۔۔۔ گنڈے۔۔۔ یہ دم۔۔۔ درود۔۔۔ یا۔۔۔ دوائی کے چند قطرے۔۔۔ لوگوں کو۔۔۔ شفایاب کر رہے ہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ ایسا سوچنا بھی۔۔۔ گناہ۔۔۔ بلکہ۔۔۔ شرک ہے۔۔۔ خدائے ذوالجلال کو۔۔۔ میوات کے لوگوں پر رحم آیا۔۔۔ اور۔۔۔ اُس نے۔۔۔ ایک گناہ گار۔۔۔ سیاہ کار۔۔۔ بے علم۔۔۔ و۔۔۔ بے عمل۔۔۔ شخص کو۔۔۔ اس کا ذریعہ بنادیا۔۔۔

رو سیاہی جرم سے ہے بیشتر
رو سفیدوں میں خجل مجھ کو نہ کر
ایک کیا آنکھیں ہیں میری ہی ادھر
تجھ سے راضی بے بصر اہل نظر

☆

چہ مے گوئیاں۔۔۔ کھُسر پھُسر۔۔۔ آر۔۔۔ جار۔۔۔ ہلچل۔۔۔ اور۔۔۔ بھاگ دوڑ۔۔۔ کل شام سے ہی۔۔۔ ڈھینگر۔۔۔ بٹول۔۔۔ ساول۔۔۔ پتنگہ۔۔۔ اور۔۔۔ بجرنگ میں۔۔۔ دیکھی جا رہی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ جونہی کل رات۔۔۔ کی گئی۔۔۔ چُونے کی مارکنگ کے مطابق۔۔۔ مزدوروں نے کھدائی کی غرض سے۔۔۔ اپنی کدالیں۔۔۔ اور۔۔۔ پھاوڑے نکالے۔۔۔ ایک، ایک۔۔۔ دو، دو۔۔۔ تین۔۔۔ اور۔۔۔ چار چار کی شکل میں اہلِ علاقہ۔۔۔ جمع ہونا شروع ہو گئے۔۔۔ پہلے، پہل۔۔۔ شاہ برادران۔۔۔ خلیفان۔۔۔ معتقدین۔۔۔ مریدین نے۔۔۔ لوگوں کو تماشائی جان کر توجہ نہ دی۔۔۔ جیسے ہی۔۔۔ کام شروع کرنے کی غرض سے ان لوگوں کو۔۔۔ پیچھے ہٹنے کی ہدایت کی گئی۔۔۔ ویسے ہی یہ لوگ۔۔۔ شہد کی مکھیوں کی طرح بھن، بھن کرتے ہوئے۔۔۔ چھتے کی صورت جمع ہو گئے۔۔۔ مجمع کا موڈ۔۔۔ مزاج۔۔۔ اور۔۔۔ تیور۔۔۔ دیکھ کر۔۔۔ مستری رمضان نے۔۔۔ شاہ صاحب مدینے والے کو بلانے کا مشورہ دیا۔۔۔ مگر۔۔۔ زوار شاہ۔۔۔ جبار شاہ۔۔۔ اور۔۔۔ دلاور شاہ۔۔۔ نے۔۔۔ مستری رمضان کے مشورے کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے۔۔۔ مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے۔۔۔ زور کی للکار لگائی۔۔۔!

''اوس چاٹن سُو، پیس نا بجھے۔۔۔!''

''تھنو چنڑو، باجے گھنڑو۔۔۔!'' (مجمع کی جانب سے، ہتک آمیز جواب سن کر، شاہ برادران آپ سے باہر ہو گئے)

''ہو یارُخ کیکر تو آم کہان سُو ہووے۔۔۔!''

''پانڑی رکھنی، مگر مچھ سُو یَر نہ ہووے۔۔۔'' (مجمع کے ترکی بہ ترکی جواب نے جلتی پر تیل کا کام کیا، ٹھاہ ٹھاہ کی آواز میں، دونوں جانب سے لٹھ نکل آئے)

شاہ برادران کا خیال تھا کہ ڈھینگر۔۔۔ بٹول۔۔۔ پتنگہ۔ ساول۔۔۔ اور۔۔۔ بجرنگ کے چند سر پھرے۔۔۔ نوجوانوں کو۔۔۔ منٹوں میں مار بھگائیں گے۔۔۔ مگر۔۔۔ شاہ برادران کے اندازے اُس وقت غلط ثابت ہو گئے۔۔۔ جب لٹھ بازی میں۔۔۔ ڈھینگر۔۔۔ بٹول۔۔۔ پتنگہ۔۔۔ ساول۔۔۔ اور۔۔۔ بجرنگ کے نوجوانوں کے ساتھ۔۔۔ نگینہ کھنڈ گاؤں۔۔۔ گھاکس۔۔۔ کنالی۔۔۔ سیل۔۔۔ نگینہ۔۔۔ ماڑی کھیڑا۔۔۔ کے نوجوانوں نے۔۔۔ بٹوٹ۔۔۔ کے وہ ہاتھ دکھائے۔۔۔ کہ۔۔۔ شاہ برداران کے ساتھ۔۔۔ اُن کے حالی موالی بھی۔۔۔ میدانِ جنگ سے ایسے چمپت ہوئے۔۔۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔۔۔!

☆

۱۹۵۷ء کی جنگ آزادی میں میرٹھ کے بعد سب سے زیادہ قربانی میوات کے لوگوں نے دی تھی۔۔۔ زیادہ جوش۔۔۔ اور۔۔۔ جذبہ۔۔۔ میوات کے۔۔۔ نگینہ کھنڈ کے لوگوں میں پایا جاتا تھا۔۔۔ باوجود اس کے۔۔۔ گھر کے بھیدیوں نے۔۔۔ انگریزوں سے مخبری کر دی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ ماڑی کھیڑا۔۔۔ فیروز پور۔۔۔ جھرکا۔۔۔ سرولی۔۔۔ بساوٹ۔۔۔ کیول کھانا۔۔۔ و۔۔۔ نگینہ۔۔۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ نہیں۔۔۔ دس بیس۔۔۔ بھی نہیں۔۔۔ بلکہ۔۔۔ دس ہزار سے زیادہ لوگوں نے۔۔۔ جام شہادت نوش کیا۔۔۔ اس حوالے سے چوہدری سہراب کی جرأت و بہادری میوات کی تاریخ میں سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔ قریب۔۔۔ سینکڑوں گرفتار ہوئے۔۔۔ جن میں سے بیشتر کو۔۔۔ کالا پانی کی سزا ہوئی۔۔۔ اور۔۔۔ بہت سوں کو۔۔۔ پھانسی پر لٹکایا گیا۔۔۔!

کالا پانی۔۔۔ انڈیا سے۔۔۔ مشرقی ایشیا کی شارع۔۔۔ جزیرہ انڈیمان۔۔۔ اور نکوبار کی سرحد پر واقع ہے۔۔۔ ساتویں صدی عیسوی میں۔۔۔ بدھ بھکشو۔۔۔ آٹھویں۔۔۔ اور۔۔۔ نویں صدی عیسوی میں۔۔۔ عرب تاجر۔۔۔ تیرہویں صدی عیسوی میں۔۔۔ مارکوپولو۔۔۔ اس جزیرے کی نشاندہی کر چکے ہیں۔۔۔

جزیرہ انڈیمان کا نام۔۔۔ مونگی۔۔۔ ہندو عقیدہ کے مطابق۔۔۔ ہنومان جی۔۔۔ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔۔۔ پہلے برطانوی سروے کے مطابق۔۔۔ ۱۷۸۹ء میں حکومت برطانیہ نے اس جزیرے کی تلاش اس غرض سے کی۔۔۔ کہ۔۔۔ یہاں برطانوی حکومت کے خلاف۔۔۔ کام کرنے والے خطرناک مجرموں کو قید رکھا جائے۔۔۔ ۱۷۹۰ میں اس جزیرے کو۔۔۔ باقاعدہ۔۔۔ کالونی کی شکل دے دی گئی۔۔۔ مگر۔۔۔ زیادہ عرصہ اس کی یہ حیثیت

برقرار نہ رہ سکی۔۔۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو کچلنے کے بعد۔۔۔۱۸۵۸ء میں۔۔۔ پورٹ بلیئر کے مقام پر۔۔۔ایک اور کالونی کا قیام۔۔۔اس غرض سے عمل میں لایا گیا۔۔۔ جہاں ۱۸۵۷ء کے مجرموں کو قید رکھا جا سکے۔۔۔!

جُوں جُوں۔۔۔ خطرناک ملزم گرفتار ہوتے گئے۔۔۔ وُوں وُوں۔۔۔ اُن مجرموں کو پورٹ بلیئر کے قید خانے میں منتقل کیا جانے لگا۔۔۔اس صورتِ حال میں۔۔۔ بغیر کسی منظم ادارے۔۔۔اور۔۔۔ انتظام۔۔۔ خطرناک مجرموں کو۔۔۔ سنبھالنا دشوار سے۔۔۔ دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ لہٰذا حکومت برطانیہ نے۔۔۔ اس وقت کے وائسرائے۔۔۔ لارڈ میئو کو۔۔۔ نکو بار۔۔۔ اور۔۔۔ پورٹ بلیئر کے قید خانوں کا معائنہ کر کے۔۔۔ باقاعدہ جیل کی تعمیر کا منصوبہ بنانے۔۔۔ اور۔۔۔ حکومت برطانیہ کو پیش کرنے کی ہدایت کی۔۔۔!

۸۔فروری ۱۸۷۲ء کو چوتھے وائسرائے آف انڈیا لارڈ میئو۔۔۔ پورٹ بلیئر قید خانے کے سرکاری دورے پر گئے۔۔۔ دورہ کے اختتام پر۔۔۔ لارڈ میئو نے۔۔۔ اپنی ڈائری میں۔۔۔ پورٹ بلیئر قید خانے کی بابت تمام معلومات۔۔۔ اور۔۔۔ ضروری تجاویز کے نکات درج کرنے کے بعد۔۔۔ قید خانے کے حکّام کو ضروری ہدایت دیتے ہوئے۔۔۔ عجلت میں کچھ نکات۔۔۔ اور۔۔ تجاویز سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔ کوشش اس لیے۔۔۔ کہ۔۔۔ شام سات بجے کا وقت ہو چکا تھا۔۔۔ جبکہ لارڈ میئو۔۔۔ مسز میئو سے۔۔۔ چھ بجے واپسی کا وعدہ کر کے آئے تھے جو جہاز پر جانے کے لیے کشتی میں لارڈ میئو کی منتظر تھی۔۔۔ لارڈ میئو کی ہدایت کے دوران۔۔۔ ہرکارہ۔۔۔ بار، بار۔۔۔ مسز میئو کی جانب سے یاد دہانی کا پیغام لا رہا تھا۔۔۔ ہر پیغام کے بعد۔۔۔ لارڈ میئو جسٹ اے منٹ۔۔۔ کہہ کر۔۔۔ اپنی بات مکمل کرنے کی کوشش کرتے۔۔۔ اتنے میں۔۔۔ اچانک۔۔۔ ایک قیدی۔۔۔ تیزی سے۔۔۔ وائسرائے۔۔۔ لارڈ میئو کی جانب لپکا۔۔۔ اور۔۔۔ تیز دھار اُسترا نکال کر۔۔۔ لارڈ میئو کے پیٹ میں بھونک دیا۔۔۔ جیل کا عملہ۔۔۔ اور۔۔۔ تمام قیدی۔۔۔ اچانک حملے پر۔۔۔ بھونچکاں۔۔۔ رہ گئے۔۔۔ مگر۔۔۔ عملے کی مستعدی۔۔۔ اور۔۔۔ ڈاکٹروں کی مہارت کسی کام نہ آ سکی۔۔۔ وائسرائے ہند۔۔۔ لارڈ میئو۔۔۔ موقع پر ہی جان بحق ہو چکے تھے۔۔۔ جس کے احترام میں۔۔۔ جیل کے افسران۔۔۔ اور۔۔۔ سرکاری عملے نے۔۔۔ ٹوپیاں اُتار کر۔۔۔ ہاتھوں میں تھام لیں۔۔۔ اور۔۔۔ لارڈ میئو کے سوگ میں۔۔۔ سر جھکا کر سوگواری کا اظہار کرنے لگے۔۔۔ پانی کے جس جہاز میں لارڈ میئو کا قیام تھا۔۔۔ رات گئے۔۔۔ جہاز پر لگے۔۔۔ یونین جیک کو۔۔۔ لارڈ میئو کی موت کے باعث سرنگوں۔۔۔ کر دیا گیا۔۔۔!

☆

۱۸۶۰ء میں خیبر ایجنسی کے شیر علی آفریدی نے پنجاب پولیس میں ملازمت اختیار کی۔۔۔ اُس کا تعلق تراہ ویلی سے تھا۔۔۔ ملازمت کے ابتدائی دنوں میں شیر علی آفریدی پشاور کمشنر آفس میں۔۔۔ خدمات انجام دینے لگا۔۔۔ اس کے بعد برطانوی فوج کی کیولری رجمنٹ انبالہ میں تعینات کر دیا گیا۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔ اس کا تبادلہ روہیل کھنڈ۔۔۔ اور۔۔۔ اودھ کر دیا گیا۔۔۔ جہاں۔۔۔ شیر علی آفریدی نے۔۔۔ میجر ہگ جیمز کے ساتھ خدمات انجام دیں۔۔۔!

شیر علی آفریدی۔۔۔ ایک ذمہ دار۔۔۔ متحرک۔۔۔ اہلکار ہونے کے ساتھ۔۔۔ برطانوی حکومت کا وفادار ملازم تھا۔۔۔ شیر علی آفریدی نے۔۔۔ پشاور میں۔۔۔ کمشنر رائیل ٹیلر۔۔۔ کے اردلی کے طور پر بھی نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔۔۔ کمشنر رائیل ٹیلر نے۔۔۔ شیر علی کی خدمات سے خوش ہو کر۔۔۔ ایک گھوڑا۔۔۔ پستول۔۔۔ اور۔۔۔ سندِ اعتراف۔۔۔ بطور انعام۔۔۔ شیر علی کو دی تھی۔۔۔ شیر علی کا شمار۔۔۔ برطانوی فوج کے اُن وفادار ملازمین میں ہوتا تھا۔۔۔ جو۔۔۔ اپنے افسران۔۔۔ اور۔۔۔ اُن کے اہلِ خانہ کے ساتھ۔۔۔ خاندان کے فرد کی طرح رہا کرتے تھے۔۔۔!

ایک دن شیر علی آفریدی نے اپنے چچیرے بھائی۔۔۔ حیدر علی کو۔۔۔ دن دہاڑے۔۔۔ خاندانی تنازع پر۔۔۔ پشاور کے بھرے بازار میں قتل کر دیا۔۔۔ شیر علی کے اعترافِ جرم کے سبب۔۔۔ عدالت نے۔۔۔ ۲۔اپریل ۱۹۶۷ء کو شیر علی آفریدی کو سزائے موت سنائی۔۔۔ جس کے خلاف۔۔۔ شیر علی آفریدی نے سیشن کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔۔۔ سیشن کورٹ کے جج کرنل پولوک نے۔۔۔ شیر علی کی سزائے موت کو۔۔۔ عمر قید میں تبدیل کر کے۔۔۔ شیر علی آفریدی کو۔۔۔ کالا پانی منتقل کرنے کی ہدایت جاری کی۔۔۔ شیر علی نے کالا پانی کی سزا کے خلاف بہت کوشش کی۔۔۔ مگر۔۔۔ اُس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔۔۔ البتہ۔۔۔ شیر علی کی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔۔۔ عمر قید بامشقت کے بجائے۔۔۔ بطور حجام قید گزارنے کا حکم دیا گیا۔۔۔!

شیر علی آفریدی اپنے آقاؤں کی اس بے مروتی کو فراموش نہ کر سکا۔۔۔ اور۔۔۔ اُس نے۔۔۔ اپنے دل، دماغ میں جلنے والی آگ کے علاوہ۔۔۔ بے گناہ لوگوں پر ہونے والے۔۔۔ ظلم وستم کا۔۔۔ نہ صرف بدلہ لے لیا۔۔۔ بلکہ۔۔۔ دنیا پر آشکار بھی کر دیا کہ انگریز سرکار کس قدر ظالم و جابر ہے۔۔۔!

قتل کے بعد۔۔۔ اہلکاروں نے۔۔۔ شیر علی آفریدی سے دریافت کیا:

''تم نے۔۔۔ ایسا کیوں کیا۔۔۔ شیر علی۔۔۔؟'' (شیر علی نے انتہائی پرسکون لہجے میں کہا)

''اللہ کا حکم تھا۔۔۔!''

''اور کون۔۔۔ کون۔۔۔ اس واقعہ میں۔۔۔ تمہارے ساتھ شامل ہے۔۔۔؟'' (شیر علی نے اس بار بھی اعتماد سے بھرپور لہجے میں جواب دیا)

''وحدہٗ لاشریک لہ''

''گیارہ ماہ تک شیر علی آفریدی پر۔۔۔ وائسرائے ہند۔۔۔ لارڈ میو کے قتل کا مقدمہ چلنے کے بعد۔۔۔ گیارہ مارچ ۱۸۷۳ء کو۔۔۔ ور پر آئی لینڈ جیل میں۔۔۔ شیر علی آفریدی کو۔۔۔ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔۔۔ پانچ فٹ دس انچ کے لحیم شحیم۔۔۔ شیر علی کے اس دلیرانہ عمل سے برطانوی حکومت کی بنیادیں ہل گئیں۔۔۔ تاج برطانیہ کی جانب سے۔۔۔ کئی قوانین میں تبدیلی کے ساتھ۔۔۔ قیدیوں کی کڑی نگرانی۔۔۔ اور۔۔۔ تشدد میں اضافے کے ساتھ جلد از جلد۔۔۔ کالا پانی جیل کی تعمیر کا حکم جاری کیا گیا۔۔۔!

☆

کالا پانی جیل کی تعمیر ۱۸۹۶ء میں شروع ہوئی۔۔۔ ۱۹۰۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔۔۔ حفاظتی اقدامات کے پیش نظر۔۔۔ برما سے۔۔۔ سیمنٹ۔۔۔ لوہا۔۔۔ اور۔۔۔ چونے سے بنی اینٹیں منگوائی گئیں۔۔۔ اور۔۔۔ دیگر جیلوں کی نسبت۔۔۔ کالا پانی کی جیل میں۔۔۔ لوہا۔۔۔ اور لوہے کی تاروں کا استعمال بھی ضرورت سے زیادہ کیا گیا۔۔۔!

پورٹ بلیئر۔۔۔ بس اسٹینڈ سے ایک عشاریہ پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر۔۔۔ وسیع قطعہ ارضی۔۔۔ کالا پانی جیل کی تعمیر کے لیے تلاش کر کے۔۔۔ اُس کے بیچ و بیچ۔۔۔ نہایت وسیع و عریض۔۔۔ گول دائرہ کھینچا گیا۔۔۔ گول دائرے کے چاروں جانب۔۔۔ پھول کی شکل میں۔۔۔ سات خندقیں۔۔۔ کھود دی گئی۔۔۔ اور۔۔۔ اُن خندقوں سے۔۔۔ کالا پانی جیل کے۔۔۔ سات بلاکوں کی۔۔۔ بنیادیں۔۔۔ اُٹھائی گئی۔۔۔ ہر تین منزلہ بلاک کی۔۔۔ ایک منزل پر۔۔۔ ساڑھے تیرہ فٹ اونچے۔۔۔ سات فٹ لمبے۔۔۔ اور۔۔۔ پانچ فٹ چوڑے۔۔۔ لگ بھگ۔۔۔ سات سو کمروں کی تعمیر۔۔۔ کچھ اس طرح کی گئی۔۔۔ کہ۔۔۔ ہر کمرے کے۔۔۔ روشن دان۔۔۔ اور۔۔۔ کھڑکیاں۔۔۔ مخالف سمت کھلتی تھیں۔۔۔ تاکہ۔۔۔ کوئی قیدی۔۔۔ دوسرے قیدی سے۔۔۔ روبرو نہ ہو سکے۔۔۔

ان تنگ و تاریک کمروں کے ایک کونے میں کھانے پینے کا سامان رکھا جاتا۔۔۔ دوسرے کونے میں رفع حاجات کے مخصوص برتن رکھنا ہوتے۔۔۔ جنہیں۔۔۔ روز صبح۔۔۔ ہر قیدی کو۔۔۔ خود صاف کرنا ہوتا۔۔۔ ایک اہم۔۔۔ اور۔۔۔ تکلیف دہ۔۔۔ بات۔۔۔ جیل کے کمروں میں روشنی کا انتظام قطعی نہیں تھا۔۔۔ خدا معلوم۔۔۔ تعمیری نقص تھا۔۔۔ یا۔۔۔ جان بوجھ کر۔۔۔ چھتوں کی تعمیر اس قدر ناقص رکھی گئی۔۔۔ کہ۔۔۔ بارش کے دوران ان کال کوٹھریوں کی چھتوں سے۔۔۔ مسلسل پانی ٹپکتا۔۔۔ ان تمام۔۔۔ غیر انسانی اقدامات کے سبب۔۔۔ بے شمار قیدی۔۔۔ ملیریا۔۔۔ بخار۔۔۔ تپ دق۔۔۔ اور۔۔۔ پیچش کے باعث۔۔۔ موت کا شکار ہو جاتے۔

حکومت برطانیہ نے جیل کی رکھوالی کے لیے۔۔۔ اندازاً۔۔۔ ایک سو کے لگ بھگ۔۔۔ چاق و چوبند۔۔۔ اور مستعد اہلکار۔۔۔ ہندوستان کے کونے کونے سے منتخب کر کے لائے گئے۔۔۔ چوبیس گھنٹوں کی۔۔۔ تین شفٹ میں اکیس اہلکار۔۔۔ ایک وقت میں۔۔۔ قیدیوں کی نگرانی پر مامور ہوتے۔۔۔ اس طرح۔۔۔ قیدیوں کی نگرانی۔۔۔ پر کُل تریسٹھ اہلکار تعینات کیے جاتے۔۔۔ دیگر اہلکار۔۔۔ انتظامی امور۔۔۔ اور۔۔۔ راشن کی تقسیم۔۔۔ صحت۔۔۔ صفائی اور قیدیوں سے مشقت لینے کی ذمہ داریاں انجام دینے پر مامور تھے۔۔۔!

کالا پانی جیل میں قیدیوں کا پہلا دستہ ان افراد پر مشتمل تھا:

۱۔	بریندر کمار گھوش	(عمر قید)
۲۔	اولاسکر دت	//
۳۔	اوپندر ناتھ بنرجی	//
۴۔	ہیم چندر داس	//
۵۔	اندو بھوش رائے	(دس سال قید با مشقت)
۶۔	وِبھوتی بھوشن سارکر	//
۷۔	ہریشی کیش کانجی لال	//
۸۔	سدھیر کمار سارکر	//
۹۔	ابھیناش چندر	//

کالا پانی کی تاریخ میں۔۔۔ سکوائش مین۔۔۔ ڈیوڈ بیری۔۔۔ ۱۹۰۹ء۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۹۳۱ء۔۔۔ انتہائی۔۔۔ ظالم۔۔۔ و۔۔۔ جابر۔۔۔ جیلر کے طور پر جانا جاتا ہے۔۔۔ نئے آنے والے قیدیوں کا استقبال۔۔۔ یہ کہہ کر کرتا۔۔۔ اس قید خانے کی چار دیواری میں۔۔۔ تمہارا۔۔۔ خدا میں ہوں۔۔۔ تمہارا۔۔۔ جینا۔۔۔ مرنا۔۔۔ سونا۔۔۔ جاگنا۔۔۔ کھانا۔۔۔ پینا۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ میرے اختیار میں ہے۔۔۔ ڈیوڈ بیری کے آنے کے بعد۔۔۔ قید خانے کے احاطے میں۔۔۔ تیل نکالنے کا کولہو لگوایا گیا۔۔۔ جس میں۔۔۔ بیلوں کی جگہ۔۔۔ قیدیوں کو جوتا جاتا۔۔۔ اور جب کوئی قیدی۔۔۔ بھوک۔۔۔ پیاس۔۔۔ یا۔۔۔ تکلیف کے باعث۔۔۔ کراہتا۔۔۔ تو۔۔۔ ڈیوڈ بیری۔۔۔ خوشی سے تالیاں بجاتا۔۔۔ کبھی۔۔۔ کبھی۔۔۔ ناچنے بھی لگتا۔۔۔!

کالا پانی جیل کے قیدیوں کو۔۔۔ روزانہ کی بنیاد پر۔۔۔ فی قیدی:

۱۔ چھ اونس چاول
۲۔ چھ اونس آٹا
۳۔ دو اونس دال
۴۔ ایک تولہ نمک
۵۔ تین بٹہ چار اونس کھانے کا تیل
۶۔ آٹھ اونس سبزی
۷۔ دو کپ پینے کا پانی

خام صورت میں دیا جاتا۔۔۔ کھانا پکاتے وقت اُس میں نمک ملانے کی ممانعت تھی۔۔۔ اُبلے ہوئے کھانے پر۔۔۔ اوپر سے نمک چھڑک کر۔۔۔

کھانے کی اجازت تھی۔۔۔مشقت کے دوران قیدیوں کو پانی کی طلب ہوتی۔۔۔تو۔۔۔بڑی منّت۔۔۔سماجت۔۔۔بلکہ۔۔۔ذلّت کے بعد۔۔۔ تیسرا کپ پانی اس وارننگ کے ساتھ دیا جاتا۔۔۔کہ۔۔۔اس کے بعد پانی مانگا۔۔۔تو سخت سزا دی جائے گی۔۔۔!

کالا پانی جیل میں۔۔۔روزانہ کی بنیاد پر قیدیوں سے مختلف اقسام کی مشقت لی جاتی۔۔۔!

۱۔ بانس چھیلنا اور اُس کا فرنیچر بنانا
۲۔ ناریل چھیلنا اور اُس سے ضرورت کی اشیا بنانا
۳۔ سرسوں کا تیل نکالنا
۴۔ حقے کے نیچے بنانا
۵۔ رسّی بیلنا
۶۔ قالین بافی کرنا
۷۔ دریا بُننا
۸۔ تولیئے بنانا
۹۔ زمین کھودنا
۱۰۔ پہاڑ توڑنا
۱۱۔ جیل کے تمام حصوں معہ باورچی خانہ بیت الخلا کی صفائی کرنا
۱۲۔ ڈسپنسری وہسپتال کی صفائی ستھرائی
۱۳۔ قیدیوں کی معلومات مہیا کرنا
۱۴۔ باغبانی وغیرہ

کالا پانی جیل کی اسّی سالہ تاریخ میں۔۔۔اسی ہزار۔۔۔لوگوں کو قید کیا گیا۔۔۔اور۔۔۔ہزاروں قیدیوں کو۔۔۔پھانسی پر لٹکایا گیا۔۔۔مختلف ادوار میں۔۔۔ہر طبقہ۔۔۔اور۔۔۔شعبہ کے۔۔۔بے شمار۔۔۔اور۔۔۔ان گنت لوگ۔۔۔جرم کے علاوہ۔۔۔آزادی۔۔۔اور۔۔۔انسانی حقوق کی آواز بلند کرنے کے سبب۔۔۔کالا پانی جیل میں۔۔۔قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔۔۔اُن میں۔۔۔بہت سے نامور لوگ بھی شامل تھے۔۔۔!

۱۔ کمار گھوشی
۲۔ روپندر ناتھ بیز جی
۳۔ ہیم چندر داس
۴۔ اُلکر دتہ
۵۔ ربند بھوشن راء
۶۔ بیبھوتی بھوشن سرکار
۷۔ ہرنیش کیش کانجی لال
۸۔ سدھین کار سرکار
۹۔ ابھیناش چس در بھٹاچارجی
۱۰۔ برندر چندر سین
۱۱۔ ویوک دامودر سوارکر
۱۲۔ مولوی رحمت اللہ
۱۳۔ اماں بی
۱۴۔ فضل حق خیر آبادی
۱۵۔ یوگیندر شکلا
۱۶۔ ترلوک ناتھ چکرورتھی
۱۷۔ پرمانند بھائی
۱۸۔ دامودر سوارکر اور گنیش سوارکر

(یاد رہے کہ مذکورہ بالا دونوں سگے بھائی آگے پیچھے ایک ساتھ کالا پانی جیل میں رہے مگر ایک دوسرے سے بے خبر)

سب سے اہم۔۔۔اور۔۔۔حوصلہ افزا پہلو۔۔۔کالا پانی جیل کا یہ ہے۔۔۔کہ اس جیل میں مقید۔۔۔بے شمار نامور۔۔۔اور۔۔۔ان گنت غیر معروف لوگوں کو۔۔۔حکومت برطانیہ کی جانب سے معافی مانگنے کے عوض۔۔۔ رہائی کی پیشکش کی گئی۔۔۔مگر۔۔۔کسی ایک قیدی نے بھی۔۔۔حکومت برطانیہ کی پیشکش کو قبول کرنے کے بجائے۔۔۔وطن پر مر مٹنے کو ترجیح دی۔۔۔بقول اسرار الحق مجاز:

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہ گزرِ کارواں سے ہم
کیا پوچھتے ہو جھومتے آئے کہاں سے ہم
پی کر اٹھے ہیں خُمکدۂ آسماں سے ہم
کیوں کر ہوا ہے فاش زمانہ پہ کیا کہیں
وہ رازِ دل جو کہہ نہ سکے راز داں سے ہم
ہمدم یہی ہے رہ گزرِ یار خوش خرام
گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم
کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے
الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم
ہر نرگسِ جمیل نے مخمور کر دیا
پی کر اٹھے شراب ہر اک بوستاں سے ہم
ٹھکرا دیئے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکشِ امتحاں سے ہم
دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طرازِ شوق
لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم
بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

- انشائیہ -

گپ شپ

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی

(قاہرہ)

بلا شبہ گپ شپ ایک ایسی خصوصیت ہے، جو ہمیشہ خواتین کی فطرت کی وجہ سے ان کے قریب رہی ہے، جس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے معاملات کی وضاحت کے لیے زیادہ الفاظ استعمال کریں، کیونکہ وہ اکثر شکایت کرتی ہیں۔ عورت اگر نہ بولے گی تو وہ کئی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ اسے بولنے دیا جائے۔ گپ شپ میں عورت کا مسئلہ تکرار ہے، یعنی وہی الفاظ جو وہ دہراتی ہے، کوئی نئی بات نہیں ہوتی ہے، اس کا وہی معمول ہے۔ اگر کوئی مہمان آئے اور جائے تو اس کی بات صوفے، سیلون، ماربل، رنگ کی اقسام کے بارے میں ہوگی۔ اور اس کی طرف سے ایک لمبی آہ بھری حالت کی تکلیف تک محدود ہوتی ہے اور یہ کہ اس کے پاس وہ نہیں ہے جو دوسروں کے پاس ہے۔ اپنی گپ شپ کا وہ خدا کی حمد کے ساتھ اختتام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ، اگر وہ شادی کی تقریب میں جاتی ہے، مثال کے طور پر اس موقع سے ایک ماہ یا آدھا ماہ پہلے، وہ گپ شپ کرے گی کہ وہ کیا پہنے گی؟! کیا خریدنا چاہتی ہے؟ وہ دولہا دلہن کے لئے کون سا تحفہ لے گی؟ ایسی صورت حال کے پیش نظر جب موقع ختم ہو جاتا ہے۔ جب چند روز باقی رہ جاتے ہیں، اس کے بعد وہ عورت تمام مدعو کرنے والوں، ان کے کپڑوں اور سونے جاگنے کے بارے میں گپ شپ کرتی ہے، کہ ان میں سے اکثر سونے کے خول سے مزین ہیں، انھیں ادھار لیا ہے، یا کپڑے بھی کرائے پر لیے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ رمضان کا سامان، اس کے اور بچوں کے لیے عید کے کپڑے، عید کی رونقیں، اس کی کریموں کی خصوصی ضروریات، کاسمیٹکس، ہیئر ڈائی، ڈرائر اور جلد کے دانے جو اسے خوفناک خواب دکھاتے ہیں، ان تمام باتوں کے علاوہ اسکول میں بچوں کے داخلے کو بھولے بغیر اخراجات کے بارے میں بیوی کی گپ شپ ایک الگ گپ شپ ہے۔ بیچارے شوہر کو صرف سر درد کی دوا کا ایک ڈبہ خریدنا ہوتا ہے اور اسے ایک ہی بار میں نگلنا ہوتا ہے۔

صحیح معنوں میں، آپ کو ایسی بیوی کم کم ملے گی جو مختلف ثقافتوں کے ساتھ شوہر کی دلچسپیوں اور خیالات کا اشتراک کرتی ہو۔ شادی کرنے کے بعد زیادہ تر خواتین کی زندگی صرف بیوی ہونے، بچوں اور کھانے پکانے تک محدود ہو جاتی ہے اور کبھی شوہر سے چوری چھپے کچھ پیسے جمع کر لیتی ہے۔ بعد میں جب وہ اسے چیک کرتی ہے، تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ شوہر نے پیسے چوری کر لیے ہیں۔ کہاں بیچاری نے موم بتی کی روشنی سے شاندار کھانے کے ساتھ ایک رومانی رات بنانے کے لیے پیسے جمع کئے تھے، آخر کار وہ دل برداشتہ ہو کر شوہر کو بد دعا دیتی ہے۔

سچ پوچھئے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ کسی عورت کی ایسی گپ شپ سنوں۔ میں اس سے بات کرنے یا اس کی بات سننے کی حالت میں نہیں ہوتی۔ مجھے بھی اس قسم کی عورت کے تصور سے بھی نفرت ہے، جو ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ کبھی میں سننے پر مجبور ہوتی ہوں، ایسی حالت میں خاموش رہتی ہوں یا جواب صرف (ہاں) میں دیتی ہوں اور اگر میں اس کے اصرار پر جواب دوں تو ایک لفظ کے ساتھ جواب دیتی ہوں۔

ظاہر سی بات ہے کہ۔ گپ شپ اب خواتین کی خصوصیت نہیں رہی، کیوں کہ اس خصوصیت والے کچھ مرد موجود ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو خواتین سے زیادہ باتونی ہیں۔ وہ مرد اب خاموش انسان نہیں رہا، جو کم بولتا ہے، لیکن ایک دن وہ کسی بھی چیز اور ہر چیز پر مسلسل بات کرنے میں خواتین سے مقابلہ کرتا ہے۔ شاید زندگی، اپنے موجودہ تقاضوں کے ساتھ، آدمی کو بہت زیادہ بات کرنے کا مطالبہ کرتی ہے، اور جنس مخالف کی توجہ مبذول کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو دکھانے کی ضرورت اسے اس طریقے کا سہارا دیتی ہے جو دوسری طرف سے قریب تر ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ تقریباً ہر کام میں ایک مرد ہے جو بہت باتونی ہے۔ دن بھر، موقع بہ موقع کسی اور صورت میں گپ شپ نہیں چھوڑتا۔ وہ اکثر کہانیاں سناتا ہے، فلاں اور فلاں کے بارے میں بات کرتا ہے، لیکن اس صلاحیت کے سبب وہ تمام ملازمین کے قریب ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی گپ شپ کی وجہ سے شاید وقت تیزی سے گزرتا ہے اور کام کی پریشانیوں کو بھلا دیا جاتا ہے۔

چوں کہ گپ شپ خواتین کی ایک فطری خصوصیت ہے، اس لیے میں دیکھتی ہوں کہ آج کل زیادہ تر عورتیں خاموش مرد پر ایسے مرد کو ترجیح دیتی ہیں جو بہت زیادہ باتیں کرتا ہے۔ وہ خاموش مرد کو بوریت کا احساس دلانے والا سمجھتی ہیں، کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ گفتگو اظہار اور سمجھنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے، اس لیے بہت سی خواتین اسے خاموش مرد پر ترجیح دیتی ہیں۔ لیکن اس قسم کا مرد مجھے اچھا نہیں لگتا، مجھے بھی بہت پریشان کرتا ہے۔ اور جیسے زیادہ تر خواتین سمجھتی ہیں، مجھے محسوس نہیں ہوتا کہ بات کرنے والا آدمی بہت دل لگی اور ہلکا پھلکا ہے اور اس قسم کا آدمی چاہے تمام عورتیں اس مرد کو پسند کرتی ہوں، میں اسے پسند نہیں کرتی۔

باتونی آدمی وہ ہے جو معاشرتی شائستگی سے ناواقف ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ طرز عمل اس آدمی کی حیثیت کو کمتر بنا دیتا ہے، جو اپنی خاموشی اور اپنی عقلی گفتگو سے مشہور ہے جو آدمی بہت زیادہ باتیں کرتا ہے وہ دوسروں کے سامنے کمزور اور مضحکہ خیز نظر آتا ہے، جسے اس کی گفتگو سننے کا وقت نہیں ملتا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض مردوں کی زندگی اور سماجی حالات کی وجہ سے وہ اپنی پریشانیوں کو بھلانے کے لیے گپ شپ کا سہارا لیتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے میں اپنی توانائی صرف کر دیتے ہیں۔

باقی صفحہ ۱۰۷ پر ملاحظہ کیجیے

''دولتِ دل''

طارق نعیم

(اسلام آباد)

لوگ حیران ہیں اس پار سے ہوتا کیا ہے
ایک دیوار ہے دیوار سے ہوتا کیا ہے

اس کی عادت ہے تماشا سا لگائے رکھنا
اور اس صاحبِ اسرار سے ہوتا کیا ہے

بادشاہی تو فقیری میں بھی ہو جاتی ہے
تخت سے تاج سے دربار سے ہوتا کیا ہے

ہم نے اک لفظ سے تاریخ بدل کر رکھ دی
کر کے دکھلایا کہ انکار سے ہوتا کیا ہے

کوئی یوسف نظر آئے تو ذرا پوچھئے گا
ایک بھی ہو تو خریدار سے ہوتا کیا ہے

روز سمجھاتا ہوں خود کو کہ ترے پاس ہے کیا
ایک کردار ہے کردار سے ہوتا کیا ہے

پیش کرنی ہے تو پھر دولتِ دل پیش کرو
آجکل درہم و دینار سے ہوتا کیا ہے

○

مظفر رزمی

(●)

اس راز کو کیا جانیں ساحل کے تماشائی
ہم ڈوب کے سمجھے ہیں دریا تری گہرائی

جاگ اے مرے ہمسایہ خوابوں کے تسلسل سے
دیوار سے آنگن میں اب دھوپ اتر آئی

چلتے ہوئے بادل کے سائے کے تعاقب میں
یہ تشنہ لبی مجھ کو صحراؤں میں لے آئی

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

کیا سانحہ یاد آیا رزمی کی تباہی کا
کیوں آپ کی نازک سی آنکھوں میں نمی آئی

○

حنا رضوی حیدر

(پٹنہ)

دھوپ سایہ بن گئی ہے دشت پیمائی کے بعد
خار مرہم لگ رہے ہیں آبلہ پائی کے بعد

بھیڑ سے وحشت ہوئی تو آ گئے تنہائی میں
وحشت دل بڑھ گئی پھر اور تنہائی کے بعد

چپکے چپکے عشق کرنے کا کوئی حاصل نہیں
عشق میں منزل ملا کرتی ہے رسوائی کے بعد

ٹوٹ ہی جائیں گے جھوٹے خواب سارے ایک دن
وقت جب کروٹ بدل لیگا اک انگڑائی کے بعد

چین کب معبود کو ملنا تھا عابد کے بغیر
اس کو بھی ہم چاہیے تھے اپنی یکتائی کے بعد

بے رخی سے خیریت وہ پوچھ کر کیا چل دیئے
زخم دل رسنے لگے ایسی مسیحائی کے بعد

اس سے حال دل بتانا اس قدر مشکل نہ تھا
بات بن جاتی 'حنا' تھوڑی پذیرائی کے بعد

○

سمیرا سلیم کاجل

(اسلام آباد)

جو مُفلس آج گِریہ کر رہا ہے — زمینی آفتوں سے ڈَر رہا ہے
مُسلسل کون بَرساتا ہے بارِش — کہاں صحرا ہمیشہ تَر رہا ہے
گُزارا وقت ہم نے سسکیوں مِیں — مُسلّط ہم پہ طاقت وَر رہا ہے
تھیں جس مِیں قتل گاہیں دَرحقیقت — نگاہوں مِیں وُہی مَنظر رہا ہے
دَرختوں سے پَرندے اُڑ چکے ہیں — یہاں سائے مِیں موسم مَر رہا ہے
کھنکتی چُوڑیاں توڑی گئی ہیں — لہو مِیں تر بتر زَیور رہا ہے
اُسے بھی ڈُوبنا تھا ساتھ کاجل — کنارے پر جو آہیں بھر رہا ہے

○

بشارت وقار

(بہاولپور)

اشکِ مجبور ہے، آنکھوں سے جدا ٹھہرا ہے — یہ شبِ تار میں قندیلِ وفا ٹھہرا ہے
اُس فلک ناز کے سینہ پہ کئی داغ لگے — تیرے آنگن میں قمر آج ذرا ٹھہرا ہے
ایسا چشمہ نہ ہے دنیا میں کہیں پر لیکن — قطرہ ء اشک ہی بس آبِ بقا ٹھہرا ہے
اس کو مومن نہ کہو ورنہ خطا کار ہو تم — تین دن تک جو برادر سے خفا ٹھہرا ہے
کتنا جاہل ہے وہ مشرک ہے وہ کافر انساں — جو بھی کہتا ہے فلاں شخص خدا ٹھہرا ہے
دل غلاظت سے بھرا ہو تو طہارت کیسی — دل ہوا پاک تو پھر تن بھی صفا ٹھہرا ہے
رُت بدلتے ہی بدلتا ہے مزاجِ انساں — وہ جو راہزن تھا وہی راہ نما ٹھہرا ہے
اس کے جاتے ہی چمن زار ہوا ہے ویراں — ایسے لگتا ہے بدن جاں سے جدا ٹھہرا ہے
کل تلک تاج تھا جس سر پہ زمانہ کی قسم — میں نے دیکھا ہے وہی شاہ گدا ٹھہرا ہے
ایسا چشمہ نہ ہے دنیا میں کہیں پر لیکن — قطرہء اشک ہی بس آبِ بقا ٹھہرا ہے
قلبِ مومن کو کبھی ٹھیس نہ لگنے دینا — وہ جہاں ٹھہر گیا عرشِ عُلا ٹھہرا ہے
موت سجدہ میں بھی آئے تو بشارت نہ ملے — جس کسی شخص کا اک سجدہ قضا ٹھہرا ہے

○

شوکت جمال

(لاہور)

امید وصل پر زندہ ہیں یہ سب آپ کے عاشق — ہوئے جاتے ہیں لیکن جاں بلب اب آپ کے عاشق
پلا دیں شربت دیدار اُن کو بام پر آ کر — کھڑے ہیں دیر سے نیچے مؤدب آپ کے عاشق
انہیں یہ آپ کے بھائی ہراساں کر نہیں سکتے — ڈرے ہیں دھونس دھمکی سے بھلا کب آپ کے عاشق
رکھیں گے راز کی باتیں سدا یہ اپنے سینوں میں — نہ کھولیں گے کسی کے سامنے لب آپ کے عاشق
بہت بدنام ہیں عاشق یہ مانا ساری دنیا میں — مگر ہیں نیک خصلت اور مہذب آپ کے عاشق

○

طارق تاسی

(لاہور)

ایک صورت بام پر اچھی لگی　　شام کو اپنی نظر اچھی لگی
وہ پلٹ آیا بچھڑ جانے کے بعد　　زندگی بارِ دگر اچھی لگی
تیر نظروں کے بہت اچھے لگے　　حالتِ زخمی جگر اچھی لگی
رہگزر کو راہرو اچھا لگا　　راہرو کو رہگزر اچھی لگی
کب کسی کو یہ شجر اچھا لگا　　اک فقط شاخِ ثمر اچھی لگی
گو بری لگتی ہے کاگا کی صدا　　اس میں پوشیدہ خبر اچھی لگی
ہمسفر تھی جو سفر میں دوستو!　　وہ مجھے گردِ سفر اچھی لگی
کور بینوں کو فقط، تاسی یہاں　　شب زدہ سی یہ سحر اچھی لگی

○

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیارپور)

پربت دیکھا رائی کا　　قائل ہوں صناعی کا
مفلس کو ہی ڈستا ہے　　سانپ یہاں مہنگائی کا
روز سناتا ہے یہ دل　　قصہ اک ہرجائی کا
ہنسنا رونا ایک ہوا　　اب تیرے سودائی کا
کھیل اسی کے ہاتھ میں ہے　　شہرت اور رسوائی کا
ڈوب کے دریا میں ہو گا　　اندازہ گہرائی کا

○

امیر حمزہ سلفی

(اسلام آباد)

قتل کرتے ہیں بے گناہوں کے　　ذہن بے حس ہیں کج کلاہوں کے
ہوسِ اقتدار میں کچھ لوگ　　ٹھہرے قاتل بھی خیر خواہوں کے
دو ٹکوں پر خریدنے سے یہاں　　بند ہوتے ہیں منہ گواہوں کے
ہم قلم کار برملا لکھ کر　　سچ دکھاتے ہیں رو سیاہوں کے
ڈنکے کی چوٹ پر کہیں گے حق　　گیت کیوں گائیں بادشاہوں کے
جھوٹ کہتے ہو، ہم سمجھتے ہیں　　زاویے آپ کی نگاہوں کے
خاک چھانی ہے دشتِ زندگی کی　　تجربے ہم سے پوچھ راہوں کے
کچھ رعایا عجب تماشا ہے　　اور کیا کہنے سربراہوں کے

○

ڈاکٹر پونم گوندل
(لاہور)

اس ٹھٹھرتے ہوئے دسمبر میں — اپنے دل کو جلا کے بیٹھی ہوں
روح کو یوں گنوا کے بیٹھی ہوں — عرش سے فرش پہ آ بیٹھی ہوں
گویا ہستی مٹا کے بیٹھی ہوں — جانتی ہوں ہوائیں ظالم ہیں
سمجھتی ہوں ہواوں کے تیور — پھر بھی ہمت بڑھا کے بیٹھی ہوں
اک دیا میں جلا کے بیٹھی ہوں — امید نو لگا کے بیٹھی ہوں
دیکھ اس عشق جاوداں کے لیے — کیا تھی اور کس جگہ پہ بیٹھی ہوں

○

عاکف غنی
(پیرس)

نظروں سے میری دور تھا، دل سے جدا نہ تھا — وہ شخص بھول کر بھی مجھے بھولتا نہ تھا
ہوں گی ضرور اس کی بھی مجبوریاں کوئی — غیروں میں جا بسا تھا، مگر بے وفا نہ تھا
وابستہ یوں تو ہم سے تھیں سب کی توقعات — لیکن ہمارا حال کوئی پوچھتا نہ تھا
ایسا نہیں کہ چاہنے والے تھے کم یہاں — لیکن تمہارے جیسا کوئی ہمنوا نہ تھا
الجھی ہوئی تھی ڈور مری زندگی کی یوں — سب کچھ تھا میرے ہاتھ میں، بس اک سرا نہ تھا
زادِ سفر قلیل تھا، منزل نظر سے دور — میں چل رہا تھا پھر بھی کہ کم حوصلہ نہ تھا
آئیں گے درد بانٹنے ہمدرد لازمی — عاکف کا یہ گمان بھی کچھ دیرپا نہ تھا

○

محبوب اصغر
(حیدرآباد، دکن)

جو پل صراطِ ہوس پر ہیں کب سنبھلتے ہیں — ہر ایک گام پہ دانستہ ہی پھسلتے ہیں
تراشنے کا ہنر ہے بڑا کرشماتی — جو سنگِ خارا حسیں پیکروں میں ڈھلتے ہیں
ہے حاسدین کی قسطوں میں جیسے خودسوزی — کہ آگ خود ہی جلاتے ہیں خود ہی جلتے ہیں
ہر ایک جرعہ شرارِ خمار ہے جس کا — عجیب مئے ہے لبالب ایاغ جلتے ہیں
کتابِ مہر و مروت ورق ورق خوشبو — کتابِ فتنہ کے جملے بہت بدلتے ہیں
رموزِ جذبہ جنوں اور جوشِ جاں بازی — یہ راز سنگ صفت پر کہاں سے کھلتے ہیں
اگرچہ راہِ محبت ہے ایک سوزِ دروں — اس التہاب میں صاحب جنوں ہی جلتے ہیں
خدا کے فضل سے محبوب ہم نہیں اصغر — ہمارے رنگ ہیں جو بھی نہیں بدلتے ہیں

○

جبیں نازاں

(دہلی)

جب بھی ڈھونڈو گے زندگی کی بیاض — ہاتھ آئے گی نہ خوشی کی بیاض
جھوٹ پر خولِ مصلحت ہے چڑھا — اور پڑھاتی ہوں راستی کی بیا ض
آہ، آنسو، کسک، یہ تنہائی — درد سے پُر ہے عاشقی کی بیاض
کرکے ترویج قتل و غارت کی — لکھ رہا امن و آشتی کی بیاض
خود ستائی کے ساتھ خود غرضی — ہے جبیںؔ اس نئی صدی کی بیاض

○

وشال کھُلر

(لدھیانہ)

لفظ میں جادو گھول فقیرا — رمز کی گٹھڑی کھول فقیرا
بول دو سچے بول فقیرا — کھول دے جھوٹ کی پول فقیرا
سیدھا چل اور دیکھ نظارہ — دُنیا کتنی گول فقیرا
سونے چاندی والے سستے — مٹّی کا کیا مول فقیرا
اس کی دُھن میں دُکھ کے ساگر — جس کے لئے میں جھول فقیرا
بات غلط تو بے معنی ہے — بات صحیح انمول فقیرا
جنگل تیرا رَین بسیرا — سنگ ہوا کے ڈول فقیرا
زہر بجھی اک تیز کٹاری — تیکھے تیکھے بول فقیرا

○

مادھو کوشک

(چندی گڑھ)

آج کے ماحول میں خنجر برے لگتے ہیں — ہاتھ لوگوں کے لہو سے تر برے لگتے نہیں
درد میں ڈوبے ہوئے منظر برے لگتے نہیں — اب کسی کو بھی برے رہبر برے لگتے نہیں
آستیں کے سانپ کی اوکات کیا ہے آج کل — آستینوں میں چھپے اجگر برے لگتے نہیں
بات کا مطلب صحیح ہو تو ادھوری بات کے — کسمساتے ٹوٹتے اکشر برے لگتے نہیں
حادثوں کی دھوپ نے برداشت کر پائے تو کیا — دیکھنے میں کانچ کے بھی گھر برے لگتے نہیں
پھر ہمیں اپنی نگاہوں پر بھروسہ کیوں نہیں — ان پرندوں کو بھی اپنے پر برے لگتے نہیں

○

''فقط ایک آنسو''

عطاء الحق قاسمی

(لاہور)

ممتاز افسانہ نگار اور تہلکہ مچا دینے والی ڈرامہ سیریز ''اندھیرا اجالا'' کے خالق یونس جاوید کی آپ بیتی ''فقط ایک آنسو'' حال ہی میں شائع ہوئی ہےاوراس کاایک باب مجھے 1960 کی دہائی میں لے گیا ہے جب آتش جوان تھا اورآمریت کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں پیش پیش ہوتا تھا۔ یونس جاوید نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس کا بیان بعد میں، اس سے پہلے 1958 کی ایک ''واردات'' کا ذکر جب ایوب خان نے جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کر ملک میں مارشل لالگایا، میں اس وقت میٹرک میں پڑھتا تھا ایک دن بیٹھے بیٹھے ''پنگا'' لیا اور ڈپٹی کمشنر کے ایک آرڈر کہ گانے بجانے والے ملک وقوم کا قیمتی اثاثہ ہیں لہٰذا انہیں مکمل پروٹوکول دیا جائے اوران کے ذکر میں حدِ ادب کا خیال رکھا جائے، پر بلاوجہ شرارت سوجھی، آرڈر حالانکہ صحیح تھا مگر میں نے ہفت روزہ ''شہاب'' جو مولانا کوثر نیازی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، ایک طنزیہ نظم لکھ کر بغرض اشاعت بھیج دی اس کا صرف مطلع یاد ہے:

ان سے ملئے حضرتِ استاد کلن خاں ہیں یہ
علمِ موسیقی میں مثلِ نیرِ تاباں ہیں یہ

اس شام میرے گھر پر دستک ہوئی، ابا جی باہر نکلے تو پولیس کو سامنے کھڑے دیکھا، ان میں سے ایک آگے بڑھا اور کہا ''مولانا'' عطاء الحق قاسمی کو باہر بھیجیں۔ ایک نظم کا موضوع اوراوپر سے میرے نام کی ثقالت سے انہوں نے مجھے مولانا ہی سمجھنا تھا۔ ابا جی نے کہا یہاں ''مولانا'' عطاء الحق قاسمی تو کوئی نہیں رہتے، میرا بیٹا عطا ہے، اسے باہر بھیجتا ہوں۔ ابا جی اندر آئے، وہ غصے میں تھے ''اب تمہاری کرتوتیں یہ دن بھی لائی ہیں کہ پولیس گھر پہنچ گئی ہے۔ میں خود پریشان ہوگیا، پولیس نے مجھے دیکھا تو ابا جی سے کہا، حضرت، ''مولانا'' عطاء الحق قاسمی کو باہر بھیجیں۔ ابا جی نے کہا ''یہی خبیث مولانا عطاء الحق قاسمی ہے''۔ پولیس والے حیران ہوئے اورانہوں نے مجھے اپنی حراست میں لے لیا، ابا جی نے پوچھا اس کا جرم کیا ہے۔ پولیس نے بتایا اس نے مارشل لا کے خلاف نظم لکھی ہے۔ یہ سن کر ابا جی کے چہرے پر رونق آ گئی کہ شکر ہے بیٹا باپ کے نقش قدم پر چل پڑا ہے، ابا جی فرنگی کے خلاف کئی بار جیل جا چکے تھے اور اب ان کا بیٹا بھی اسی راہ پر چل پڑا تھا۔

اس وقت رات ہو چکی تھی، پولیس مجھے کوٹ لکھپت سے آگے کہیں لے گئی، پھر انہیں اس معصوم صورت ''انقلابی'' پر ترس آیا۔ ایک سنسان جگہ پر گاڑی کو بریک لگائی اور کہا ''یہاں اتر جاؤ برخوردار۔ آئندہ اس قسم کی حرکت نہ کرنا''۔ سو میں آدھی رات کو پیدل گھر کی طرف چل پڑا، راستے میں دو تین جگہ کتے بھی پڑے، جب میں گھر پہنچا فجر کی اذان ہو رہی تھی، ابا جی بے چینی سے صحن میں ٹہل رہے تھے، مجھے دیکھا تو ان کی جان میں جان آئی اور مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ سب نے ان کی آنکھیں پُرنم بھی دیکھیں۔

اوراب یونس جاوید نے میرے حوالے سے جو کہانی بیان کی ہے وہ بھی سن لیں:۔

''مجھے یاد آ رہا ہے جب صدر ایوب کے خلاف ایجی ٹیشن ہو رہی تھی اس دن سارا شہر مال روڈ پر اُمڈ آیا تھا، پولیس والے روکنے کے لئے پر ہجوم جلوس کو حصار میں لینا چاہتے تھے وہ جب اس میں ناکام ہوئے تو انہوں نے بڑا ظالمانہ لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ ہجوم زیادہ بپھر گیا، لوگوں کا غصہ اور پولیس کی ذمہ داری گتھم گتھا تھے مگر میں پولیس کے حملے سے بچتا ہوا کسی پناہ کی تلاش میں تھا کہ زوردار آواز میں عطا نے مجھے پکارا، یونس ادھر نہیں۔۔۔ ادھر اس نے مجھے اشارہ کر کے سمت بتائی، اس نے مجھے بچانے کے لئے جتن کیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم دونوں بری طرح پولیس کے نرغے میں تھے ایک ایک لاٹھی سے ہم دونوں شکار ہو سکتے تھے کہ عطا نے بھاگ کر میرا ہاتھ پکڑا، ادھر آؤ، میرے پیچھے اور مجھے ساتھ لئے وائی ایم سی اے کے اندر داخل ہوگیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، عطا میری رہنمائی کر رہا تھا مگر عطا سیڑھیاں چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق کے جلسے میں جانے کے لئے بورڈ روم تک کی سیڑھیاں تو میں بھی اکثر چڑھتا رہا تھا مگر آج عطا نے اوپر اور اوپر کہتے ہوئے مجھے وائی ایم سی اے کی چھت پر پہنچا دیا۔ اس چھت کی منڈیر ان دنوں دس انچ سے زیادہ نہ تھی۔ کوئی بھی شخص ہمیں سڑک سے دیکھ سکتا تھا گویا چھپنے کی جگہ تھی نہ اوٹ لہٰذا اس دس انچ منڈیر پر عطا نے اپنی ٹھوڑی جمائی اور نیچے سڑک سے جی پی او چوک سے ہائی کورٹ کا منظر کھلا تھا۔ گھمسان کی اس معرکہ آرائی کو عطا اپنی آنکھوں میں مقفل کرتا رہا، کچھ دیر بعد شام اترنے لگی، ہنگامہ بھی ختم ہونے لگا، حتیٰ کہ اندھیرے کی چادر نے ہمارے لئے راستہ آسان کر دیا۔ ہم دونوں پورے جوش اور جذبے سے سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آ گئے''۔

اور جب جنرل ایوب خان نے جمہوریت کا بھیس بدل کر انتخابات کا اعلان کیا تو مادر ملت فاطمہ جناح ان کے مقابلے میں صدارت کی امیدوار کے طور پر سامنے آئیں، اس کے بعد مادر ملت کے خلاف جس گندی بدبودار مہم کا آغاز کیا گیا وہ ایک بدنما داغ ہے جو شاید کبھی مٹائے نہ مٹ سکے۔ ایوب خان کا وزیر مسعود صادق اس ساری مہم میں پیش پیش تھا۔ میں مادر ملت کا سپاہی تھا۔ چنانچہ جب ماڈل ٹاؤن میں منعقدہ ایک انتخابی جلسے میں مسعود صادق نے مادر ملت کے حوالے سے گندی زبان کا استعمال شروع کیا تو میں جو جلسے کے آخری حصے میں کھڑا اس قومی بے حمیتی کا مشاہدہ کر رہا تھا، اپنے جذبات پر کنٹرول نہ پا سکا اور میں نے با آواز بلند مسعود صادق کو مخاطب کر کے کچھ اس طرح کی بات کی کہ آپ مادر ملت

باقی صفحہ ۱۰۸ پر ملاحظہ کیجیے

خوشبوئے داستاں

جمیل عثمان
(نیویارک)

ڈاکٹر صبیحہ صبا، کو ہم سب صبیحہ آپا کہتے ہیں۔ میں نے اس مضمون میں انہیں صبیحہ آپا ہی لکھا ہے، اس لئے کہ صرف صبیحہ صبا کہنا آداب کے منافی ہے اور ڈاکٹر صبیحہ صبا سے اجنبیت ٹپکتی ہے۔ تو خواتین وحضرات! آج ہمارے لئے بڑا اہم دن ہے، اس لئے کہ آج ہم صبیحہ آپا کا جشن منا رہے ہیں۔ اس دن کے لئے ہم بہت دنوں سے کوشش کر رہے تھے لیکن وہ تیار ہی نہیں ہوتی تھیں۔ بڑے انکسار سے کہتیں:

''ارے، میں کس قابل ہوں!''

''مجھے تو بس رہنے ہی دیجئے!''

''اتنے سارے قابل لوگ ہیں، آپ ان کا جشن منایئے!''

لیکن وکیل بھائی (وکیل انصاری) اپنی کوششوں میں لگے رہے اور بالآخر انہیں راضی کر ہی لیا۔

صبیحہ آپا! آپ کو کاروان فکر وفن کے اس پروگرام میں تہہ دل سے خوش آمدید۔

میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ مجھے ان کا تعارف کرانے اور ان پر مضمون پڑھنے کے لئے کہا گیا۔

ان کی کتاب "چشمِ ستارہ شمار" کھولتے ہی اس قطعے پر نظر ٹھہرتی ہے:

اگر کسی سے مرے گھر کا تم پتہ پوچھو
تو پہلے وادیٔ فرقت کا فاصلہ پوچھو
پھر اس کے بعد بھی آنے کا گر ارادہ ہو
تو شہرِ۔ درد کو جانے کا راستہ پوچھو

ہم نے بھی طے کر لیا کہ ہم تو جائیں گے، چاہے وادیٔ فرقت ہو یا شہرِ۔ درد۔ اور جب ہم وہاں پہنچے ہیں تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہاں تو ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ رنگ و آہنگ کا اک سیل۔ رواں تھا جس میں ہم بہتے چلے جا رہے تھے۔ یہ واقعہ کئی سال پہلے کا ہے جب صبیحہ آپا نے ہمیں ''چشمِ ستارہ شمار'' دی اور ہم نے اسے پڑھنا شروع کیا۔

انتظار صد کشتۂ شمار ستارہ۔ چشم
سحر میں نہیں۔ دید کی کوئی ندیم نجم
صبا کو جس نے نکہتوں سے ہمکنار کر دیا
اسی مثال گل کے نام دل کی یہ کتاب ہے
نکہت۔ گل جہاں جہاں بھی گئی
میری خوشبوئے داستاں بھی گئی

خوشبوؤں کی شاعرہ خوشبوؤں کے شہر قنوج میں پیدا ہوئیں۔ قنوج خوشبو جات کے لئے مشہور ہے۔ عطر میں صندل کا عرق ڈالنے کے بعد اس کا برادہ سڑکوں پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ اس طرح پورا شہر معطر ہو جاتا ہے۔ قنوج کے قریب ہی رائے بریلی ہے جہاں سے سید احمد شہید نے، جو صبیحہ آپا کے خاندان کے بزرگوں میں تھے، انگریزوں کے خلاف اعلانِ۔ جہاد کیا تھا۔ اس اعلان کو صبیحہ آپا نے اپنی غزل کے ایک شعر میں یوں باندھا ہے:

توشۂ دل کے ساتھ جسے چلنا ہو چلے، اعلان۔ سفر
تکیہ رائے بریلی سے یوں سید احمد کرتے ہیں

اس شعر کے بارے میں مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی لکھتے ہیں: یہ شعر ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ عرصے کے بعد صبا ہی کہہ سکتی تھیں۔ مولانا غلام رسول مہر زندہ ہوتے تو یہ شعر سن کر چیخ اٹھتے۔ ان کو بے انتہا وابستگی و محبت سید احمد شہید سے تھی۔ یا پھر مولانا ابوالحسن علی کے دل پر اس کا اثر پڑے گا اور آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ صبا سید احمد شہید کی پوتی ہیں اور یہ اعلانِ۔ سفر اب تک ان کے تحت الشعور یا لاشعور میں گونج رہا ہے

اسی غزل کا ایک اور خوبصورت شعر:

بہر۔ نمائش خم تو سبھی کرتے ہیں سر۔ تسلیم مگر
چند ہی ہم میں تعمیل۔ ارشاد۔ اب وجد کرتے ہیں

پاکستان بننے کے بعد دیگر افراد۔ خانہ کے ساتھ کراچی ہجرت کی اور اسی روشنیوں کے شہر کو اپنا گھر بنا لیا۔ کراچی یونیورسٹی سے سائنس میں ماسٹرز کیا، جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سنٹر سے ایم فل کیا۔ پھر ان کی شادی جناب عبدالحئی سے ہو گئی جو موسیقی، اداکاری اور تمثیل نگاری سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ عبدالحئی صاحب کے ساتھ امریکہ آ گئیں۔ وایومنگ یونورسٹی سے فیلو شپ اور اس کے بعد Biochemistry پر ریسرچ کی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پچھلے ۳۵ سالوں سے اسٹیٹن آئی لینڈ میں مقیم ہیں اور وہیں ایک سائنسی ادارے میں تحقیقی کام کرتی ہیں اور پڑھاتی بھی ہیں۔ نیویارک ہی اب ان کا وطنِ۔ ثانی ہے اور اس شہر میں اردو کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے مغرب کے لکھنؤ کا نام دیا ہے۔

دوشیزۂ غزل کے گیسو سنوارنے کو
رہتے زبان داں ہیں مغرب کے لکھنؤ میں

حیرت کی بات ہے سائنس سے اتنی گہری وابستگی رکھنے کے باوجود شعر و ادب پر اس قدر دسترس! صبیحہ آپا ایسی شاعرہ نہیں ہیں جنہوں نے شوق پورا کرنے کے لئے شاعری کی ایک کتاب لکھ دی۔ ان کی شاعری اعلیٰ درجے سے بھی اعلیٰ ہے۔ ان کا کلام اردو ادب میں بہت ہی اونچے درجے پر رکھے جانے کے لائق ہے۔ الفاظ کا استعمال، اشعار کی بنت، خیالات کا اچھوتا پن، فکر کی بلندی، بندش و تراکیب، مفاہیم و اسالیب، الفاظ کا آہنگ و امتزاج، مصرعوں میں ربط اور اظہار میں ضبط! ان کی شاعری ایسی شاعری ہے جس کی مثال امریکہ میں تو کیا ہند و پاکستان میں بھی نہیں ملتی۔ ان کا ڈکشن ہی جدا ہے۔

حیات ! تیرے نئے تقاضے ہمیں تو بے موت مار دیں گے
ذرا یہ قرض۔ جہاں چکا لیں، تو قرض۔ ہستی اتار دیں گے

چلو کہ ہم زندگی کی نظریں بچا کے بس ایک پل چرا لیں
کہ اس رفاقت کی ایک ساعت ہی حاصلِ۔ کائنات ہو گی

جو گنے چنے مہہ و سال تھے ، وہ فراق۔ یار کے نام تھے
جو وصالِ۔ یار سے ہوں رقم، مجھے ایسے کچھ مہہ و سال دے

پروفیسر سحر انصاری صبیحہ آپا پر اپنے مضمون میں ان اشعار کا حوالہ دیتے ہیں:

رہے کچھ اس طرح غم۔ جہاں کے بندوبست میں
لکھا بھی حرف۔ آرزو تو بس خط۔ شکست میں
گواہ کوئی ہے نہ تھا ، دلوں کی واردات کا
مری حکایت۔ جنوں نہ بود میں نہ ہست میں

اور پھر لکھتے ہیں:

''ان اشعار کے ردیف و قافیے کو دیکھیے ،لفظیات پر توجہ دیجیے تو اندازہ ہو گا کہ پختگیءاظہار میں یہ کسی استاد سے کم نہیں''- آگے مزید لکھتے ہیں:

''صبیحہ صبا کے اشعار ایک گفتگو،ایک Discourse کا پیرایہ رکھتے ہیں- آج کل بے لہجہ شاعری پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے- شعرا کے مصرعے، بیانات (Statements) کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں- بے لہجہ شاعری کے اس دور میں صبیحہ صبا کا کلام میرے لیے خاص توجہ اور دلچسپی کا حامل ہے- اور میرا خیال ہے کہ شاعری میں لہجے، اندازِ تکلم اور آہنگ گفتگو کو سمجھنے، جاننے اور ماننے والے صبیحہ صبا کی شاعری کی ندرت اور تازگی سے ضرور متاثر ہوں گے''-

پروفیسر سحر انصاری نے جو بات کہی ہے، یعنی شاعری میں اندازِ تکلم، اس کی چند مثالیں دیکھیے:

وہ کسی اور کا ٹھکانہ تھا
کیا کہا، آپ میرے گھر آئے!

یوں ترے شہر میں ویسے ہمیں کچھ کام بھی تھے
اور کچھ دل نے بہانے سے بنائے خود بھی

آپ کو گزرا ہے مجھ پر اک شناسا کا گماں
خیر چلیے، اس بہانے ہی تعارف ہو گیا

ناحق ہی الفاظ مرے شعروں کے قلمزد کرتے ہیں
نفس۔ مضامیں کی تحریف میں آپ تو بس حد کرتے ہیں

صبیحہ آپا کی رومانی شاعری پڑھ کر جین آسٹن (Jane Austen) کی subtlety یاد آ جاتی ہے- اتنی باریک بینی سے بات کہنا اور ایسے پیرائے میں اس کا اظہار کرنا جیسے احمد راہی کا شعر ہے:

کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے
کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے

صبیحہ آپا کا کمال ہے-

Sense and Sensibility ان کی محبت کی شاعری میں اس طرح استعمال ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا اپنے دل میں ایک ارتعاش سا، ایک کسک سی محسوس کرتا ہے- اتفاق سے یہ جین آسٹن کے ایک ناول کا نام بھی ہے- یہ اشعار سنیے اور سر دھنیے:

نہ کوئی شکوہ ، نہ کوئی وعدہ ، نہ پھر کسی بات کا اعادہ
اب اس تغافل پہ، اس تجاہل پہ آپ سے عرض کیا کریں ہم

سن رہے ہیں آپ کو بھی ہم سے الفت ہو چلی
خیر اب اس بات کی گھر گھر نہ شہرت کیجیے

سجا کر چار سو رنگیں محل تیرے خیالوں کے
تری یادوں کی رعنائی میں، زیبائی میں جیتے ہیں

تم بھی انا کی قید میں دور سے دیکھتے رہے
خواب بیاں کریں تو کیا، ہم کو بھی تھا یہی حجاب

کتنی مثالیں دوں؟ کہاں تک سنیں گے، کہاں تک سناؤں؟ وقت کی بندش ہے- بس، محبت کے جذبے کا ایک شعر اور دیکھیے:

کوئی اٹھے اور اٹھ کے چہرے کو مہر۔ تاباں کے ڈھانپ آئے
ہے ان کا کہنا کہ رات ہے یہ، تو ٹھیک ہے پھر یہ رات ہو گی

اسی لئے ''منزلیں گرد کی مانند'' کے مصنف خلیق ابراہیم خلیق ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''صبیحہ صبا کی شاعری بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے- اور اصناف شاعری میں غزل ان کی محبوب صنف ہے- ان کے ہاں وصل کا ساز و آہنگ کم اور ہجر کا سوز و گداز زیادہ ہے- جیسے یہ دو شعر:

یہ سیل۔ اشک مجھے گفتگو کی تاب تو دے
جو یہ کہوں کہ وفا کا مری حساب تو دے

یہ خامشی تو قیامت کی جان لیوا ہے
وہ دل دکھائے مگر بات کا جواب تو دے

ڈاکٹر مظفر شکوہ نے صبیحہ آپا کے بارے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے- کہتے ہیں، ''ان کے کلام میں دل آویزی بھی ہے اور سوز و گداز بھی- روانی، آمد، برجستگی اور ایک طرح کی حلاوت ان کے شعری اوصاف میں شامل ہے- ان

کا لب ولہجہ نرم اور دھیما دھیما ہے- وہ عام فہم، سادہ زبان، روز مرہ اور مروج محاورے استعمال کرتی ہیں- وہ نئی بات بھی کلاسیکی ڈھب میں کرتی ہیں- انہیں شعر کہنے کا سلیقہ آتا ہے اور ان کے اشعار میں خلوص اور سچائی جھلکتی ہے- اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی دعا ہے

مجھے گفتگو کا ہنر نہیں، مری خامشی میں کمال دے
مرے فن کا رخ ہے دھواں دھواں، اسے فکر کے خدوخال دے

میں خیال۔ کہنہ کے پیرہن کو نئی تراش خراش دوں
لغت۔ جدید کے ذیل میں، کوئی دے تو میری مثال دے

احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں: ''صبیحہ صبا کی غزل اردو شاعری کی تمام و کمال مثبت روایات کا حیرت انگیز اور دلآویز نچوڑ ہوتی ہے- ان کی غزل پڑھیے تو کلاسیک کا دھوکہ ہوتا ہے''- ویسے تو صبیحہ آپا کی بے شمار غزلیں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں، لیکن میں صرف ایک غیر معمولی غزل کے چند اشعار آپ کو سناؤں گا:

میرے لئے آغوش کشائے کوئی آئے
پھر آ کے گلے مجھ کو لگائے کوئی آئے
آ جائے ہے خط ایک نئے عذر کے ہمدوش
اے کاش کبھی خط کی بجائے کوئی آئے
سکھلائے جو آدابِ۔ جنوں بے خبروں کو
مجنوں صفتے، قیس نمائے کوئی آئے
چھڑ جائے شبِ۔ تار سے پھر مفت کا جھگڑا
خورشید رخیماہ لقائے کوئی آئے
کیا جانیے کیوں ورڈ۔ زباں ہے یہ تمنا
آئے، کوئی آئے، کوی آئے، کوئی آئے

اب اس سے زیادہ کلاسیکیت اور کیا ہوگی؟- میں نے شروع میں کہا تھا کہ ان کی اپنی ایک ڈکشن ہے- یہ غزل اس کی بہترین مثال ہے- جمیل الدین عالی نے صبیحہ آپا پر اپنے مضمون میں یہ غزل یہ کہہ کر quote کیا ہے کہ ''دیکھیے اس میں ردیف کس کس پہلو سے استعمال کی گئی ہے''- اور احمد فراز کہتے ہیں کہ ''اگر مجھے صبیحہ کے شعری وجود کو کوئی نام دینا پڑے تو میں اسے ''چراغ۔ درڈ۔ نیم وا'' کہوں گا کہ اس کی لودرون ذات اور بیرون ذات ہر دو جہتیں سنبھالے ہوئے ہے''-

ہندوستان کے ایک بہت اچھے شاعر اور نقاد پروفیسر علیم اللہ حالی صبیحہ آپا کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

محبت کرنے والے دل کی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشیں، کرب لاحاصلی، شدت جذبات کے باوجود احتیاط۔ لب کشائی، اپنے جذبے پر اعتماد، انتظار اور رشک وحسد کا مہذب اظہار، انتظار میں بھی جمعیت خاطر، کچھ انہی عناصر سے صبیحہ صبا کے شعری مزاج کی تشکیل ہوئی ہے-

حالی صاحب نے انتظار اور رشک وحسد کی بات کی ہے تو ان کے دو نمونے پیش کروں گا ایک انتظار اور دوسرا رشک وحسد:

مرے چمن میں تو نرگس کے پھول کھلتے ہیں
مرا نصیب رہی انتظار کی خوشبو
تمام گفتگو میں تذکرہ تو دوسروں کا تھا
یونہی رواروی میں میرا حال پوچھتے رہے

صبیحہ آپا ایک حساس دل اور ذہن کی مالک ہیں- کوئی بھی واقعہ ہو اس کا ضرور اثر لیتی ہیں- کوئی بڑا آدمی اس دنیا سے گزر جائے تو ان کے ذہن پر اثر ہوتا ہے- قرۃ العین حیدر، مولانا حسن مثنیٰ ندوی، شہریار، حکیم محمد سعید، جمیل الدین عالی، احمد فراز، یونس شرر، شفیع بیزار اور بہت سے اکابر کے انتقال پر انہوں نے نوحے لکھے- اہم سیاسی واقعات پر بھی ان کی نظمیں ہیں جیسے ''اوبامہ کی تخت نشینی''-

آخر میں صبیحہ آپا کی ایک بہترین غزل کے چند اشعار- آپ اس غزل کی روانی دیکھیے، اس کے الفاظ دیکھیے، اس کا حسن۔ تغزل دیکھیے، جیسے کہ حنیف اخگر مرحوم نے کہا ہے، ''خوش فکر، خوش مشق، اردو کی شعری روایات سے واقف، فنی محاسن ومعائب سے آگاہ، غزل کی مزاج شناس، اس کے رموز ونکات کو برتنے کا سلیقہ جانتی ہیں- تو غزل سنیے:

ذرا سی دیر کے لئے مری کتاب دیکھیے
جو وقت ہو تو میرا حسنِ۔ انتخاب دیکھیے
جہاں جہاں لگی ہوئی ہیں کاغذی نشانیاں
انہیں وہیں سے کھولئے، ذرا وہ باب دیکھیے
درست ہے کہ اس میں کچھ نقوشِ۔ دیگراں بھی ہیں
مگر ہے کس کے نام اس کا انتساب، دیکھیے
یہ ٹھیک ہے کہ سب خیال وخواب نظم ہو چکے
مرا خیال باندھیے، مرے بھی خواب دیکھیے
وہ شام جب غمِ۔ فراق مجھ سے ہم کلام ہو
تو پھر مرا جمال، میری آب وتاب دیکھیے
یہ جان لیجیے کہ کوئی داغ پھر چمک اٹھا
کبھی جو میرا حال اس قدر خراب دیکھیے
ابھی ابھی کھلا ہے میری خاک میں نیا گلاب
صبا کے ساتھ جایئے تو وہ گلاب دیکھیے

صبیحہ آپا کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ''آزمائشِ گل'' عنقریب شایع ہونے والا ہے- اس کتاب سے دو اشعار دیکھیے- آخری مصرعے میں کتاب کا نام کس خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے:

سفید گھر کے برابر جو ہے نمائش۔ گل
سیاہ کار چلے ہیں پئے ستائش۔ گل
ہے کون داغ کہ ہے آج بھی حریف۔ چراغ
ٹھہر گئی ہے پھر امسال آزمائش۔ گل

''ایک لہر کی چھاگل''

ڈاکٹر جنید آزر
(اسلام آباد)

جناب صابر ظفر کم وبیش پانچ دہائیوں سے تسلسل سے اپنی تخلیقی فعالیت کے سبب اردو شاعری کے منظرنامے پر اپنی انفرادیت کی تب وتاب کے ساتھ جگمگا رہے ہیں۔اس تمام عرصے کے دوران، اُن کی فکری زرخیزی نے اردو غزل کو جس سخاوت سے ثروت مند کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔موضوعاتی تنوّع ان کی شعری کائنات کو نت نئے منطقوں تک فکری رسائی فراہم کرتا ہے۔ ندرتِ خیال کے وصف ان کی شعری تجسیم کے نتیجے میں ابھرنے والے خدوخال قاری پر حیرت واستعجاب کی کیفیت طاری کردیتے ہیں۔نادر اور اچھوتی تراکیب، برمحل اور برجستہ لفظیات کے انتخاب کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار میں موجود معنوی تہہ داری نئے نئے مفاہیم کی تشریحات پر کمربستہ نظر آتی ہیں۔

لمحہ موجود میں غزل میں نئی بات کہنا بہ ذاتِ خود شاعر کی فکری استعداد کی عکاسی کرتی ہے اور جناب صابر ظفر کی غزل میں اس استعداد فکر کے عکس جابہ جا دکھائی دیتے ہیں۔تازہ تر طرزِ احساس میں گندھی ان کی غزل موجود اور آئندہ زمانوں کے لیے فکری شہادت کو مضبوط اور دیرپا بنیادوں پر استوار کرتی ہے۔اپنی متحرک قوتِ متخیلہ کی بدولت صابر ظفر جن مناظر کی تصویر کشی کرتے ہیں وہ بعینہٖ اپنے پڑھنے والوں کے ذہن ودل پر نقش کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔اپنی سماجیات سے جڑت ان کی شاعری کے رنگوں کو پختہ اور پائیداری سے پیوستہ کرتی ہے۔ان کا سماجی مشاہدہ باریک بینی کی بنیاد پر اظہار کے قرینوں میں ڈھلتا ہے۔ ان کا شعور کسی مخصوص فکری دائرے میں محصور نہیں۔مضامین نو کا ایک قافلہ ہے جو قطار در قطار ان کی فکری وسعت کی شہادت دیتا ہوا آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔صابر ظفر کی تمام شاعری میں جہاں تازہ تر موضوعات کا بیش قیمت انبار ہے وہیں ان کا ایک نمایاں وصف ان کا مزاحمتی رویہ بھی ہے۔میں اس تحریر میں ان کے تازہ شعری مجموعے ''ایک لہر کی چھاگل'' کے تناظر میں ان کی مزاحمتی شاعری کے حوالے سے اختصار کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔

صابر ظفر کی اپنی زمین اور اس کے لوگوں سے فکری اور نظریاتی وابستگی ان کے شعر کو نئی توانائیوں سے آشنا کرتے ہیں۔ان کا سب سے پہلا اور بڑا حوالہ یہ ''گل زمیں'' ہے جو ہماری دھرتی ماں ہے۔جس کی بخشی ہوئی شناخت ہمیں دنیا میں بیگانگی کے دکھ سے محفوظ کیے ہوئے ہے۔ان کی شاعری کا ایک قابل قدر حصہ اپنی گل زمین کی تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور اجتماعی زبوں حالی کا نوحہ سنا رہا ہے:

مجھے عشق ہے ایسی دھرتی سے جہاں ظالم سرافراز نہ ہو
کوئی اہلِ وطن ناراض نہ ہو، کوئی چھینی گئی آواز نہ ہو
غنیم جس دن سے گُل زمیں پر ظفر مسلط کیے گیے ہیں
کدورتیں اس قدر بڑھی ہیں کہ ہر کسی میں نفاق دیکھا
مری گل زمین مرے خدا، تری رحمتوں کو ترس گئی
کہ جہاں برسنا تھا ابر کو، وہاں آگ آ کے برس گئی

صابر ظفر عہد حاضر کے ان چند لکھنے والوں میں شامل ہیں جو استعماری قوتوں کے جبر کے خلاف تسلسل سے صدائے احتجاج بلند کررہے ہیں۔ ان کی شاعری معاشرتی جبر کے خلاف ایک توانا آواز کی صورت میں گونجتی ہے۔ ایک مسلسل جنگ ہے جو اُن کے اور اس زمین کے دشمنوں میں چل رہی ہے۔اس جنگ میں ان کی صدا ہر محاذ پر بلند ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ان کے مصارع ہتھیاروں کی صورت اس جنگ میں ہر محاذ پر اس کی مزاحمت کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں۔

سُرخ انگاروں سے دہکی ہوئی ہر کیاری ہے
باغباں اس پہ مُصر ہے کہ یہ پھلواری ہے
چُپ ہیں جو بھی، انہیں غیرت سے علاقہ ہی نہیں
ظلم ہونے پہ مرا چیخنا غداری ہے

وہ کسی محاذ پر نہ ہتھیار ڈالتے ہیں اور نہ ہی کسی لمحے انہیں پسپائی کا خیال آتا ہے۔ایک جذبہ ہے جو ان کے ہاں لہو گرم رکھنے کا بہانہ ہے اور وہ جذبہ اپنی گل زمین سے کبھی نہ مٹنے والی محبت ہے۔یہ محبت انہیں طاقت بھی دیتی ہے اور حوصلہ بھی۔انہیں علم ہے کہ ان کی زبان پر آنے والا کلمۂ حق ان کے حریف کو خاموش کرانے پر قدرت رکھتا ہے:

کرو سرخ اور یہ سرزمیں اسے نذر اور لہو کرو
تمہیں کر رہا ہے جو لاپتا، وہی پہلے قتل عدو کرو
تیرے دیوانے تو آمادۂ فریاد نہ ہوں
جنگ جاری رکھیں جب تک سبھی آزاد نہ ہوں
اگر اس شہر میں آوازِ سلاسل ہے بہت
یہ تو معمولِ شب و روز ہے، ناشاد نہ ہوں
ہے مزاحمت کا افق جہاں، ہے پسند نعرۂ حق وہاں
وہ جو چپ کرادے حریف کو مجھے اس سخن پہ عبور ہے
کئی چہرے وجہِ حیات ہیں کئی آنکھیں قابلِ دید ہیں
ہیں انہیں کے قدموں کی خاک ہم کہ جو گل زمیں کے شہید ہیں
سرِ رزم، رنگِ حیات ہوں کہ میں جانثاروں کے ساتھ ہوں
وہ لہو کی بوندیں اچھال دوں جو ظفر بدن میں مزید ہیں

کسی بھی قوم کی تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی روایات کو آئندگاں تک

محفوظ رکھنے میں ادبا و شعرا کی لکھتیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ایک بالغ نظر لکھاری اگر ارضی صداقتوں سے گریز پا ہو تو وہ اپنے سماج اور زندگی کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے چند ہی نام ہیں جنہوں نے کسی مصلحت کا شکار ہوئے بغیر اپنے شعری اظہار میں مکمل صداقت سے کام لیا ہے۔صابر ظفر نے بحیثیت شاعر سماجی حوالے سے اپنی ذمہ داری کو دیانت داری سے پورا کیا ہے اور ایک ایسے اہم مسئلے کی جانب تسلسل سے ہماری توجہ مبذول کروائی ہے جس پر ہر پاکستانی کو تشویش ہے۔افراد کا روز روشن میں منظر سے غائب ہو جانا معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے چینی کا سبب ہے۔ایک فرد کا غائب ہونا صرف ایک فرد کا متاثر ہونا نہیں بلکہ اس عمل سے اس کا خاندان اور پھر توسیعی سطح پر پورا معاشرہ اس کی زد میں آ جاتا ہے۔ وہ لوگ جو اس ملک کے محافظ بنائے گئے وہی قاتلوں کے گروہوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ جہاں آپ کی جان کو محفوظ ہونا چاہیے وہ جرائم پیشہ گروہوں کی پناہ گاہوں کا روپ دھار چکی ہیں۔

گروہ اہلِ ستم کی پناہیں بن چکی ہیں
تمام چوکیاں اب قتل گاہیں بن چکی ہیں
جو لاپتا کیے جاتے ہیں لوگ ان کے لیے
یہ راہیں اصل میں دوزخ کی راہیں بن چکی ہیں
اجل رسیدہ بھی ہیں لوگ لاپتا ہی نہیں
اور ان کی سمت کسی کا قدم اٹھا ہی نہیں
خدا کے ہوتے ہوئے بھی ستم زدہ ہے ظفر
مگر وہ لوگ کہ جن کا کوئی خدا ہی نہیں

صابر ظفر نے اپنے اشعار میں ایک باضمیر فنکار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نیمعاشرے کی مثبت اور منفی اقدار کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہوا ہے۔انہوں نے زندگی کے ناقابل تردید حقائق کو شعری پیکر عطا کیے ہیں۔ انسان کے لیے زندگی عزیز ترین چیز ہے مگر ہمارے معاشرے میں یہی سب سے بے وقعت سمجھی جاتی ہے۔وہ حالات کی تبدیلی کے خواہاں ہیں اور اس کے لیے عملی طور پر آگے بڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ عمل کے خوگر ہیں۔انہیں علم ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔اسی لیے مسائل کا حل نکالنے کے لیے کوشش کرنے پر بھی زور دیتے ہیں۔

تلاشِ گمشدگاں کی نکالو راہ کوئی
بجائے اس کے کہ لکھتے رہو یہ شہر آشوب

حالات جیسے بھی ہوں، مشکلات جتنی بھی ہوں۔تبدیلی کا عمل ناگزیر ہے۔موسم ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔دن رات کا دورانیہ اپنے وقت پر گھٹتا بڑھتا ہے۔قدرت کے قوانین اٹل ہیں، لہٰذا صابر ظفر بھی کسی لمحے مایوس نہیں ہوتے۔ وہ فطرت کے مزاج آشنا ہیں، انہیں یقین ہے کہ دن بدلیں گے، خزاں زدہ شاخوں پر نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔نئے شگوفے پھوٹیں گے اور وہ وقت آئے گا جب کامیابی کی صبح طلوع ہوگی:

ابھی برگ و بار ملول ہیں، ابھی کچھ نصیب کا پھیر ہے
نئے پھول آئیں گے شاخوں پر، ذرا رُت بدلنے کی دیر ہے
کوئی پل ہے آگے امید کا، وہ ملیں گے جو ہوئے لاپتا
یہ جو کٹ نہیں رہی چین سے، اسی شب کے بعد سویر ہے
ہمیں لہرائیں گے آزاد سے کا پرچم
آ گے نکلیں گے ہمیں وقت کی کٹھنائی سے

میں انہیں اس سینتالیسویں مجموعے ''ایک لہر کی چھاگل پر'' پر ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کرتا ہوں۔رب کریم اس شعری سفر میں انہیں صحت و سلامتی کے ساتھ استقامت بخشے۔آمین

- بقیہ -

احساس کے خوفناک سائے

دانت ٹوٹ پھوٹ جائیں گے تو پوپلے منہ بات کرتے ہوئے میری بات کوئی سمجھنے والا نہیں ہوگا۔کیا میں اپنے چہرے اور گلے کی جھریاں چھپا پاؤں گا! مجھے یہ احساس بھی اندر ہی اندر نوچ رہا ہے کہ میری اولاد آنے والے وقت میں اپنی اپنی دُنیا آباد کرنے میں لگ جائے گی اور ہم میاں بیوی تمام جسمانی ضعف کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہ جائیں گے۔ہماری اولاد کی نظر میں ہماری حیثیت ایک کباڑ کی سی ہوگی۔آج میں اپنے اس خوب صورت مکان میں شاندار بیڈ پر لیٹا ہوں۔آٹھ انچ کا موٹا گدّا میرے نیچے ہے اور ملائم لحاف میرے جسم کو ڈھانپے ہوئے ہے لیکن جب میں ایک دن موت کی آغوش میں چلا جاؤں گا تو یہ سب کچھ مجھ سے چھوٹ جائے گا۔قبر کی تنہائی اور ہمیشہ کی جدائی کا احساس میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے!

مصور القمر نے یہ باتیں سوچتے ہوئے کروٹ بدلی تا کہ نیند کی پری اُسے اپنی بانہوں میں لے لے لیکن وہ سوچ کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔سوچتے سوچتے رات کے دو بج گئے۔نیند اُس کی آنکھوں سے غائب تھی۔وہ بستر سے اُٹھا۔ اُس نے وضو کیا، اُس کے بعد اندھیرے میں اپنے مالک حقیقی کے آگے سر بسجود ہوا۔اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے یہ سوچتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔پھر اُس نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔

''اے خالقِ دو جہاں! اے مالکِ جن و انس! اے میرے رب! مجھے دُنیا و آخرت کی زندگی میں کامیاب کیجیے!''

یہ دُعا مانگنے کے فوراً بعد مصور القمر کو گہری نیند آ گئی۔اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے بارگاہِ الٰہی میں اُس کی دُعا مستجاب ہوئی۔

میرے پاپا

ڈاکٹر ہما عالم
(کینیڈا)

میرے پاپا ۱۶ مارچ ۲۰۲۲ کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

میرے پاپا ایک بہترین استاد، ایک فصیح و بلیغ ادیب، ایک منفرد شاعر اور ایک سچے نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محبت اور خیال رکھنے والے شوہر، ایک بہت ہی شفیق باپ، اور بہت ہی محبت کرنے والے دادا اور نانا بھی تھے۔

میرا اپنے پاپا سے ایک باپ بیٹی کے تعلق کے علاوہ ایک دوستی کا بھی تعلق تھا۔ میں جب بھی کینیڈا جاتی میرا سارا وقت ان کے ساتھ ہی گذرتا وہ اپنی کرسی پر بیٹھے اپنا لکھتے رہتے اور ساتھ میں مجھ سے باتیں کرتے رہتے۔ اب میں سوچتی ہوں کہ کاش ان لمحوں کو ہم قید کر سکتے، کاش وقت واپس آ سکتا۔

میرے پاپا کے بارے میں کیا لکھوں ایک یادوں کا خزانہ ہے جو آنکھوں کے آگے آجاتا ہے۔ میرے پاپا انتہاء شفیق، حلیم الطباع، نفیس اور سادہ مزاج تھے۔ ان کی اللہ اور رسولؐ سے محبت ان کے گفتار اور کردار دونوں سے نمایاں ہوتی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ ہمیں اللہ کے احکامات پر چلنے کی تلقین کی۔ انہوں نے ہمیں اسلام کے مطابق زندگی گزارنا سکھایا وہ ہمیشہ ہم کو یہی تلقین کرتے تھے کہ اپنی محنت پوری کرو اور باقی اللہ پر چھوڑ دو۔ پاپا نے بڑی سادگی سے زندگی گزاری، ان کی زندگی میں مادی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ انہوں نے لوگوں کی بے لوث خدمت کی۔ ہمیشہ سچ اور ایمانداری کا راستہ اپنایا۔

میرے پاپا درس و تدریس سے وابستہ تھے لیکن وہ اپنے اندر ایک درسگاہ تھے انہوں نے اپنے شاگردوں کی، اپنے رشتے داروں کی اور اپنے دوستوں کی بغیر کسی غرض کے رہنماء کی اور ان کی زندگیاں بدل دیں۔ اگر کبھی بھی کسی کو پڑھائی میں مدد کی ضرورت پڑی میرے پاپا نے بغیر کسی فیس کے پڑھایا۔

پاپا کے اندر علم کا ایک وسیع سمندر تھا ان کی ساری زندگی لکھنے پڑھنے میں گزری وہ انگریزی اور اردو لٹریچر کے انسائکلو پیڈیا تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی ڈالا اور ہمیشہ ہماری حوصلہ افزائی کی کہ ہم کچھ لکھیں۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ تو چلے گئے لیکن اپنی کتابوں میں زندہ جاوید ہو گئے۔

پاپا کے بارے میں لکھنے بیٹھی ہوں تو یادوں کے دریچے کھلنے شروع ہو گئے ہیں۔ بچپن میں پاپا کے ساتھ کتابوں کی دکان پر جانا اور پھر ہم سب بہن بھائیوں میں مقابلہ کہ کون پہلے کتاب ختم کرے گا بہت یاد آتا ہے۔ پاپا کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ صبح سویرے اٹھتے اور باغبانی کرتے جس کا ان کو بہت شوق تھا انہوں نے اپنا یہ شوق ہمارے اندر اتار دیا تھا، ہم سب بہن بھاء ان کا اس کام میں بھرپور ساتھ دیتے تھے۔ جب اسکول کالج کا زمانہ شروع ہوا تو پھر ہر قدم پر پاپا نے ہماری رہنمائی اور حوصلہ افزاء کی۔ پاپا نے ہم کو خود اعتمادی دی کہ ہم اپنے فیصلے خود کریں اور اس میں ہمارا پورا ساتھ دیا۔ پاپا کی عادت تھی کہ اکثر رات میں کھانے کے بعد سب کے دن کا حال پوچھتے اور اگر کوئی بھی مسئلہ ہوتا تو اس کے لیے مشورہ دیتے لیکن فیصلہ ہم پر چھوڑ دیتے۔

پاپا نے ہمارے اندر کتابوں سے محبت اور علم حاصل کرنے کی لگن پیدا کی۔

پاپا نے ہمارے علاوہ ہمارے بچوں کی بھی رہنماء کی اور ان کو بھی ادب آداب اور اچھے برے کی تمیز سکھائی۔

پاپا کے جانے سے ہم سب لوگوں کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسکا اظہار الفاظ سے ناممکن ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں، ہماری یادوں میں، ہمارے خوابوں میں اور اپنی کتابوں میں ہمیشہ جاوداں رہیں گے۔

اللہ تعالی میرے پاپا کو غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا کرے اور ہم سب بچوں کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

- بقیہ -

''فقط ایک آنسو''

کے بارے میں بدزبانی سے باز رہیں۔ اس پر مسعود صادق نے پرجوش لہجے میں کہا جو میرے جلسے میں ہنگامہ کرنے کی کوشش کرے میں اس کی زبان، پھر سنبھل کر کہا اس کی انگلی کاٹ دیا کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ماڈل ٹاؤن کا ایک مشہور کریکٹر عاشق لنگڑا بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا میرے پاس آیا، مجھے گندی گالیاں دیں اور پھر اپنے ساتھیوں کی مدد سے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ آمروں کے ساتھ میری کبھی نہیں بن سکی، ضیاء الحق کے مارشل لا کے پہلے مہینے ہی میں میرا ایک کالم ''کچا چنگچر'' شائع ہوا جس میں علامتی طور پر اس مارشل لا کے خوفناک نتائج کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اسی طرح ایک کالم ''وقت کا ضیاع'' اور اس نوع کے دیگر متعدد کالموں میں میں اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں تو ہفتے میں ایک آدھ کالم اس منحوس آمریت کے حوالے سے ہوتا تھا، اسی دور میں ان کالموں کا مجموعہ ''بارہ سنگھے'' شائع ہوا، بارہ کا ہندسہ بارہ اکتوبر کا اشارہ کر رہا تھا، جب ایک جمہوری حکومت کا تختہ الٹایا گیا تھا۔

مگر اب میں جوان نہیں رہا، پھر بھی کبھی کبھی عمرِ رفتہ کو آواز دینے کی کوشش کرتا ہوں، مگر عمرِ رفتہ کہاں واپس آتی ہے۔

☆

"کرگس کا جہاں"

اقبال کا دیس

امیر الاسلام ہاشمی
(۹۔جولائی ۱۹۳۲ء تا ۱۸۔مارچ ۲۰۱۳ء)

اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
دہقان تو مرکھپ گیا اب کس کو جگاؤں
ملتا ہے کہاں خوشۂ گندم کہ جلاؤں
شاہین کا ہے گنبدِ شاہی پہ بسیرا
کنجشک فرومایہ کو اب کس سے لڑاؤں
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
ہر داڑھی میں تنکا ہے، ہر ایک آنکھ میں شہتیر
مومن کی نگاہوں سے بدلتی نہیں تقدیر
توحید کی تلوار سے خالی ہیں نیامیں
اب ذوقِ یقیں سے نہیں کٹتی کوئی زنجیر
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
شاہیں کا جہاں آج گرگس کا جہاں ہے
ملتی ہوئی ملّا سے مجاہد کی اذاں ہے
مانا کہ ستاروں سے بھی آگے ہیں جہاں اور
شاہیں میں مگر طاقتِ پرواز کہاں ہے
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
مرمر کی سلوں سے کوئی بے زار نہیں ہے
رہنے کو حرم میں کوئی تیار نہیں ہے
کہنے کو ہر اک شخص مسلمان ہے، لیکن
دیکھو تو کہیں نام کو کردار نہیں ہے
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
بیباکی و حق گوئی سے گھبراتا ہے مومن
مکاری و روباہی پہ اتراتا ہے مومن
جس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا ڈر ہو
وہ رزق بڑے شوق سے اب کھاتا ہے مومن
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
پیدا کبھی ہوتی تھی سحر جس کی اذاں سے
اس بندہ مومن کو میں اب لاؤں کہاں سے
وہ سجدہ زمیں جس سے لرز جاتی تھی یارو!
اک بار تھا ہم چھٹ گئے اس بارِ گراں سے
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
جھگڑے ہیں یہاں صوبوں کے ذاتوں کے نسب کے
اگتے ہیں تہ سایۂ گل خار غضب کے
یہ دیس ہے سب کا مگر اس کا نہیں کوئی
اس کے تنِ خستہ پہ تو اب دانت ہیں سب کے
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
محمودوں کی صف آج ایازوں سے پرے ہے
جمہور سے سلطانیِ جمہور ڈرے ہے
تھامے ہوئے دامن ہے یہاں پر جو خودی کا
مرمر کے جئے ہے کبھی جی جی کے مرے ہے
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
دیکھو تو ذرا محلوں کے پردوں کو اٹھا کر
شمشیر و سناں رکھی ہیں طاقوں پہ سجا کر
آتے ہیں نظر مسند شاہی پہ رنگیلے
تقدیرِ امم سو گئی طاؤس پہ آ کر
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
مکاری و عیاری و غداری و ہیجان
اب بنتا ہے ان چار عناصر سے مسلمان
قاری اسے کہنا تو بڑی بات ہے یارو!
اس نے تو کبھی کھول کے دیکھا نہیں قرآن
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
کردار کا گفتار کا اعمال کا مومن
قائل نہیں ایسے کسی جنجال کا مومن
سرحد کا ہے مومن کوئی بنگال کا مومن
ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں قرآن کا مومن
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں

تمہیں تلاش کرتی ہوں

شاعرہ : اَنی سیجا کریپوِک (سربیہ)

مترجم : پرویز شہریار (دہلی)

زرد چیری کے چھکڑے پر
تمہیں تلاش کرتی ہوں
ایک خانہ بدوش گدیڑیا
بجھے ہوئے کوئلے کی راکھ سے روٹی کا گرم ٹکڑا لیے ہوئے
میں اس کی سیاہ ہتھیلی پر اسے پھینک دیتی ہوں تا کہ
صابن جیسی مہک اور دن بھر کی پکی ہوئی زرد چیریاں
پورے ایک مہینے تک محفوظ رہیں
ایک ریشمی شال اور جنگل کے کنارے دھند کے
خیمے کی طنابیں تنی ہوئی ہیں
جنگلی پھولوں کے درمیان ایک گدیڑیئے کے
حلف کو تمہارے باسکیٹ میں ہونا چاہیے
شہابِ ثاقب زوردار دھماکہ کے ساتھ میری
پیشانی سے ٹکرایا
بال بکھر جاتے ہیں
بھرپور آواز میں
میں تمہارے لیے بھرپور آواز میں گاتی ہوں،
پہاڑوں کے درمیان
میرے مقفل گھر سے جنگل کے کنارے تک
بہت دور سے ہی ہوائیں سیٹیاں بجائیں گی
شکستہ غرفے سے
شیطان کو مقفل گھر لے جانے دو
اور دونوں سنگی زینے اور جہاں
احتمال ہے کہ انھیں
مٹی کے اندر دفنایا گیا ہے
اور گیلی مٹی سے
ڈھانپ دیا گیا ہے
گھٹنوں تک
میں سیاہ سرخ آگ کی بپھرتی ہوئی
لپٹوں کے بیچ چلتی ہوں
زرد چیریاں،
تمہیں جنم دینے کی بددُعا کے پیچھے
کسی نئے جنگل کی خوشبو سے بھیگی ہوئی
گرد سے لدی سڑکیں
ریشمی شال کے اوپر
گھوڑے کے سائبان کے نیچے
درخت کی شاخوں سے آگ پر کوڑے برساؤ
چبھنے والی کوشاوا (جنوبی یخ بستہ ہوا) کی
سیٹی کی آواز کے زیر اثر
جنگل کی نصف شب میں ذرا میری طرف دیکھو
میرے اندر زرد چیری نے عورت کو جگا دیا ہے
میری کالی آنکھوں کو سیاہ رات میں تلاش کرو
پستان کی بالائی گدراہٹ
جیسے کوئی سفید گھوڑیاں ہوں
میری ران کی کمان کو کھینچو اور بہترین گھوڑے پیچو
دھند کے خیمہ میں ہم ایک ساتھ بہت شادکام ہیں
جہاں سے ٹوٹ کے گرتے ہوئے
ستارے کی غبارِ راہ نظر آتی ہے
بیواؤں —— جنون میں آجاؤ!

تکلفات

نسیم عزیزی
(کولکاتا)

فسوں کاری_ شہرت
جاہ وحشمت، کچھ نہیں
میں کچھ نہیں ہوں،
فریب ومکر کی چالوں سے آلودہ
مرے کردار کا آرائشی چہرہ
تعجب ہے!
'مجھے تم نے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے!'
نگاہ_ خوش عقیدت،
میری ذات_ کینہ پرور کو
دیار_ علم وفن کی
معتبر ہستی سمجھتی ہے
جہان_ خاک میں،
فرش_ زمیں پر ہوں
میں اک کنجشک کی صورت
مگر احباب.....
جوش_ عزت وتکریم میں اکثر
جبین_ آسماں کو چومنے والا
کوئی طائر سمجھتے ہیں
انھیں محسوس ہوتا ہے
مری پرواز کا محور
ہواؤں میں، خلاؤں میں
ستاروں کے جہانوں میں
جہاں جا کر پر_ پرواز میرے
شہ پر_ تنویر میں تبدیل ہوتے ہیں

میں اپنے دوستوں کی کور چشمی پر
بہت حیران ہوتا ہوں
وہ میرے اصلی چہرے سے نہیں واقف
مجھے یہ فکر،
وہ معصوم سی آنکھیں
عقیدت اور محبت کے
فریب_ حسن میں کھو کر
سیاسی شعبدہ بازی،
ریاکاری ومکاری کے شیطانی اثر میں
آ ہی جاتی ہیں
ذرا سی خاک ساری کا دکھاوا
دوستوں کی سجدہ ریزی کا وسیلہ ہے!!
زمیں کی گود میں جیسے
فلک سر رکھ کے سوتا ہے
طلسم_ خوش نگاہی نے
مری آنکھوں پہ فی الواقع
جو پردہ ڈال رکھا ہے
مجھے ہم دوش_ چرخ_ آسماں کر کے
نہ جانے مجھ سے کیوں آنکھیں چراتا ہے
حقیقت میں تو مشت_ خاک ہوں
خاک_ زمیں ہوں
کچھ نہیں ہوں!!!

○

عورت

رضیہ اسماعیل
(یو۔کے)

کہا کیوں یہ تری بندی زمانے میں اکیلی ہے
جواب آیا، تری تنہائی ہی تیری سہیلی ہے

کہا عورت کو کیوں سمجھا نہیں ہے آج تک کوئی
جواب آیا، کہاں سمجھیں گے عورت تو پہیلی ہے

کہا نازک مرے جذبے مگر اونچے ہمالہ سے
جواب آیا کہ تو ماں ہے کوئی چمپا چنبیلی ہے

کہا وہ بے اماں بچے جو پلتے ہیں یتیمی میں
جواب آیا کہ تو خوش بخت ہے آنگن میں کھیلی ہے

کہا جب ہم سفر رستے میں کھو جائے تو پھر کیا ہو
جواب آیا، تری اولاد ہی تیری سہیلی ہے

کہا اولاد کا تحفہ تو ملتا ہے نصیبوں سے
جواب آیا کہ عورت پھر اکیلی ہی اکیلی ہے

○

سیلاب کے بعد

فیصل عظیم
(کینیڈا)

پانی اچھا خاصہ گلے تک آ پہنچا تھا
اچھی خاصی ڈوب گئی تھی ساری بستی
اچھا خاصہ اک سیلاب تھا، پانی اُترا
بھیگے جسم پہ چپکے کپڑوں
اور خاشاک کا منظر اُبھرا
پانی کیا اُترا، تنہائی اُبھر آئی ہے
وہ جو نہیں تھا،
وہ بھی جیسے سیلِ رواں کے ساتھ گیا ہو
گلیوں میں بے جان بدن ہیں،
یا سنّاٹا تیر رہا ہے

تعاقب

میں اپنے پیچھے پیچھے چل رہا تھا
بڑھا کر ہاتھ جو شانے پہ رکھا
تو اک لمحے کو سارا جسم جیسے جم گیا ہو
پلٹ کر دوسرے لمحے جو دیکھا
تو کوئی آئینہ رکھا نہیں تھا
وہاں کوئی نہیں تھا

○

نوید سروش

(میر پور خاص)

اثاثہ

(نثری نظمیں)

اس کمرے سے تم
سب کچھ لے جا چکی ہو
میری کرسی میز
برسوں میں جمع کی گئیں
میری کتابیں
دردوغم سے آراستہ
میری غزلوں کی بیاض
میرا قلم
میرے خواب
میری خواہشات
صرف میرے پاس تنہائی تھی
آج وہ بھی
تمہیں امانتاً سونپے جا رہا ہوں

احساس

اگر خوب صورت سی دنیا ہے درکار
تو ایسا کرو تم
مجھے اپنی آنکھوں کے اندر بسالو
مجھے اپنی سانسوں میں تحلیل کرلو
مری مورتی کو رکھو طاقِ دل میں
مکرر، جہاں کو پھر اک بار دیکھو
یہاں تمہیں ذرہ ذرہ
حسیں اور دل کش سا محسوس ہوگا
تمہارے تصور کا ملبوس ہوگا

قطعات

ارضِ پاک

یہ ارضِ پاک تھا تحفہ خداوندِ دو عالم کا
اِسے برباد کر کے رکھ دیا ہے رہنماؤں نے
تو خلاّقِ جہاں ہے پھر کوئی جنّاح پیدا کر
دیا ہو جس کو پھر جذبہ تری غیبی صداؤں نے

حافظ محمد احمد

(راولپنڈی)

پھونس کا چھپر

جلتے گھر کو دیکھنے والو! پھونس کا چھپر آپ کا ہے
آگ کے پیچھے تیز ہوا ہے آگے مقدر آپ کا ہے
اس کے قتل پہ میں بھی چپ تھا میرا نمبر اب آیا
میرے قتل پہ آپ بھی چپ ہیں اگلا نمبر آپ کا ہے

ڈاکٹر نواز دیوبندی

(بھارت)

رنج والم

ختم اب ہونے کو ہیں اس قوم کے رنج والم
کچھ دنوں کی بات ہے رہنا ہے اب ثابت قدم
اب یہی صورت ہے، ہر تدبیر ان کی خاک ہو
کنوئیں سے مُردے نکالو، تاکہ پانی پاک ہو

عبدالرحمٰن عبد

(نیویارک)

ایک صدی کا قصّہ

شیام

دیپک کنول (ممبئی)

بمبئی میں لیڈی جمشید جی روڈ پر ایک بلڈنگ ہے جس کا نام ہائی عیسٹ ہے۔ایک زمانے میں دو دوست اسی بلڈنگ کی سیڑھیوں پر گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ان میں سے ایک نامی اُردو رائٹر تھا جب کہ دوسرا فلموں میں نام کمانے کے لئے جد و جہد کر رہا تھا۔ یہ دو دوست تھے، سعادت حسن منٹو اور فلم ایکٹر شیام سندر چڈھا۔ان کی دوستی کا یہ عالم تھا کہ یہ ایک ہی اپارٹمنٹ میں ساجھے میں رہ رہے تھے۔ان کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ دو جسم ایک جان ہیں۔ منٹو کا کہنا تھا کہ اُس کی بیشتر کہانیوں کا محرک شیام ہے۔شیام کو منٹو نے اپنی کتاب ''مرلی کی دھن'' میں جس طرح خراج عقیدت پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

شیام جس کا پورا نام شیام سندر چڈھا تھا 20 فروری 1920 کو سیالکوٹ کے سیتا رام چڈھا کے یہاں پیدا ہوا۔سیتا رام چڈھا سرکاری ملازم تھا۔ اُس کی ماں چرن دیوی بڑی ہی خوبصورت اور دراز قد خاتون تھیں۔شیام کے نین نقوش اور اُس کا قد ماں سے میل کھاتا تھا۔بدقسمتی سے اُسے ماں کا سایہ زیادہ دنوں تک نصیب نہ ہوا۔جب وہ پانچ سال کا تھا تو ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا۔اُس کے بعد اُس کے باپ نے دوسری شادی کی۔وہ چار بھائیوں اور ایک بہن میں سب سے بڑا تھا۔حالانکہ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوا مگر راولپنڈی میں پلا بڑھا۔یہیں پر اُس نے ابتدائی تعلیم پوری کی۔شیام کا دادا گاؤں کا پٹواری تھا جب کہ اُس کا باپ انڈین میڈیکل سروس کے ایک اسپتال کا اسٹور کیپر تھا۔چونکہ اُس کا باپ صحت عامہ کے پیشے سے جڑا ہوا تھا اسلئے اُسے موضع در موضع گھومنا پڑتا تھا۔شیام باپ کے ساتھ کئی قصبوں میں گھوما پھرا۔جن دنوں اُس نے گورڈن کالج میں داخلہ لیا، اُس کا رجحان فلموں کی طرف بڑھنے لگا۔وہ کالج کے مباحثوں میں حصہ لیتا تھا اور اکثر انعام حاصل کرتا تھا۔کئی سال تک وہ کالج کے ڈرامیٹک کلب کا صدر بھی رہا۔گھوڑ سواری اور ٹینس کے کھیل میں بھی وہ خوب ماہر ہو چکا تھا۔جیسے ہی اُس نے گریجویشن راولپنڈی کے گورڈن کالج سے پوری کی تو اُس کے والد اُس کے لئے سرکاری ملازمت تلاش کرنے لگے۔چونکہ وہ خود سرکاری ملازم تھے اور چاہتے تھے کہ شیام بھی کوئی سرکاری نوکری کر لے جب کہ شیام کو سرکاری ملازمت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔شیام نے بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری نہیں کرے گا۔آخر کار اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے گا پر یہاں بھی کوئی اڑچن آڑے آ گئی۔اُس نے اپنا جیب خرچ پورا کرنے کے لئے ایک انگریزی اور ایک اُردو اخبار میں ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کیا۔اسی دوران ایک دن اُسکی نظروں سے اخبار میں چھپا بمبئی ٹاکیز کا ایک اشتہار گزرا جس میں اُنہیں ایک ایکٹر اور ایک ایکٹریس کی تلاش تھی۔خواہش مند اُمیدواروں سے اپنا فوٹو گراف اور ایک عرضی بھیجنے کی ہدایت کی گئی تھی۔شیام کے دوستوں نے بھی یہ اشتہار پڑھا تھا اور اُنہوں نے شیام کو مجبور کیا کہ وہ بھی اپنا فوٹو گراف بھیج دے۔ دوستوں کے اصرار پر شیام نے اپنی تصویر اور ایک عرضی بھیج دی۔چند روز بعد جب اُسے ایک چٹھی ملی جسے دیکھ کر اُس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔یہ چٹھی بمبئی ٹاکیز کی طرف سے آئی تھی اور شیام کو سکرین ٹسٹ کے لئے بمبئی بلایا گیا تھا۔شیام اُن پانچ خوش قسمت نوجوانوں میں سے ایک تھا جنہیں بمبئی ٹاکیز کے اسٹاف نے پانچ ہزار درخواستوں میں سے چنا تھا۔شیام کے والد فلموں میں کام کرنے کے بہت خلاف تھے۔وہ کسی بھی حال میں بمبئی پہنچنا چاہتا تھا۔پر مسلہ ذادراہ کا ہی نہیں باپ کو منانے کا بھی تھا۔وہ باپ کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔اس مشکل کو اُس کے چاچا تارا چند چڈھا نے آسان کر دیا جو کہ برطانوی فوج میں صوبیدار تھا۔اُس نے شیام کو بمبئی جانے کے لئے نہ صرف پیسے دئے بلکہ گھر والوں کو بھی اس بات کے لئے منا لیا کہ وہ شیام کو اپنے خواب پورے کرنے سے نہ روکیں اور اُسے بمبئی جانے دیں۔

وہ جب بمبئی پہنچا تو بمبئی ٹاکیز نے اُسکا اسکرین ٹسٹ لیا جس میں وہ فیل ہو گیا۔اُسکے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔وہ اُن کے سامنے گڑگڑایا کہ اُسے کوئی کام دیا جائے۔اُنہوں نے یہ کہہ کر اُس سے پینڈا چھڑا لیا کہ فی الحال اُن کے پاس اُس کے لائق کوئی کام نہیں ہے۔شیام کی خوشی غم اور پریشانی میں بدل گئی۔اُس نے کئی فلم کمپنیوں کی خاک چھانی مگر اُسے کہیں کام نہ ملا۔وہ بمبئی سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔وہ کیا کرے کہاں جائے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔بالآخر اُس نے گھر لوٹنے کا فیصلہ کیا۔فلموں میں کام کرنے کی للک اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔آخر کچھ روز اپنے گھر میں گزارنے کے بعد اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لاہور جائے گا اور وہاں قسمت آزمائی کرے گا۔

اُس نے لاہور آ کر ہدایت کار جے کے نندہ کے ساتھ بطور معاون ہدایت کار کے کام کیا۔اسی دوران اُسے ایک پنجابی فلم میں کام کرنے کی پیشکش ملی۔اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔اُس نے جھٹ سے فلم سائن کی۔اس فلم کا نام ''گوانڈی'' تھا اور یہ پنجابی میں بن رہی تھی۔اس فلم میں نامی کلاکار کام کر رہے تھے جن میں وینا اور منورما اُس کے مدمقابل تھیں جب کہ اس میں دیگر کام کرنے والوں میں ایس ڈی نارنگ، آشا پوسلے اور اُس وقت کے بہت بڑے اداکار ایم اسماعیل بہت اہم کردار میں جلوہ افروز ہو رہے تھے۔یہ فلم خاصی کامیاب رہی۔اس فلم کی کامیابی کے ساتھ ہی وہ بمبئی کے لئے راوانہ ہوا کیونکہ اُسکی اصلی منزل لاہور نہیں بلکہ بمبئی تھی۔بمبئی میں اُس کی ملاقات اپنے زمانے کے نامی فلم ساز اور ہدایت کار کے سی تلوار سے ہوئی۔تلوار اُن دنوں ایک ہندی فلم ''خاموشی'' بنا رہے تھے۔اُس نے اُسے ایک رول کی پیشکش کی جسے اُس نے بخوشی قبول کیا۔ اپنی پہلی پنجابی فلم ''گوانڈی'' جو کہ 1942 میں ریلیز ہوئی اور بیحد کامیاب رہی تھی اس کی کامیابی کے باوجود اُس نے ''خاموشی'' میں اداکارہ وینا کے مقابل ایک معاون کردار کرنے سے انکار نہ کیا۔اس فلم سے شیام کو پہچان ملی اور فلم سازوں

نے اُس کی صلاحیتوں کو پہچاننا شروع کیا۔

اس فلم کے بعد اُسنے کم لاگت کی دو ہندی فلموں میں کام کرنا شروع کیا ۔ان فلموں کا نام تھا ''بھلائی ا''اور ''مذاق''۔جو کہ 1943 میں ریلیز ہوئیں۔وہ شوٹنگ میں مصروف تھا کہ اُسے یہ روح فرسا خبر ملی کہ اُسکے والد کا انتقال ہوگیا ہے۔وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راولپنڈی پہنچ گیا اور کئی مہینوں تک وہ اسی شہر میں رہا۔آخر فلمی دنیا سے اتنی دیر تک لاتعلق ہونے کے باوجود اُسے شالیمار فلمز کی طرف سے ایک فلم میں کام کرنے کا بلاوا آ گیا۔اس فلم کا نام ''من کی جیت '' تھا۔ اس کی کہانی تھامس ہرڈی کے ناول Tess of the D'Urbevilles پر مبنی تھی۔اس کے ہدایت کار ڈبلیو زیڈ احمد تھے۔اس فلم میں اُس کے ساتھ کام کرنے والے اہم کردار میں ہدایت کار کی بیوی نینا اور راجکماری تھے۔یہ فلم 1944 میں ریلیز ہوئی اور شیام کے لانبے قد اور اُس کے دلکش نین نقوش کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔اس کے بعد اُس نے دو فلمیں کیں۔ دونوں فلمیں باکس آفس پر ناکام رہیں ۔ یہ فلمیں تھیں ''روم نمبر 9'' جو کہ ایک سسپنس تھرلر تھی اور اس فلم میں اُس کے دیگر کلاکاروں میں گیتا نائلی اور کے این سنگھ تھے جب کہ دوسری فلم خواجہ احمد عباس کی ''آج اور کل'' تھی جو کہ بالترتیب 1946 اور 1947 میں ریلیز ہوئیں۔''من کی جیت'' سے اُس نے جس طرح کامیابی کا مزہ چکھا تھا ان دو فلموں کی ناکامی نے اُس کے لئے بدمزگی پیدا کی۔

اسی بیچ ملک کا بٹوارہ ہوا۔بٹوارے نے فلمی دنیا کو بری طرح متاثر کر دیا کیونکہ فلم والوں کے لئے بمبئی جتنا اہم تھا ویسے ہی اُن کے لئے لاہور تھا کیونکہ بہت سارے بڑے فلم سازوں کے دفتر لاہور میں تھے۔ایک دن شیام منٹو سے ملنے گیا۔وہ کافی تناؤ میں تھا۔باتوں ہی باتوں میں اُس نے اُسے اپنے چند رشتہ داروں کی دل دہلانے والی روداد سنائی جو کہ ابھی تک پاکستان میں پھنسے تھے اور اُنہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جارہی تھیں۔منٹو اندر سے دہل کے رہ گیا۔اُس نے سوچا کہ کہیں کل کو اگر ہندو بھی مسلمانوں سے بدلہ لینے لگے تو وہ کیا کرے گا۔تب اُسے کون بچائے گا۔بس یہی سوچ کر اُس نے ہندوستان کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

ایک طرف بٹوارے نے دلوں کے ٹکڑے کر ڈالے تھے تو وہیں دوسری طرف شیام کی قسمت نے ایک دم کروٹ لی۔جس بمبئی ٹاکیز نے شیام کو پہلے اسکرین ٹسٹ میں فیل کیا تھا اُسی کمپنی نے اُسے دوبارہ اسکرین ٹسٹ کے لئے بلایا۔اس بار وہ اسکرین ٹسٹ میں پاس ہوگیا تھا اور بمبئی ٹاکیز نے اُسے اپنی اگلی فلم ''مجبور'' کے لئے سائن کیا۔اس فلم میں اُسکے مدمقابل منور سلطانہ تھی۔اس فلم کا ہدایت کار نظیر اجمیری تھا۔سنگیت کی ذمہ داری ماسٹر غلام حیدر کو سونپی گئی تھی۔یہ وہی فلم ہے جس میں ماسٹر غلام حیدر نے لتا منگیشکر سے پہلا گانا گوایا تھا۔اس فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے اور شیام کو موتی لال،اشوک کمار جیسے اول نمبر کے اداکاروں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا۔یہ فلم 1948 میں ریلیز ہوئی ۔اس کے کام کو دیکھ کر اُس وقت کے مشہور جرنلسٹ ''فلم انڈیا'' کے بابوراو پٹیل نے اُس کی اداکاری کی کافی سراہنا کی تھی ۔بابو راو پٹیل جرنلزم کی دنیا کا ایک معتبر نام تھا اور جس کے لیکھ کافی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔اُس نے فلم ''مجبور'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس میں شک نہیں کہ اس فلم میں چندھو کا کردار تخلیق کرنے والا رائٹر اور اس کردار کو پردے پر اُتارنے والا ڈائرکٹر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے ایسا جیتا جاگتا کردار ہمارے سامنے پیش کیا مگر سب سے زیادہ تعریف کا مستحق شیام ہے جس نے اس کردار کو اس سچائی اور ایمانداری کے ساتھ پیش کیا کہ فلم بینوں کو یہ کردار حقیقی لگا۔اُس نے جس طرح اس کردار میں رنگ بھرے وہ قابل تحسین ہے۔وہ وقت دور نہیں جب وہ موتی لال اور اشوک کمار کا متبادل ثابت ہوگا۔بابوراو پٹیل جیسے سخت گیر فلمی نقاد سے شیام کے لئے اس طرح کی تعریف نے شیام کا رتبہ کافی بڑھا دیا۔

اسی سال اُس کی ایک اور فلم ''شکایت'' بھی ریلیز ہوئی۔یہ فلم شاہد لطیف کی ہدایت میں بنی تھی جسمیں اُس کی ہیروئن سنہیہ پر بھاپردھان تھی۔یہ فلم بھی بیحد کامیاب رہی۔دو فلموں کی کامیابی نے شیام کی مانگ اسقدر بڑھا دی کہ اُسکے گھر کے باہر فلمسازوں کی لائن لگ گئی۔اُس نے دھڑا دھڑ فلمیں سائن کیں۔

شیام کے گہرے دوستوں میں منٹو اور کرشن چندر سرفرست تھے۔منٹو سے اُس کی قربت اس حد تک تھی کہ اُسکی کوئی بھی بات شیام سے چھپی ہوئی نہیں تھی ۔وہ اُسکی سبھی ضرورتوں سے واقف تھا اسلئے جب اُسکے مالی حالات اُستوار ہوئے تو وہ بہانے بہانے سے منٹو کی مالی مدد کرتا رہا۔منٹو نے جب پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تو شیام کو بڑا گہرا دھچکا لگا۔اُس نے ہی نہیں بلکہ اشوک کمار نے بھی اُسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔یہ شیام تھا جو اُسے چھوڑنے کے لئے بمبئی کے ڈاک یارڈ تک اُس کے ساتھ چلا اور اُسے سمندری جہاز میں بٹھا کر تب تک وہاں کھڑا رہا اور جب تک جہاز وہاں سے روانہ نہ ہوا تو شیام نے ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا کیونکہ اُس کا دل ریزہ ریزہ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے اشک باری ہو رہی تھی۔منٹو کا چلے جانا اُس کے لئے کافی دکھدائی تھا کیونکہ یہ منٹو ہی تھا جس نے اُسکے جدوجہد کے دنوں میں اُسے سنبھالا تھا۔اُن کی دوستی اس حد تک تھی کہ منٹو جس اپارٹمنٹ میں رہتا تھا وہاں اُس نے شیام کو بھی اپنے ساتھ کئی مہینوں تک رکھا۔وہ اُسے نئی نئی کہانیاں سُناتا رہتا تھا۔منٹو کے پاکستان منتقل ہونے کے بعد شیام اُس سے ایک دن کے لئے بھی غافل نہ رہا۔وہ اُسے مسلسل خط لکھتا رہتا تھا اور اپنے پاکستانی ڈسٹری بیوٹروں کو یہ پیغام بھیجتا تھا کہ وہ اُسکی اور سے اُس تک مالی مدد پہنچائیں تا کہ اُس کے بچوں اور بیوی کو تنگی ترشی سے نہ گزرنا پڑے۔

شیام کے دوستوں کا حلقہ زیادہ وسیع نہ تھا۔منٹو،کرشن چندر، گیت کار راجندر کرشن،راجہ مہدی علی خان اور اداکار اوم پرکاش اُس کے بہت ہی قریبی اور گہرے دوست تھے۔اوم پرکاش سے اُس کی دوستی کی شروعات لاہور سے ہوئی تھی اور وہ اتنی گہری ہوتی چلی گئی کہ جب اوم پرکاش نے بمبئی کے چمبور میں ایک بنگلہ خریدا تو شیام نے ٹھیک اُسکے مقابل اپنا بنگلہ خریدا۔یہی حال کرشن چندر کا تھا۔وہ بھی شیام سے اس قدر متاثر تھا کہ اُس نے اُس پر کئی کہانیاں لکھ ڈالیں۔شام کو یہ سب یار دوست شیام کے بنگلے پر اکھٹا ہوتے تھے اور پھر دیر گئے تک محفل جمی رہتی تھی۔

1949 شیام کے لئے ایک ریکارڑ توڑ سال تھا۔اس سال اُسکی نو فلمیں ریلیز ہوئیں۔یہ فلمیں تھیں کے امرناتھ کی ''بازار''''چاندنی رات''''چار دن'' ''دادا''''ناچ''''کنیز''''پتنگا''''رات کی رانی''اور''دل لگی''۔''دل لگی'' کاردار فلمز کی تصویر تھی جس میں ثریا کے مقابل شیام کو پیش کیا گیا تھا۔اس فلم کا موسیقار نوشاد تھا جس نے اس فلم کو بے مثال اور یادگار سنگیت سے سجایا تھا۔اس فلم میں کل بارہ گانے تھے جن میں سے دو گانے شیام نے ثریا کے ساتھ گائے تھے۔''تو میرا چاند میں تیری چاندنی''اور''ظالم زمانے مجھ کو.....''میں جو مردانہ آواز تھی وہ شیام کی تھی۔اس فلم کے سبھی گانے ہٹ ثابت ہوئے تھے۔اس فلم نے اُس زمانے میں ریکارڑ توڑ بزنس کیا تھا۔فلم''پتنگا''ایچ ایس رویل کی فلم تھی جس میں شیام کے ساتھ نگار سلطانہ، یعقوب اور گوپ بھی اہم کرداروں میں جلوہ افروز تھے۔اس فلم کو راجندر کرشن نے لکھا تھا اور اسے سنگیت سے سی رامچند رنے آراستہ کیا تھا۔یہ وہ فلم ہے جس میں راجندر کمار نے ایک چھوٹا سا رول ادا کیا تھا۔اس فلم کے ایک گانے نے اُس دور میں تہلکہ مچا دیا تھا جسے شمشاد بیگم نے گایا تھا۔گانا تھا، ''میرے پیا گئے رنگون۔وہاں سے کیا ہے ٹیلفون''۔یہ فلم بھی بیحد کامیاب رہی تھی۔ایک اور فلم تھی جس کا نام''کنیز'' تھا جس کے فلمساز اور ہدایت کار کرشن کمار تھے۔اس فلم کے اداکاروں میں شیام، منور سلطانہ، کلدیپ کور، رمیش سنہا، اُرملا دیوی اور تیواری قابل زکر ہیں۔اس فلم میں ایک نہیں تین تین سنگیت کاروں نے کام کیا تھا۔ماسٹر غلام حیدر، ہنس راج بہل اور او پی نیر۔غلام حیدر اور ہنس راج بہل نے مل کر گانے تیار کئے تھے جب کہ او پی نیر نے اس فلم کو پس منظر کی موسیقی سے آراستہ کیا تھا۔یہ بھی کامیاب فلم تھی۔اسی طرح کے امرناتھ کی فلم''بازار'' بھی اچھے سٹار کاسٹ والی فلم تھی جسمیں نگار سلطانہ شیام کی ہیروئن تھی جب کہ یعقوب، گوپ، ککو اور بدری پرساد معاون کلاکاروں میں شامل تھے۔اس فلم میں بھی دو موسیقاروں نے کام کیا تھا۔شیام سندر اور حسن لال بھگت رام۔اس فلم کا سنگیت بھی کافی مقبول ہوا تھا۔''ساجن کی گلیاں چھوڑ چلے''لتا منگیشکر کا ایک یادگار گانا ہے جسے موسیقار شیام سندر نے لے بخشی تھی۔''رات کی رانی''میں منور سلطانہ، اوم پرکاش، مدن پوری، چمن پوری اور جگدیش سیٹھی شیام کے معاون کلاکار تھے۔اس فلم کے سنگیت کار ہنس راج بہل تھے اور اس کے گانے بھی کافی پسند کئے گئے تھے۔

شیام ایک دل پھینک نوجوان تھا۔شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ اداکارہ نگار سلطانہ سے معاشقہ لڑاتا رہا جس نے اُس کے ساتھ کئی فلموں میں کام کیا تھا۔جیسے''شکایت''''پتنگا''''سنگیتا''اور''بازار''۔نگار سلطانہ بڑی ہی خوبصورت اور پرکشش عورت تھی۔دونوں کچھ عرصے کے لئے ایک دوسرے کے بیحد قریب رہے۔اس کے بعد آئی رمولا۔اُس سے بھی کچھ عرصے کے لئے شیام کا رومانس چلتا رہا۔پھر آئی کلدیپ کور جس نے اُس کے ساتھ کئی فلموں میں کام کیا تھا۔کلدیپ کور کو پٹانے کے لئے وہ لوکل ٹرین کے فسٹ کلاس ڈبے میں سفر کر کے اُسے رجھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا مگر کلدیپ کور نے اُسے ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ایک دن دونوں میں کسی بات کو لے کے جھگڑا ہوا۔جھگڑا اتنا بڑھا کہ شیام جیسے کلدیپ کور کو تھپڑ مارنے کے لئے آگے بڑھا تو اُس نے اپنا ہاتھ کہیں اور مارا جس سے اُس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔

شیام اپنے آپ کو اپنی مادری زبان پنجابی کا زیر بار سمجھتا رہا کیونکہ اُس نے اپنے کیریر کی شروعات ہی پنجابی فلم سے کی تھی جو بیحد کامیاب رہی تھی۔وہ اپنی طرف سے اپنی مادری زبان کو کچھ دینا چاہتا تھا اسلئے اُس نے ایک پنجابی فلم بنانے کا فیصلہ کیا جس کا نام''بھیا جی'' تھا۔اس فلم میں ٹائٹل رول ادا کرنے کے لئے شیام نے اوم پرکاش کو سائن کیا۔راج رنگ فلمز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کا پرڈیوسر شیام تھا جب کہ اوم پرکاش اداکاری کے ساتھ ساتھ ہدایت کاری کی کمان بھی سنبھال رہا تھا۔اس فلم میں اوم پرکاش کے علاوہ شیاما مجنوں، سوریا چودھری، سریش، راج مہرہ اور ککو کام کر رہے تھے۔فلم کا سنگیت کار ونود تھا۔یہ فلم 1950 میں ریلیز ہوئی اور سپر ہٹ رہی۔

1950 میں شیام نے کئی ہٹ فلمیں دیں۔ان میں ایک فلم ''سادھی'' تھی جس کا اصلی ہیرو اشوک کمار تھا مگر شیام کا بھی اس میں متوازن رول تھا۔یہ پہلی جاسوسی تھرلر تھی جس میں ٹلنی جیونت ایک اہم کردار میں تھی اور شیام اس میں ایک منفی رول ادا کر رہا تھا۔اُس کے سبھی یار دوست اُس سے اس بات پر خفا تھے کہ بطور ہیرو اتنی کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ ایک منفی رول کیوں کر رہا ہے تو شیام کا جواب تھا کہ یہ کردار بے شک منفی ہے مگر کافی جاندار ہے۔اصل میں اُس کی سوتیلی ماں نے اُسے یہ کردار ادا کرنے کے لئے منایا تھا۔شیام ایسا عظیم انسان تھا جو اپنی سوتیلی ماں اور اپنے سوتیلے بھائی بہنوں کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔اس فلم کو رمیش سہگل ڈائرکٹ کر رہا تھا۔وہ شیام کو اس کردار کے لئے چاہتا تھا۔پہلے تو شیام نے یہ کردار ادا کرنے سے منع کر دیا۔مایوس ہو کر رمیش سہگل نے اُس کی ماں سے رجوع کیا، جب ماں نے اُسے یہ فلم کرنے کے لئے کہا تو اُس نے چپ چاپ فلم سائن کر لی۔اس فلم کی موسیقی سی رامچند رنے ترتیب دی تھی۔اس کے سبھی گانے کافی مقبول ہوئے تھے۔خاص کر یہ گانا''گورے گورے اے دل کے چھورے کبھی میری گلی آنا رے''۔اس گانے نے تو دھوم مچا دی تھی۔یہ فلم بیحد کامیاب رہی۔

شیام کی جو فلمیں اس سال ریلیز ہوئیں ان کے نام ہیں''چھوٹی بھابی''''مینا بازار''''نردوش''''سنگیتا''''سورج مکھی''''وفا''اور''کالے بادل''فلم''کالے بادل''اور''شبستان'' دو فلمیں تھیں جن کی شوٹنگ بڑے شدومد سے جاری تھی۔

شیام کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ رہی۔1940 میں وہ لاہور میں زیب قریشی کی چھوٹی بہن ممتاز قریشی سے ملا تھا۔زیب قریشی ایک فلمی اداکارہ تھی جس نے فلم''انوکھی ادا''''بھول بھلیاں''''ڈائرکٹر''اور''نوجوان''میں کام کیا تھا۔ممتاز اُسی کی چھوٹی بہن تھی وہ بھی فلموں میں کام کرنے کی خواہش مند تھی۔ممتاز جسے لوگ پیار سے تاجی کہہ کر بلاتے تھے بہت ہی خوبصورت تھی۔شیام کو پہلی ہی نظر میں ممتاز سے پیار ہو گیا۔۔شیام اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔وہ اُس کے

لئے تیار نہ تھی۔اُن کی شادی تب ہوئی جب ممتاز لاہور سے بمبئی منتقل ہوئی۔اُن کے یہاں 13 جون 1946 کو ایک بچی نے جنم لیا جس کا نام اُنہوں نے ساحرہ رکھ دیا۔شیام کی جان ساحرہ میں بسی ہوئی تھی۔وہ ہمیشہ اُس کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔وہ اُسے خوب پڑھانا لکھانا چاہتا تھا۔اُسے پڑھائی کے لئے انگلینڈ یا امریکہ بھیجنا چاہتا تھا۔افسوس کہ اُن کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ رہی۔کہا جاتا ہے کہ شیام بلا کا مے نوش تھا اور ساتھ ہی اپنی ہیروئنوں کے ساتھ اُسکی نزدکیاں ممتاز کو کافی بے چین اور پریشان کر دیتی تھیں۔اصل میں اُسے ادھر اُدھر منہ مارنے کی عادت تھی۔ممتاز کو اُس کی یہ عادتیں پسند نہ تھیں اور وہ اپنی بیٹی کی پیدائش کے بعد شیام کا گھر چھوڑ کر اپنی بہن کے ساتھ رہنے لگی۔

اپریل 1951 کا سال تھا۔وہ فلم ''شبستان'' کی شوٹنگ چائنا کریک گوڈ بندر میں کر رہا تھا۔یہ فلمستان کی فلم تھی۔جس میں اُس کے مقابل پری چہرہ نسیم بانو تھی۔اس فلم میں ایک ایکشن سین تھا جس میں ہیرو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہے اور کئی سارے لوگ گھوڑوں پر اُس کا تعاقب کر رہے ہیں۔بدقسمتی سے شیام کا گھوڑا بدک گیا اور شیام گھوڑے سے گر گیا۔اُس کا ایک پاوں رکاب میں پھنس گیا اور گھوڑا اُسے گھسیٹتے ہوئے دور تک لے گیا۔اُس کا سر پھٹ چکا تھا۔اُسے گھوڑے کے چنگل سے جس وقت چھڑایا گیا ہونی اپنا کام کر گئی تھی۔شیام کا انتقال ہو چکا تھا۔بتیس سال کی عمر میں شیام نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا تھا۔جب اُس کی موت کی خبر پھیل گئی تو اُس کے چاہنے والوں نے ٹرینوں کی زنجیریں کھینچ کر انہیں رکوایا اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں اُسکی ارتھی کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے سون پور شمشان گھاٹ جو کہ کنگس روڈ کے پاس ہے پہنچ گئے اور اُسے اشک بار آنکھوں سے رخصت کیا۔فلم انڈسٹری میں صف ماتم بچھ گیا۔شیام کا اس طرح جوان مرگ ہونا ناقابل یقین تھا۔منٹو جو کہ ایک پاگل خانے میں اُس وقت زیر علاج تھا جب اُس نے یہ خبر پڑھی تو اُسے لگا شاید یہ ترک شراب کا اثر ہے جو اس طرح کی منحوس خبریں اُسے اخبار میں چھپی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔اُس نے جب اس خبر کی تصدیق کی تو وہ سر سے پاؤں تک دہل کے رہ گیا۔اُس کا جان سے پیارا دوست اُسے چھوڑ کے چلا گیا تھا۔اُس نے ایک ساتھی مریض سے کہا۔جانتے ہو میرا ایک پیارا دوست مجھ سے جدا ہو گیا'' ساتھی مریض نے پوچھا کون تو منٹو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔شیام۔

ممتاز قریشی چڈھا اُس کی موت کے فوراً بعد شیام کا سارا روپیہ پیسہ نکال کر اپنی بیٹی اور بہن کو لے کر پاکستان چلی گئی۔ساحرہ اُس وقت ساڑھے چار سال کی تھی اور دوسرا بچہ اُس کی پیٹ میں پل رہا تھا۔شیام کی موت کے دو مہینے بعد اُس نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام پہلے شیکھر تھا بعد میں اُس کا نام شاکر کر دیا گیا۔ممتاز نے انصاری نام کے ایک پاکستانی سے دوسری شادی کی اور اپنے بچوں کی مسلم رسم و رواج کے حساب سے پرورش کی۔شیام کی جان سے پیاری بیٹی ساحرہ اور شاکر نے اپنے نام کے ساتھ چڈھا کہ جگہ انصاری جوڑ دیا۔بعد میں اُس کے بیٹے نے اپنے نام کے ساتھ باپ کا نام جوڑ لیا اور وہ شاکر شیام انصاری کے نام سے جانا جانے لگا ساحرہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل پڑی۔اُس نے پاکستان ٹیلیویژن سے اداکاری کی شروعات کی۔اُس نے ''دھوپ کنارے'' اور ''پرچھائیاں'' جیسے سیریلز میں کام کر کے خوب نام کمایا۔بعد میں وہ ہدایت کار اور فلمساز بھی بن گئی۔اُس نے ایک اُبھرتے ہوئے کلاکار راحت کاظمی کے ساتھ شادی کی اور اس طرح وہ ساحرہ انصاری سے ساحرہ کاظمی ہو گئی۔

ایک بار دلیپ صاحب پاکستان میں ایک جلسے سے مخاطب تھے اور اُن کے سامنے شیام کی بیٹی ساحرہ بیٹھی ہوئی تھی۔دلیپ صاحب کو کسی نے بتایا کہ شیام کی بیٹی اس محفل میں موجود ہے تو دلیپ صاحب نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ میرے عزیز دوست شیام کی صاحبزادی بھی اس تقریب میں موجود ہے۔جب ساحرہ اُن سے ملی تو دلیپ صاحب نے اُسے گلے لگایا اور اُسے اس طرح پیار کیا جیسے وہ اُن کی سگی بیٹی ہو۔

شیام نے اُس زمانے کی ہر چھوٹی بڑی ہیروئن کے ساتھ کام کیا۔ثریا کے ساتھ اُس نے تین فلمیں کیں۔''دل لگی''''ناچ'' اور ''چاردن''۔نگار سلطانہ کے ساتھ اُس نے ''پتنگا''''سنگیتا''''بازار'' اور ''شکایت'' میں کام کیا۔منور سلطانہ کے ساتھ اُس نے ''دادا''''کنیز''''رات کی رانی'' اور ''مجبور'' میں کام کیا۔نسیم بانو کے ساتھ اُس نے ''چاندنی رات'' اور ''شبستان'' کی۔نرگس کے ساتھ اُس نے ''مینا بازار'' اور ''چھوٹی بھابی'' جیسی فلموں میں کام کیا۔کلدیپ کور کے ساتھ وہ دو فلموں میں ساتھ آئے۔''نردوش'' اور ''کنیز''۔مینا شوری کے ساتھ اُس نے ایک فلم کی جس کا نام ''کالے بادل'' تھا۔چونکہ ''شبستان'' کی کچھ شوٹنگ باقی تھی۔ہدایت کار نے شیام کے باڈی ڈبل سے کام لیا اور اور اس طرح فلم مکمل ہوئی۔فلم نے خوب دھوم مچائی۔یہ شیام کی آخری فلم تھی۔وہ ظالم ایک بادِ نسیم کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور اپنی خوشبو بکھیرتا ہوا چلا گیا۔

بقیہ : گپ شپ

میرا ذاتی نقطہ نظر ہے کہ خواتین کے برعکس مرد جو خود کو شامل کرتے ہیں اور کسی کو بھی اپنی تشویش ظاہر نہیں کرتے۔ایک مرد کو سمجھدار ہونا چاہئے۔جو مناسب وقت کے علاوہ کم بولتا ہے، جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ بات کرے، زیادہ خاموش یا مبالغہ آرائی نہ کرے، اس لیے بہترین چیز اعتدال ہے۔یہ بھی کہ زبان میں بہت سے کیڑے ہوتے ہیں جن میں بے معنی بات کرنا بھی شامل ہے اور اس میں وقت کا ضیاع ہے۔بے شک بامعنی گپ شپ میں فائدہ ہوتا ہے، مثلاً جب ہم دوسروں کو بتاتے ہیں کہ فلاں بھائی کو حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے یا پھر فلاں بہن نے ایک اچھا کام کیا ہے، وغیرہ تو اس قسم کی گپ شپ میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ فائدہ مند ہوتی ہے

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

میں بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے معیاری رسالے 'چہارسُو' میں مجھے اور میری غزلوں کو اتنی محبت اور اہمیت کے ساتھ جگہ دی۔ لیکن میری شاعری کا چہارسو تک پہنچنے کا سفر خاصا دلچسپ رہا ہے۔

گلزار جاوید صاحب سے میں کبھی ملا نہیں میں۔ فیس بک سے پہلے میری ان سے کوئی ملاقات نہیں تھی کوئی جان پہچان نہیں تھی، فیس بک فرینڈ بننے کے بعد انہوں نے میری غزلیں پڑھیں اور observe کرتے رہے اور کچھ عرصے بعد میرے سامنے یہ بات رکھی کہ میں چہارسو کا ایک شمارہ آپ کے نام منسوب کرنا چاہتا ہوں، آپ کی غزلیں اور آپ کی شاعری اور آپ کی شخصیت پر انٹرویو کرنا چاہتا ہوں تو میرے لئے حیرانی کی بات تھی اور خوشی کی تو تھی ہی تھی۔ تو میں نے سر آنکھوں پر رکھ کر کہا کہ ضرور جو آپ چاہیں گے وہ بھیجتا جاؤں گا۔

کچھ عرصے بعد جو میرے قریب کے دوست تھے یا نقاد تھے ان میں سے کچھ لوگوں نے مضامین لکھے وہ مضامین میں دھیرے دھیرے بھیجتا گیا ایک ڈیڑھ مہینے میں یہ چیزیں پوری ہوگئیں لیکن بات رہی انٹرویو کی اور انٹرویو میں جو سوالات بھیجے وہ خاصے دلچسپ بہت اچھے سوالات تھے جو آپ نے پڑھے بھی ہوں گے ان کے جوابات بھی دیکھے ہوں گے۔ تو میرے ساتھ مشکل یہ رہی ہے کہ میں شعر تو کہہ لیتا ہوں بھیج بھی دیتا ہوں اور فیس بک پر پہنچ بھی جاتے ہیں لوگوں تک لیکن نثر کے معاملے میں کاہل آدمی ہوں اس میں بیٹھ کے لکھنا میرے لیے تھوڑا مشکل ہوتا ہے تو اس کے لئے من بنا نہیں سکا اور اس طرح وہ چیزیں ٹلتی گئیں ٹلتی گئیں اور گلزار صاحب نے صبر نہیں کھویا وہ لگاتار یاد دلاتے رہے بلکہ مجھے کہنا نہیں چاہیے وہ دکھی بھی ہوتے رہے کیوں اتنی دیر ہو رہی ہے لیکن میری پریشانی یہ تھی کہ مجھے بیٹھنے میں اور لکھنے میں تھوڑا جی لگانا پڑتا تھا اس کے لئے میں اپنے آپ کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔

باقی چیزیں سب ہو جانے کے بعد شاید چھ مہینے کا انہوں نے انتظار کیا اور وہ انٹرویو جیسے تیسے میں نے ٹکڑوں ٹکڑوں میں جواب دیتے ہوئے مکمل کیا اور پھر اس کے بعد جو ہوا اور جو چیزیں آپ کے سامنے آئیں اور جس خوبصورت طریقے سے انہوں نے رسالے کو سجایا میرا جی خوش ہو گیا میرے جتنے بھی دوست تھے انہوں نے اسے دیکھا یہاں اور واقعی میرے جیسے ادنیٰ سے شاعر کو اعزاز دیا اتنی محبت سے انہوں نے چیزوں کو سجایا اپنے رسالے میں اس کے لئے بہت بہت شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ رسالہ اسی طرح سالوں سال اپنے سفر پہ گامزن رہے اور اس رسالے میں میری تخلیق میرے انٹرویو ان کے علاوہ باقی جو مضامین اور تخلیقات ہیں وہ بھی خاصی معیاری ہیں اور پورا رسالہ پڑھنے کے بعد بہت بہت جی خوش ہوا اس کے لئے میں خود کو خوش قسمت محسوس کرتا ہوں اس کے لیے گلزار جاوید صاحب کا شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں چہارسو کے لئے بھی بہت بہت دعائیں۔

ساتھ ہی شکریہ ان صاحبان ان دوستوں اور ان ادیبوں کا جنہوں نے میری شاعری پر اس رسالے کے لیے خاص طور پر مضمون لکھا اور میری شاعری کو اپنے ڈھنگ سے دیکھا اور اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا جن میں خاص طور سے شافع قدوائی صاحب، نسیم سحر، رونق شہری، رفیق رضا، پریہ درشی ٹھاکر خیال، اجمل سعید، نوید سروش، ارشاد خان سکندر، پرویز ساحر، عریشہ ان سب کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں اپنا وقت نکالنے کے لئے اور ناچیز کے لئے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے بہت بہت شکریہ اور دعائیں۔

راجیش ریڈّی (ممبئی)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

حسب روایت اور حسب توقع چہارسو کا تازہ شمارہ راجیش ریڈی بھی، صوری و معنوی لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ راجیش ریڈی صاحب اپنے رنگ اور آہنگ میں خوب کہتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں سادگی کا ہنر کمال پر ہے۔

میرا شمار اُن خوش نصیبوں میں ہوتا ہے جو راجیش ریڈی صاحب کا کلام اُن کے ربرو بیٹھ کر سن کر محظوظ ہو چکے ہیں۔ ماشاء اللہ کیا خوب کہتے ہیں، میری جانب سے آپ اور راجیش ریڈی صاحب کی خدمت میں دلی مبارک باد اور پرخلوص دعائیں۔

شاہین (کینیڈا)

برادرم گلزار جاوید۔ سلام و آداب۔

''چہارسُو'' کا راجیش ریڈی نمبر موصول ہوا۔ ان کا نام پہلے بھی میرے لیے قطعاً اجنبی نہیں تھا، خاص طور پر اس لیے کہ جدہ میں مجھے وہ ہندوستانی جرائد بھی آتے تھے جو پاکستان میں ان دنوں بھی کم کم ملتے تھے چنانچہ تب سے میں ان کا مستقل قاری ہوں۔ مگر ان کا کلام پڑھنے اور ان کے بارے میں دوسروں کی آراء جانچنے کا جو موقع چہارسُو کے ذریعے ملا ہے اس کا مزہ ہی الگ ہے۔ ان کے اس شعر نے تادیر مسحور کیے رکھا:

اس کی موجودگی کا یوں ہے کہ وہ
جب نہیں ہوتا تب بھی ہوتا ہے

ان کی شعری کائنات سے تفصیلی آگاہی ان کے انٹرویو سے ہوئی۔ آپ جس قرینے سے انٹرویو لیتے ہیں اس کی داد اس لیے بھی کہ آپ کے بہت سے سوالات اور ان کے جوابات میں سے ایک میں زلف اور بال کا فرق بھی واضح ہوا۔ غزل کے سانچے، ردیف، قافیے اور بحر کے بارے میں

ان کی خیالات ایسے ہیں جن سے اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں بنتی اور یہ بھی انہوں نے خوب کہا کہ یہ سب کچھ ہو مگر پھر بھی غزل ہو، یہ ضروری تو نہیں۔آپ نے اسی انٹرویو میں ہندوستانی شاعری پر میری رائے کے بارے میں ان سے جو سوال کیا ہے اس کا جواب وہ جس ذہانت سے ٹال گئے ہیں اس کی بھی داد تو بنتی ہے۔

اس شمارے کے تمام مشمولات کا مطالعہ نہیں کر سکا۔ڈاکٹر نے لیپ ٹاپ پر پڑھنے سے منع کیا ہوا ہے کہ آنکھیں چمک سے متاثر ہوتی ہیں۔ اور یہ شرارتی آنکھیں تو بچپن سے ہی چمک، دمک، لشک وغیرہ سے متاثر ہوتی رہی ہیں اس لیے اب مزید نہ ہوں تو بہتر ہے۔تاہم جو کچھ ڈاؤن لوڈ اور پرنٹ کر کے پڑھ سکا ہوں ان میں دو افسانے بھی ہیں اور کچھ غزلیں بھی۔اسی طرح ''رس رابطے ''میں کچھ رابطے اتنے رسیلے اور محبت بھرے تھے کہ سب کو پرنٹ کر کے پڑھا اور جی خوش ہوا۔میرے بارے میں گذشتہ شمارے میں ''قرطاسِ اعزاز'' کا جو سرسبز پودا آپ نے لگایا تھا اس کے پھل پھول موجودہ شمارے میں بہت سے دوستوں کے پیار بھرے تبصروں کی صورت میں ملے۔

ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے جن میں پروفیسر عبدالوسیم صدیقی، جمیل احمد عدیل، رینو بہل، ڈاکٹر خالد حسین، نوید سروش، جمیل عثمان، تابش خانزادہ، شموئل احمد، فرخندہ شمیم، ڈاکٹر ریاض احمد، رعنا کوثر قابلِ ذکر ہیں۔ان میں سے کچھ سے دیرینہ دوستی ہے اور کچھ اجنبی ہو کر بھی اتنے پیارے ہیں اس کا احساس ان کے خطوط دیکھ کر ہوا کہ محبت کرنے کے لیے دوستی اور رابطوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔اور خاص طور پر ادبی کائنات میں تو اس محبت کا پودا خوب پھل پھول لاتا ہے۔

اب شعری حصے پر ایک نظر۔ڈاکٹر رؤف خیر کہنہ مشق شاعر ہیں اس لیے ان کی نعتِ رسول ﷺ میں کچھ مصرعے بے وزن دیکھ کر یہی کہوں گا کہ کمپوزنگ کی کوئی غلطی ہے ورنہ بھلا اس طرح کے مصرعے وہ کیسے کہہ سکتے تھے:

وہ عرب کے بے تاج بادشاہ وہ عجم کے بھی تو ہیں خیر خواہ

نہ تو ہم پہ تیر و کمان لے، وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ
تُو یقین لے کہ گمان لے، وہ ہیں عبدہٗ وہ رسولہٗ

بہرحال ان کی نعت کا یہ شعر بہت عمدہ لگا:

وہ قسم خدا کی بشر سہی مگر ان پہ آتی ہے وحی بھی
انہیں اپنے جیسا نہ جان لے وہ ہیں عبدہٗ وہ رسولہٗ

اسی طرح ساگر ترپاٹھی کی غزل میں بھی کئی مصرعوں میں کمپوزنگ کی ایسی غلطیاں ہیں کہ کچھ حروف ہی اُڑ گئے ہیں۔

کچھ مزید چنیدہ اشعار اسی شمارے سے

حرف کا اپنی ہی زنجیر سے دم ٹوٹ گیا
اس قدر زورِ قلم تھا کہ قلم ٹوٹ گیا

ولی عالم شاہین

رنگ جمتا ہی نہ تھا اور کسی حیلے سے
خون تھوکا تو غزل تھی سخنِ سُرخ میں گم

صابر ظفر

بھرم رکھنا ضروری ہے پرانی وضع داری کا
ضرورت آپڑے تو لہجہ بازاری بھی کرنا ہے

خالد اقبال یاسر

کیوں تو نے حسِ سود و زیاں دے کے اتارا
ہم زندہ رہے ہیں، پہ حسابوں میں رہے ہیں

نوید سروش

ترے پڑوس میں کتنے غریب بھوکے مرے
امیرِ شہر ترے مال و زر پہ لعنت ہو

مرید باقر انصاری

وہ کہ جس کے نام کا مالک بھی کوئی اور ہے
اس کے دامن پر نچھاور میرے سب گل ہائے سرخ

نوید ظفر کیانی

محترمہ فرخندہ شمیم کے افسانے 'ہم کہ ٹھہرے اجنبی' ان کی زبانی پاکستان کی، پاکستان کی سیاست کی اور اُردو زبان کی مظلومیت کی کہانی ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر محبِّ وطن پاکستانی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ہماری پون صدی کس زبوں حالی میں گزری ہے۔اسی طرح ''نیکی'' کے عنوان سے ڈاکٹر تابش خانزادہ کا مختصر افسانہ بھی بڑا بھرپور لگا کہ بعض اوقات کسی سے نیکی کرنے کے بعد انسان کو کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو (راجیش ریڈی نمبر) ملا، شکریہ۔''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات۔۔۔راجیش ریڈی صاحب کے جوابات، دلچسپ اور شگفتہ Ready Reference ہے۔ہر مرتبہ آپ کیسے ایک نیا گوہر تلاش کر لیتے ہیں۔بہت مشکل کام ہے۔راجیش ریڈی صاحب کی اس بات پر ''ایک اچھی غزل اور بڑی غزل کی پہچان میرے حساب سے یہ ہے کہ اس میں کلاسیکل رچاؤ اور نغمگی ہو۔'' عبداللہ جاوید بہت یاد آئے۔''میری سماعت میں ان کی آواز تھی۔''

جناب راجیش ریڈی کا غزلیہ کلام ''خوشبو کے معنی'' جو عطیہ سکندر علی نے ترتیب دیا ہے پڑھا۔راجیش ریڈی صاحب کی غزلیں پڑھ کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ دل سے سچی شاعری کرتے ہیں۔عبداللہ جاوید کی نظم ''التجا'' دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے جاوید صاحب کو یاد رکھا۔

افسانے آدھے پڑھے ہیں۔طبیعت کی خرابی کی وجہ سے لکھنا پڑھنا بہت کم ہو گیا ہے۔فرخندہ شمیم صاحبہ کا افسانہ بہت اچھا لگا۔پاکستان کے حالات پر دکھ اور غم کے ساتھ گہرا طنز ہے۔عبداللہ جاوید اپنے وطن پاکستان سے بہت محبت

کرتے تھے۔ پابندی سے پاکستانی نیوز سنتے تھے۔ان کی ہر دعا میں پاکستان کی سلامتی اور ترقی کی دعا شامل ہوتی تھی۔اپنے ملک کے جو حالات ہیں ان پر ہر محبِ وطن پاکستانی نہ صرف دکھ اور غم میں مبتلا ہے بلکہ اپنے وطن کے لیے فکر مند بھی ہے۔اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پاکستان کو تا قیامت سلامت رکھے۔آمین

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ (جنوری فروری ۲۰۲۳ء ، جلد ۳۲) اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے نظر نواز ہوا۔حسبِ عادت دوستوں سے ملاقات یعنی خطوط کا مطالعہ کیا۔جمیل احمد عدیل، رینو بہل، جمیل عثمان کے خط انتہائی اہم ہیں۔اچھا تجزیہ کیا ہے۔''براہِ راست'' کا مطالعہ بڑی بے قراری اور توجہ سے کرتا ہوں۔راجیش ریڈی سے آپ کے گہرے سوالات کے جوابات پڑھ کر اُن کی شاعری کو سمجھنے میں مزید اضافہ ہوا۔انہوں نے سوالات کو وسیع ادبی و سماجی تناظر میں دیکھا اور پھر کھل کر فراخ دلی اور سچائی سے جوابات دیے ہیں پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔گلزار بھائی کے سوال ''اردو شاعری کی بنیاد قافیہ اور ردیف پر قائم ہے آپ کا رجحان۔۔۔؟'' جواب تفصیل سے دیا اور جواب کا یہ حصہ:

''غزلوں میں سب چیزیں ہوتی ہیں ردیف ہے قافیہ ہے بحر ہے لیکن شعر غائب ہے۔''(ص۸)

آپ کے ایک سوال کے جواب میں سماج کی تلخ حقیقتوں کا بیان آئینہ ہے۔

''ہمارا معاشرہ، ہماری قوم اور ہمارا خطہ تینوں پر غور کریں تو سوائے شرمندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔۔۔سب سے زیادہ نکمے، نیچ اور کرپٹ حکمراں ہمارے ہی نصیب میں آئے ہیں۔''(ص۔۱۵)

مضامین بھی لاجواب ہیں اُن کے فکر وفن، پس منظر اور شاعری کی ضرورت اور مرزا غالب سے ''یاری'' کا بخوبی علم ہوتا ہے۔محمد انعام الحق نے ان کا سوانحی خاکہ اور تخلیقی خاکہ پیش کیا ہے۔محترمہ عطیہ سکندر علی نے غزلوں کا شاندار انتخاب کیا ہے۔یہ کلام بار بار پڑھے جانے کے قابل ہے۔فاری شانے غزلوں کو منتخب کرنے میں کمال کیا ہے۔گلزار بھائی نے اس گوشے کے بعد ایک اور ادبی معرکہ سر کرلیا ہے۔ہزار ہا تحسین۔

ناول ''خاکِ شفا'' کی موجودہ قسط نے اپنا تاثر مزید گہرا کر دیا ہے۔میوات کی مہمان نوازی، کھانے، ثقافت، معمول کی زندگی کو جس مہارت اور ناول کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا ہے وہ لاجواب ہے۔مولانا حالی کا اکمل الحکما قاضی فصیح الدین سشمی پانی پتی سے محبت میں بے تکلفانہ شگفتہ طنز کمال ہے۔

''کاہے کا نوالہ۔۔۔اور کاہے کا پیالہ۔۔۔صبح اُٹھو تو خاکسیر پھانک لو۔۔۔ناشتے کے بعد لعوق سپستہ چاٹ لو۔۔۔دوپہر کو جوارش کیمونی زہر مار کرلو اور رات کو معجون ملین گٹک کے سو جاؤ۔۔۔انسان نہ ہوا دوائی گٹکنے کی مشین ہوگئی۔''(ص۔۸۵)

اس قسط میں مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر، ابراہیم لودھی، اکبر کے نورتن، مجدد الف ثانی کا غیر شرعی اعمال کے خلاف جہاد اور بھگتی تحریک کا ذکر، سیاسی، سماجی اور مذہبی واقعات (تاریخ) کو ناول کا حصّہ بنانا معمولی بات نہیں۔بہت خوب۔ڈاکٹر رؤف خیر کی نعت کی ردیف ''لے وہ ہیں عبدہٗ ورسولہٗ'' کو کمال مہارت سے نبھایا ہے۔پوری نعت میں اہلِ اسلام کے لیے درس ہے:

وہ قسم خدا کی بشر سہی مگر ان پہ آتی ہے وحی بھی
انہیں اپنے جیسا نہ جان لے وہ ہیں عبدہٗ ورسولہ

انجم جاوید کی نعت میں بھی عقیدت اور دلی وابستگی محسوس ہوئی۔

درود پڑھنے کی توفیق آپ دیتے ہیں
سو میں درود کے صدقے نکھرنا چاہتا ہوں
(انجم جاوید)

غزلوں کا انتخاب آپ کی محنت اور اعلیٰ ذوقی کا نمونہ ہے۔

اپنے اندھیرے گھر پہ مجھے ناز کیوں نہ ہو
مانگے ہوئے چراغ سے روشن ہوا نہیں
(قیصر نجفی)

زمانے بھر کی بلائیں بھی کیا بگاڑ سکیں
خدائے کل کی حفاظت میں اب بھی زندہ ہوں
(ڈاکٹر مسعود جعفری)

کبھی یونہی کہیں آوارہ گردی
جنوں کی پاس داری کر رہا ہوں
(احمد سوز)

کوئی منزل نہ کوئی راہ اس میں
محبت دائرہ در دائرہ ہے
(فرحانہ عنبر)

سبھاش گپتا شفیق کی غزل سماجی، سیاسی اور مذہبی طنزیہ ہے جس میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہے۔مرید باقر انصاری کی غزل کی ردیف ''پہ لعنت ہو'' شدید غصے اور تلخیوں کو ظاہر کر رہی ہے۔

یہاں پہ حفظِ مراتب کو کون پوچھتا ہے
جو جس جگہ کا نہیں تھا وہاں بٹھایا گیا
(شہزاد بیگ)

یہ کاروان تماشا، بچھاتے بچھاتے جمال
وہ قافلہ ہے حقیقی، چلا جو سوئے ابد
(فرخندہ شمیم)

ستیہ پال آنند کی نظم ''پانسہ پھینکو'' میں ''وقت'' ''اردو زبان'' اور

مذہبی حوالے نظم کی معنویت کے ساتھ ساتھ آنند صاحب کے جذبات بھی نمایاں ہیں۔ فیصل عظیم کی نظم ''مغلوب'' خوف دلانے والی اور بیدار رکھنے والی نظم ہے۔ میری چھوٹی بحر کی غزل کا مطلع ہے، غزل میں ۵۷ شعر ہیں:

رستا بدل رہا تھا نقشہ بدل رہا تھا

(نوید سروش)

بہن رینو بہل نے سویتا گرگ سادی کی بہترین نظم منتخب کر کے ترجمہ کیا ہے جس نے بہت متاثر کیا۔

افسانوں میں ''جینا اسی کا نام ہے'' (رعنا کوثر)، ''گونگا'' (افتخار بلوچ) اور ''صیاد کا معاہدہ'' (رومانہ تبسم) ہی پڑھ سکا ہوں یہ افسانے پسند آئے۔ ''ایک صدی کا قصہ'' کا اپنا ہی رنگ اور انداز ہے۔ محترمہ پروین شیر کی تحریر ''ادھورا پن مکمل ہے'' امریکی شاعر جون گوڈفری کی نظم مکالماتی ہے پڑھ کر لطف آیا۔

نوید سروش (میرپور خاص)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ پا کر دلی مسرت ہوئی۔

بھائی راجیش ریڈی صاحب پر بھرپور گوشہ شاملِ ہے۔ آپ کو بھی اور ریڈی صاحب کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ریڈی صاحب پر چہارسو کا خاص گوشہ دیکھ کر دل کو بے پناہ طمانیت حاصل ہوئی۔ آپ جس طور اہلِ ادب کو اُن کے استحقاق کے مطابق قرطاسِ اعزاز پیش کر کے اعتبار بخش رہے ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ کا درخشاں باب بن گیا ہے۔ راجیش بھائی سے کیا گیا آپ کا انٹرویو دلچسپ بھی ہے اور معلومات سے بھرپور بھی۔ میری جانب سے آپ، راجیش بھائی اور ادارہ چہارسو کے تمام عزیزان کو پُرخلوص مبارک باد۔

پرویز مظفر (برمنگھم)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ برصغیر ہندو پاک کے نامور شاعر جناب راجیش ریڈی سے موسوم ہے۔ اردو ادب کے حوالہ سے راجیش ریڈی صاحب کی خدمات قابلِ دید ہیں آپ نے ''براہِ راست'' میں ان کے ساتھ دلچسپ اور تفصیلی انٹرویو میں ان کی ادبی خدمات کو نمایاں کر کے قارئین چہارسو کو بہت اچھے انداز سے آگاہ کیا ہے جو قابلِ تحسین ہے۔ شمارہ میں دلچسپ افسانے، مضامین اور شاعری بھی شامل کی گئی ہے۔

شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''ہیلن جارج گرین'' اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ کامیاب ازدواجی بندھن کے لیے نہایت ضروری ہے کہ شوہر اور بیوی اسے قائم رکھنے کے لیے قربانی دیں اور آخری حد تک جائیں اور اس حقیقت کو ذہن میں رکھیں کہ یہ بندھن ٹوٹنے سے جہاں دونوں فریقین کا گھر اُجڑ جائے گا وہاں بچوں کی شخصیت پر بھی منفی اثرات پڑیں گے اور ان کی آئندہ زندگی ایک نارمل انسان سے مختلف ہوگی۔ ماں باپ بچوں کے رول ماڈل ہوتے ہیں اگر وہ گھر کے اچھے ماحول میں زندگی گزاریں گے تو عمر بھر اس کے مثبت اثرات اُن کی شخصیت اور ذہن پر قائم رہیں گے۔

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' فرخندہ شمیم کا افسانہ قابلِ توجہ ہے۔ کہانی میں ۷۵ سال پہلے تقسیم ہند اور ہجرت کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ انتہائی دکھ کی بات ہے کہ اس موقع پر بلوائیوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ ہجرت کرتے ہوئے صرف بے گناہ انسانوں کے ساتھ قتل و غارت اور لوٹ مار کا ایسا المناک سلوک کیا جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ بچوں، عورتوں اور معمر افراد کو بھی نہ بخشا۔

تقسیم ہند کے دوران المیہ واقعات کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان میں مختلف صوبوں میں رہائش پذیر ہونے کے بعد مقامی آبادی میں گھل مل کر ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا اور اس میں ایک بڑی آزمائش پوشیدہ تھی جن مہاجرین نے مقامی لوگوں کی طرزِ زندگی اپنا کر اُن میں ضم ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے لباس رہن سہن اور مقامی زبان مثلاً سندھی، پنجابی، پشتو وغیرہ سیکھ کر اپنی علیحدہ شناخت ختم کر دی اور ان کی روزمرہ زندگی میں سیاسی پارٹیوں میں اور دیگر معاملات میں ضم ہو گئے تو عمومی طور پر انہیں قبول کر لیا گیا اور رشتے ناطے بھی ہونے کے بعد وہ پُرسکون ہو گئے اور انہوں نے بھی اپنے آپ کو بار بار ''مہاجر، مہاجر'' کہنا ختم کر دیا۔ اس کے برعکس ۷۵ سال گزارنے کے بعد جبکہ اگلی تین چار نسلیں پاکستان میں ہی پیدا ہوئیں اور انہوں نے اپنے والدین کی طرح ہجرت نہیں کی بلکہ پیدائش کے دن سے ہی پاکستانی ہیں لیکن انہوں نے اپنے آپ کو مہاجر کہنا یا علیحدہ گروپ یا سیاسی پارٹیاں ''مہاجر'' لفظ سے ہی بنائیں تو اس سے ایک ایسی تفریق پیدا ہوئی جو بوری بند لاشوں اور دیگر المناک واقعات کا باعث بنیں۔ جنہوں نے ہجرت کی اور واقعی مہاجر تھے وہ نسل تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اگلی نسلیں اگر اب بھی دیگر پاکستانیوں کی طرح مختلف سیاسی پارٹیوں میں شامل ہو جائیں۔ مقامی زبان اور رہن سہن لباس وغیرہ اختیار کر کے مہاجر مہاجر کہنا بند کر دیں تو سول سوسائٹی انہیں خوشی سے قبول کرے گی اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ کہانی قصہ پارینہ ہو جائے گی۔

''نیکی'' تابش خانزادہ صاحب کی تحریر شدہ کہانی میں کسی شخص کی ایک نیکی یا احسان کا ذکر کیا گیا ہے جو کسی مریض کی زندگی بچانے کے لیے کی گئی لیکن وہ اس کے بعد سالوں تک اسے جتاتا رہا اور ان کے خاندان کے افراد سے اس حوالہ سے فرمائشیں کرتا رہا جو ان کے لیے بالآخر سوہانِ روح بن گئیں کہتے ہیں ''نیکی کر دریا میں ڈال'' یعنی اسے بھول جا کیونکہ احسان جتانے سے اس کا اجر بھی نہیں ملتا اور دوسروں کے لیے بھی باعث پریشانی ہوتا ہے چنانچہ کہانی میں یہی سبق اور یاددہانی کرائی گئی ہے کہ نیکی کرو اور بھول جاؤ۔

''خاکِ شفا'' پیرزادہ آل انوار کی تحریر کردہ قسط نمبر ۹ پڑھی۔ مصنف نے ناول تحریر کرنے سے پہلے کافی تحقیق و مطالعہ کیا ہے اور یہ ایک تحقیقی مقالہ کی مانند محسوس ہوتا ہے۔ میواتی زبان کے مختلف انداز اور آخری حصہ میں داغ دہلوی کے بارے میں نجی اور دلچسپ معلوماتی تفصیلات نہایت دلچسپ ہیں۔ داغ دہلوی کی مقبول شاعری اور مُنی بیگم سے ان کے معاشقہ کی داستان اور تفصیلات نہ جانے انہوں نے کہاں سے حاصل کی ہیں۔ بہرحال یہ قسط بھی نہایت دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔

''ادھورا پن مکمل ہے'' پروین شیر کی تحریر نہایت عمدہ خوبصورت الفاظ اور فلسفیانہ غور وفکر پر مشتمل ہے۔ ایک قدیم اور مشہور تحریر کے مطابق چھ اندھے انسانوں نے ہاتھی کو ہاتھ لگا کر اُس کی ایک تصویر ذہن میں بنالی اور اس کے مطابق اُس کا حلیہ بیان کر دیا۔ کسی نے ہاتھی کے سونڈ کو ٹٹولا۔ کسی نے اُس کے دانت پر ہاتھ پھیرے اور کسی نے اُس کے جسم وغیرہ پر ہاتھ پھیرے اور سب نے اس ''ادھورے پن'' کو مکمل جانا اور اس صورت حال میں مکمل حقیقت کے ادراک سے محروم رہے۔ اسی مثال کو روزمرہ کی زندگی میں مختلف مذاہب اور نظریات کے حوالہ سے بیان کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ ہر قوم یا فرقہ اپنے خیال اور تجربہ کے مطابق حقیقت اور سچائی تک پہنچنے کے لیے اپنے طریقہ کار اور نظریات طے کرتا ہے۔ منزل ایک ہی ہے لیکن راستے جدا جدا ہیں۔

اس مثال کو بہر حال اندھوں پر ہی لاگو کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان کی جگہ چھ بینا انسان جو آنکھوں سے پوری طرح مکمل جائزہ لینے کے قابل ہیں وہ بھی ہاتھی کو ''ادھورا پن مکمل ہے'' کی طرح نہیں بلکہ مکمل شکل وصورت اور چال وچلن صحیح طور پر بیان کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ مکمل سچ تو صرف ایک ہی ہوتا ہے بصورت دیگر ان سے پوچھا جائے گا کہ اندھوں کے لیے غلط تعبیر کی وجہ موجود تھی لیکن بصارت اور بصیرت کے باوجود غلط بیانی قابلِ گرفت ٹھہرے گی۔ انسان کو غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے کیونکہ وہ اپنے شعور اور تمام حسی قوتوں کو بروئے کار لا کر سچائی تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا ہے ورنہ غلط رویوں پر باز پُرس کا حق تو بنتا ہے۔

شاعری میں اچھا کلام شامل ہے اس حوالہ سے مرید باقر انصاری، ڈاکٹر مسعود جعفری، ساگر ترپاٹھی، قیصر نجفی، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر رؤف خیر، انجم جاوید، راجیش ریڈی اور احمد فراز کا کلام متاثر کن ہے۔

حرفِ آخر یہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام ادبی مواد کو ایک خوبصورت ترتیب دے کر قارئین ''چہارسُو'' کی نذر کرنے پر آپ دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہارسو کا تازہ شمارہ راجیش ریڈی صاحب کے نام دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ ہم تو بڑے پرانے مداح ہیں ان کے کلام کے۔ ایک بار چندی گڑھ میں انہیں سننے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ براہِ راست کے ذریعے اُن کی زندگی اور ادبی سرگرمیوں کی پوری تفصیل پڑھ کر اچھا لگا۔ مشاعروں کے متعلق ان کا بیان بالکل درست ہے اور حکمرانوں کے متعلق جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان پر لکھے مضامین اور اُن کی منتخب شاعری قابل ستائش ہے۔ اس بار تو آپ نے تصویریں بھی شامل کر کے گوشے کو اور بھی زیادہ نکھار دیا ہے۔ بھرپور گوشہ کے لیے آپ کو اور ریڈی صاحب کو مبارک۔

سبھی افسانے مختلف موضوع پر الگ الگ انداز میں لکھے دلچسپ ہیں۔ ارم رحمٰن کا لکھا ''آوازیں'' میں نئی عمر کی لڑکیوں کے جذبات کی عکاسی خوب کی ہے۔

خاکِ شفا میں شامل مختلف موضوعات پر تفصیل پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ رانا سانگا، بابر، بھگتی تحریک، اکبر کے نورتن اور پھر داغ دہلوی کی محبت کی داستان اُن کی شاعری پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ ان کی طویل غزلیں پڑھ کر دل سے واہ واہ کیے بنا نہ رہ سکی۔ ناول کی زبان اور اندازِ بیان خوب ہے۔ آج کل میں فاروقی صاحب کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' پڑھ رہی ہوں اور پیرزادہ آلِ انوار صاحب کا ناول بھی وہ ہی مزہ دے رہا ہے۔ اب آگے دیکھتے ہیں اُونٹ کس طرف بیٹھتا ہے۔

ظفر قریشی صاحب نے اچھا انتخاب کیا ہے افسانے کا۔ سلیل چوہدری پر لکھا دیپک کنول کا مضمون دلچسپ ہے۔ فلر اور رس رابطے دلچسپ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ میری توجہ سب سے پہلے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ایک اور کامیاب شمارہ قارئین تک پہنچانے کے لیے بے حد شکریہ۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کی جگمگاہٹ ہمیشہ کی طرح خدا قائم رکھے۔ شمارہ اپنے اندر بے شمار دلچسپیاں لیے ہوئے ہے۔ راجیش ریڈی صاحب کا انٹرویو پڑھا اور ان کے بارے میں معلوماتی مضامین۔ آپ ہمیشہ قابل لوگوں کو لے کر آتے ہیں۔ ان کی بات صحیح ہے کہ بول چال اور ادبی محفلوں کی حد تک تو اردو ترقی کر رہی ہے مگر سکرپٹ ختم ہوتا جا رہا ہے اچھا شاعر وہی ہے جو سٹیج پر بھی دلچسپی پیدا کرے۔ ادب بھی لالچ اور ناٹک کی نظر ہو گیا ہے۔

ناول خاکِ شفا مصنف کی معلومات کا ذخیرہ ہے یہ ایک دلچسپ تحریر ہے جہاں ناول پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ادب پڑھ رہے ہیں وہیں تاریخ بھی ہمیں خوب معلوم ہو رہی ہے جیسے بھگتی تحریک کا ذکر، اکبر، بابر، مہاراجہ سانگا کا ذکر بہت تفصیل سے شعراء کی زبانی بیان ہوا ہے۔ داغ دہلوی کی خوبصورت غزلیں ان کی زندگی اور محبت کی داستان کیا کچھ نہیں ہے اس ناول میں۔ بہت خوب مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اب آتے ہیں افسانوں کی طرف شہناز خانم عابدی کا افسانہ بہت پسند آیا۔ خاص طور سے منظر نگاری اور یہ جملہ کہ میں پتھر کے زمانے کی عورت نہیں ہوں۔ جبیں ناز اں کا ''ڈمی'' اچھا افسانہ تھا مگر لڑکی ڈمی کی جگہ باغی تھی۔ تابش خانزادہ کی ''نیکی'' اچھا پر اثر افسانہ۔ فرخندہ شمیم کا ''ہم کے ٹھہرے اجنبی'' عارف نقوی کا ''بن بلایا مہمان'' بہت اچھے افسانے ہیں۔ خاک پوش پروفیسر ابن کنول نے مجتبیٰ حسین کا بہت اچھا خاکہ کھینچا ہے۔ پروین شیر کی خوبصورت تحریر ''ادھورا پن مکمل ہے'' اچھی لگی۔

''ایک صدی کا قصہ'' سلیل چوہدری کی زندگی کی کہانی بہت دلچسپ۔ اس دفعہ رس رابطے بھی بہت غور سے پڑھے۔ بہت اچھی اردو پڑھنے کو ملتی ہے۔ جمیل احمد عدیل کی اردو بہت اچھی ہے۔ رینو بہل کا خط بھی اچھا ہے وہ افسانوں کے اچھے تجزیے پیش کرتی ہیں۔

رعنا کوثر (نیویارک)

..... بیٹیوں والے زیدی صاحب .....

زیدی صاحب علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ جب ہجرت کر کے لاہور آئے تو پاکستان میں خال خال ہی گریجویٹ تھے۔ سید، علی گڑھ، یوپی کئی حوالے تھے جن سے وہ کوئی بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے۔ اس وقت کی سول سروس میں انہی حوالوں والے چھائے ہوئے تھے لیکن ہمارے زیدی صاحب کی طبیعت کو بس تدریس ہی بھاتی تھی۔ بی ٹی بھی کی تھی اور لکھنؤ کے ایک مشہور کالج میں پڑھاتے بھی رہے تھے۔ پاکستان آ کر لاہور کے ممتاز ترین تعلیمی ادارے سنٹرل ماڈل سکول میں استاد ہو گئے، علمی ادبی حلقوں میں دوستیاں بھی ہو گئیں۔ اچھا وقت گزر رہا تھا۔ پھر نجانے کس کی کوئی بات دل پر لے لی کہ لاہور ہی چھوڑنے اور کہیں دور چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لاہور سے اس وقت کے ایک خوابیدہ سے شہر خوشاب تبادلہ کرا لیا۔ اپنی لیاقت، فرض شناسی اور علم دوستی سے عزت تو بہت پائی لیکن دل کی وہی تنہائی۔

ان کی اہلیہ شمس الزہرہ بہت سی خوبیوں کی مالک دور اندیش خاتون تھیں۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے سوچا کہ خوشاب میں تو گرلز کالج ہی نہیں ہے، بیٹیاں سکول کے بعد پڑھیں گی کیسے۔ سو خوشاب سے سرگودھا تبادلہ کرایا گیا۔ نصف صدی سے زیادہ پہلے کے سرگودھا میں بھی دیہات کا سا ماحول تھا۔ زیدی صاحب کی مزید بیٹیاں پیدا ہوتیں تو پڑوسنیں اظہار افسوس کیلئے آتیں۔ اگرچہ زیدی صاحب کی اہلیہ اور خوش دامن انہیں snub کرتیں اور کہتیں کہ ہماری بیٹیاں بیٹوں سے بڑھ کر ہوں گی۔ شمس الزہرہ ویسے بھی قائدانہ صلاحیتوں والی خاتون تھیں۔ وہ سرگودھا میں بھٹو صاحب کے خواتین سے پہلے خطاب کے منتظمین میں شامل تھیں۔ زیدی صاحب کو شہر میں لوگ "بیٹیوں والے زیدی صاحب" کہتے اور لہجے میں ترحم سا ہوتا۔ خیر زیدی صاحب کی چھ کی چھ بیٹیوں نے اعلیٰ تعلیم پائی اور پروفیسر، ڈاکٹر اور دوسری نمایاں پوزیشنوں تک پہنچیں۔ داماد بھی ایسے ملے کہ بیٹوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ زیدی صاحب یقیناً مطمئن دنیا سے گئے ہوں گے۔ زیدی صاحب کی پیاری بیٹی پارو نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ انہیں ہم ماہ پارہ زیدی اور ماہ پارہ صفدر کے نام سے جانتے ہیں۔

ایک وقت ایسا تھا کہ یوں کہیں انہیں بچہ بچہ جانتا تھا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کی کسی نیوز کاسٹر کو اتنی مقبولیت اور پسندیدگی نہیں ملی ہو گی۔ میری ان پڑھ خالہ نے ایک بار کہا، "یہ لڑکی آتی ہے تو ٹی وی خوبصورت لگنے لگتا ہے، تم بھی اس جیسی کوئی ڈھونڈو" پڑھے لکھوں کو ان کا تلفظ، ادائیگی اور اعتماد بھی بھاتا تھا۔ ماہ پارہ نے اپنے بچپن، لڑکپن، جوانی سے اب تک، سکول، کالج، یونیورسٹی، ریڈیو پاکستان، پی ٹی وی اور بی بی سی، بھٹو، ضیاالحق اور بینظیر کے زمانوں کی یادیں لکھ ڈالی ہیں۔ اور یہ سب پینوراما کے انداز میں، اردگرد، ملک میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی جھلکیاں اور ان پر اظہارِ خیال بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ پھر بی بی سی کی ملازمت کے دور میں بلوچستان، ایران، عراق، شام اور انگلستان کے مختلف علاقوں کے جو تفصیلی دورے کیے، ان میں جو جو کچھ دیکھا اور جو نتائج اخذ کیے وہ سب قلم بند کر دیا ہے۔ رضا علی عابدی صاحب فرماتے ہیں:

"ہے تو عجیب سی بات مگر میں یوں ہی سوچتا ہوں کہ اکثر لوگ اپنے اپنے کام کرتے ہیں مگر بعض لوگوں سے قدرت کام لیتی ہے۔ یہی نہیں، کام کے لیے وقت اور مقام بھی قدرت ہی طے کرتی ہے۔ ماہ پارہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بقول عارف وقار قدرت نے ماہ پارہ کو ''خبر خواں'' بنایا اور انھیں یہ کام سونپتے ہوئے مقام پاکستان چُنا اور وقت ایسا چُنا جب سیاست کی ہانڈی میں زور کا اُبال آ یا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں اگر کوئی شخص ایسی جگہ بیٹھا ہو جہاں تاریخ کے ورق اس کی نگاہوں کے سامنے لکھے جا رہے ہوں اور وہ شخص خاموشی سے دیکھا کرے اور اپنی یادداشتوں کو کاغذ پر نہ اُتارے تو تاریخ نویسی کی دُنیا میں وہ ظالم قرار پائے۔ ماہ پارہ نے اپنا دامن صاف بچا لیا۔ پاکستان میں ابلاغِ عامہ سے طویل وابستگی اور ملک کے حالات کے مشاہدے کا انھیں جو موقع ملا، اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑے سمیٹ کر اپنی یادوں کو یک جا کر دیا، بڑا کام کیا۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ قدرت جن لوگوں کو کچھ کر گزرنے کا موقع دیتی ہے وہ اپنی یادداشت سینے سے لگائے لگائے گزر جاتے ہیں، آنے والے زمانوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑتے۔ ماہ پارہ نے جنھیں ہم عرصۂ دراز تک دُور سے دیکھا ہی کیے، حیرت انگیز طور پر ہمیں وہ سارے نظارے دکھا دیے جنھیں وہ قریب سے دیکھ چکی ہیں۔ یہ سب کسی نیکی سے کم نہیں اور اگر ہر نیکی کا ثواب بھی ہوتا ہے تو ماہ پارہ کو اس معاملے میں مالا مال ہونا مبارک ہو۔"

ماہ پارہ صفدر کی کتاب "میرا زمانہ، میری کہانی" کے نام سے بک کارنر، جہلم نے شائع کی ہے۔ اس کے مشمولات کے بارے میں بتانے سے بہتر سمجھا ہے کہ اس کے ابواب کی فہرست شیئر کر دوں۔ ہاں، کتاب میں آرٹ پیپر کے بیس صفحات پر ساٹھ سے زیادہ رنگین اور سیاہ و سفید یادگار تصاویر بھی شامل ہیں۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
نئے عہد کی تخلیقیت کا
منبعِ نور
نظام صدیقی
اک معدوم کہانی
جدیدیت کے علمبردار
شمس الرحمٰن فاروقی